سہ ماہی

# تاریخ

۴۴

ایڈیٹر

## ڈاکٹر مبارک علی




فکشن ہاؤس پبلی کیشنز، لاہور

# فہرست

**تحقیق کے نئے اُفق (تبصرۂ کتب)**



**تاریخ کے بنیادی ماخذ**



**تاریخ سے مکالمہ**



**متفرقات**

# ڈاکٹر مبارک علی کی تعارفی گفتگو

خواتین اور حضرات!

'تاریخ اور عوام' کی اس کانفرنس میں خوش آمدید۔

ایک طویل عرصے تک تاریخ پر اہلِ اقتدار اور حکمراں طبقوں کا تسلط رہا اور عوام کو اس سے خارج رکھا گیا۔ اب موجودہ دور میں تاریخ میں ان گم شدہ عوام کی اہمیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اردو میں تاریخ نویسی کو وسعت دی جائے اور زیرِ دست طبقات کی تاریخ کی تشکیل کی جائے۔

جب ہم تاریخ میں عوام کے کردار کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں خاص طور سے قدیم یونان اور روم میں عوام کے کردار کو فعال اور متحرک پاتے ہیں۔ جب قدیم یونان میں پیریکلیس نے ایتھنز کے شہر کو دوبارہ سے تعمیر کرایا تو شہر میں خاص طور سے ایک چوک کی تعمیر کرائی گئی جو یونانی زبان میں اگورا (Agora) کہلاتا تھا۔ اس چوک میں شہر کے عوام جمع ہوتے تھے اور شہر کے حالات اور حالاتِ حاضرہ پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ اس چوک میں سقراط بھی گھومتا پھرتا تھا اور لوگوں سے سوالات کرتا تھا۔

اس چوک کے اردگرد جو عمارتیں تھیں ان میں عدلیہ کی عمارت خاص طور سے قابلِ ذکر تھی۔ ایتھنز کے عوام قانون کی اہمیت سے واقف تھے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ اس طرح شہر کا یہ مرکز سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ایتھنز کی شہری ریاستوں میں، جمہوریت کے نظام نے عوام کو اہمیت دی تھی۔ مقدموں کا فیصلہ جیوری کرتی تھی کہ جس کی تعداد دو سو، ڈھائی سو تک ہوتی تھی۔ عوام کی اسمبلی بدعنوان سیاستدانوں کو بطور سزا دس سال کے لیے جلاوطن کر دیتی تھی۔

سیاستدان عوام کے سامنے اپنا منصوبہ اور مقدمہ پیش کرنے کے لیے خاص طور سے فنِ خطابت

اور منطق و فلسفہ کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ یہ کام اس وقت فلسفیوں کا ایک گروہ کرتا تھا جو سوفسٹس (Sophests) کہلاتے تھے۔

رومیوں نے جب شہر روم کی تعمیر کی تو انہوں نے بھی خصوصیت سے شہر میں فورم کی تعمیر کی۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی، جہاں شہر کے عوام کے ساتھ ساتھ سیاستدان، فوجی جنرلز اور حکمراں سب جمع ہوتے تھے۔ یہاں بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا، تقاریر بھی ہوتی تھیں اور اہم موقع پر لوگوں کو جمع کرکے ان کے سامنے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیا جاتا تھا۔

جولیس سیزر کے قتل کے بعد اس کی لاش کو انٹونی اور ایکٹی ویس (Actiuaes) اس فورم میں لے کر آئے تھے اور لوگوں کے سامنے تقریریں کرکے ان کی حمایت حاصل کی تھی۔

فورم کلچرل سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ یہاں موسیقار، رقاص اور تماشہ کرنے والے لوگوں کی تفریح کے لیے آتے تھے۔ اکثر جنگجوؤں یا Gladiators کے درمیان مقابلے بھی ہوتے تھے۔

فورم میں ہی قانون کو پتھروں پر کندہ کرا کے رکھ دیا جاتا تھا، تاکہ شہری اپنے حقوق سے واقف ہوں۔

رومی حکمرانوں کو اس بات کی فکر رہتی تھی کہ عوام ان سے خوش رہیں، اس لیے عوام کی تفریح کے لیے انہوں نے کلوزیئم تعمیر کرایا تھا، جہاں پابندی سے جنگجوؤں کی لڑائیاں، رتھوں کی دوڑ اور دوسرے کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔

عوام کی اہمیت کو سولہویں صدی کی اطالوی ریاستوں نے بھی تسلیم کیا تھا۔ فلورنس کی شہری ریاست سے امراء کو نکال دیا گیا تھا، اور یہاں تاجروں کی حکومت تھی۔ شہر کے کاریگر اور دست کار بھی اس قدر طاقتور تھے کہ کچھ عرصہ کے لیے انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔

اٹلی کی دوسری شہری ریاستوں میں اس بات کی باقاعدہ کوشش کی گئی کہ جمہوری اداروں اور روایات کے استحکام کے لیے لوگوں کو تعلیم کی سہولتیں دی جائیں، تاکہ ان میں سیاسی شعور پختہ ہو اور وہ مفید شہری بن سکیں۔

عوام کی اہمیت تو تھی، مگر اقتدار پر قبائلی سردار اور اشرافیہ خاندانوں کے لوگ قابض تھے۔ قدیم یونان اور روم دونوں معاشروں میں غلاموں کی ایک بڑی تعداد تھی، جن کے کوئی حقوق نہ تھے۔ رومی چونکہ دوسرے ملکوں پر حملوں میں ملوث رہتے تھے اس لیے وہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر لے

آتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مہم میں ساٹھ ہزار کی تعداد میں قیدی لائے گئے، رومی معاشرے میں ان غلاموں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہ ان سے ڈرنے لگے تھے۔ مثلاً ایک قانون کے تحت اگر کوئی غلام اپنے مالک کے خلاف قتل کی سازش میں پکڑا جاتا تو اس جرم میں اس گھر کے سارے غلاموں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

انہیں حالات کی وجہ سے رومی شہنشاہیت میں اسپارٹاکس (Spartiacus) کی مشہور بغاوت ہوئی، جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

مؤرخ اب اس بات کی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ روم کے زوال میں غلاموں کی اس کثیر تعداد کا حصہ ہے۔ جو کاشت میں بھی مصروف رہتے تھے اور دوسری صنعتوں میں بھی ان کا حصہ تھا، جب کہ رومی شہری ان کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔

اسی طرح سے یونان اور روم کے معاشروں میں عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر رکھا تھا۔ وہ پبلک سرگرمیوں سے دور تھیں۔ اس وجہ سے وہ تاریخ میں غائب ہیں۔ لہٰذا قدیم یونان اور روم میں ایسے طبقے تھے جو محروم تھے، جو معاشرے میں کچلے اور دبے ہوئے تھے ان لوگوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا اسے تاریخ کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

اب جبکہ تاریخ کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ مؤرخ ان زیردست طبقات کی تاریخ کی تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔

مغرب کے مقابلے میں جب ہم مشرقی ممالک میں عوام کے کردار کو دیکھتے ہیں تو ان میں اور حکمرانوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں شہروں میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کہ جہاں امیر و غریب دونوں مل سکتے اور سماجی و سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ کر سکتے۔

بازار ایسی جگہ ہوتی ہے کہ جہاں لوگوں کے ملنے کے مواقع ہوتے ہیں، مگر ہمارے ہاں بازار کا تعلق عام لوگوں سے رہا اور اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے اس کے لیے حقارت کے جذبات رکھتے تھے، بازاری لوگ، 'بازاری زبان'، 'بازاری ذہن'، اس طبقاتی فرق کو ظاہر کرتے ہیں اس لیے امراء خریداری کے لیے بازار میں نہیں آتے تھے بلکہ تاجر اپنا سامان لے کر ان کے گھروں پر جاتے تھے۔

لہٰذا اس طبقاتی فرق نے خواص اور عوام کو علیحدہ علیحدہ رکھا۔ اس لیے عام لوگ تاریخ سے بھی

غائب رہے۔ ان گم شدہ لوگوں کو واپس تاریخ میں لانے کے لیے مؤرّخوں کو جدوجہد کرنی ہے اور ان ماخذوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ جن کی مدد سے تاریخ میں ان کے کردار کو ابھارا جاسکے۔ یہ کانفرنس اسی جانب ایک قدم ہے۔

مجلّہ 'تاریخ' کی جانب سے یہ بارہویں کانفرنس ہے۔ اس کے لیے ہم ایس۔ ایم سہیل ٹرسٹ کے شکرگذار ہیں کہ پچھلی کانفرنس کی طرح اس بار بھی انہوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا جس کی وجہ سے ہم یہ کانفرنس کرسکے۔

اس کانفرنس کی تیاری میں ڈاکٹر سیّد جعفر احمد اور پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی کا حصہ ہے۔ ہم ان کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کرتے کہ یہ ان ہی کی کانفرنس ہے۔

مجلّہ 'تاریخ' کو شائع ہوتے ہوئے گیارہ سال کا عرصہ ہوگیا ہے۔ مگر یہ گیارہ سال پہلے بھی پانچ سو کی تعداد میں چھپتا تھا اور اب بھی اس کی یہی تعداد ہے، جبکہ ہمارے ملک کی آبادی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہورہی ہے۔ اس کا ۴۲واں شمارہ اس کانفرنس کے موقع پر شائع ہوچکا ہے۔

'تاریخ' کو شائع کرنے کے بعد احساس ہوا کہ ہمارے ہاں نہ تو تحقیقی مضامین لکھنے والے ہیں اور نہ ہی اچھا ترجمہ کرنے والے۔ اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر سیّد جعفر احمد اور ان کے ساتھیوں کا حوصلہ ہے کہ یہ پرچہ شائع ہورہا ہے۔

# نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری۔سماجی تاریخ کا ایک ماخذ

پروفیسر سحر انصاری

سندھی زبان کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایک بیت کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ’دنیا میں پنکھ پکھیرو تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی کوئی راج ہنس ہوتا ہے‘۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت یہی خیال آتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی اردو کی عوامی شاعری کا راج ہنس ہیں۔ نظیر کو اپنے زمانے میں عوامی مقبولیت حاصل رہی لیکن وہ ادبی تاریخ کے صفحات پر کم کم ہی نظر آئے۔ اس کے کئی اسباب ہیں ایک تو یہ کہ اس وقت کے ادبی معیارات کا فیصلہ درباروں اور ان سے وابستہ شخصیات کا مرہونِ منت ہوتا تھا اور نظیر اکبر آبادی کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں رہے۔ ان کے زمانے میں اگرچہ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی سب کچھ لکھا جا رہا تھا اور ان کے اساتذۂ فن بھی موجود تھے لیکن بوجوہ شاعر کا مقام و مرتبہ غزل کے تناظر میں متعین کیا جاتا تھا۔ نظیر نے غزلیں بھی کمال کی کہی ہیں لیکن ان کا اصل میدان نظم گوئی تھا۔ نظیر نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ زمینی حقائق سے مکمل طور پر پیوست تھے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے اتنے زاویے ہیں کہ کسی ایک کا احاطہ کرنا بھی ایک مقالے میں ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میرے پیشِ نظر نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو سماجی تاریخ کے ماخذ کے طور پر دیکھنا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی شاعرانہ روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ شعراء کی تخلیقات اپنے زمانے کی نہ صرف عکاسی کرتی ہیں بلکہ خاص واقعات اور ہر عہد کے متعلقات کو بھی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اس ضمن میں امیر خسرو کی مثال بہت نمایاں ہے۔ ان کی بعض مثنویات، مثلاً ’خزائن الفتوح‘، ’خضر خاں دَول رانی‘ ایسی ہیں کہ ان سے اس زمانے کی سماجی تاریخ اخذ کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن نے کئی جلدوں میں جو کتاب 'ہندوستان کی تاریخ ہندوستان کے مورخین کی زبانی' (History of India As Told By Its Own Historians) کے نام سے مرتب کی ہے اس میں امیر خسرو کو بھی بطور مؤرخ جگہ دی گئی ہے۔ اسی طرح ہمارے کئی کلاسیکی شعرا نے شہر آشوب اور طنزیہ مثنویات میں اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان میں میر، سودا، قائم چاندپوری اور دیگر شعرا کے یہاں اپنے عہد کی سماجی تاریخ اس طرح نظم ہوئی ہے کہ جزئیات کے ساتھ وہ حقائق اکٹھے کیے جاسکتے ہیں جو شاید ان ادوار کی تاریخوں میں بھی نہ ملیں۔ انگریزی میں اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر جی۔ ایم ٹریویلین کی کتاب 'انگلستان کی سماجی تاریخ' (Social History of England) بہت پسند ہے۔ اس میں انہوں نے انگلستان کی قدیم سماجی تاریخ، چاسر، اسپنسر، شیکسپیئر اور ملٹن جیسے شعرا کے کلام سے اخذ کی ہے۔

نظیر اکبرآبادی نے اپنے زمانے کے سماج کو جتنی گہرائی اور دقت نظر سے دیکھا اور اسے اپنے دل کی دھڑکن اور خون کی گردش کی طرح اپنے وجود کا حصہ بنایا اس کی کوئی اور مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔

نظیر اکبرآبادی کو ایک مدت تک نظرانداز کیا گیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے صاحبِ ذوق شاعر، نقاد اور تذکرہ نگار نے بھی نظیر کو یہ کہہ کر نظرانداز کردیا کہ ان کا کلام سوقیانہ ہے اور بازاری رنگ رکھتا ہے۔

شیفتہ نے نظیر کے علم، حسن اخلاق اور انکسار کا تو اعتراف کیا ہے لیکن شاعری کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

> 'اس کے بہت اشعار ہیں جو سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور ان اشعار پر نظر رکھتے ہوئے ان کو شعرا کے زمرے میں شمار نہ کرنا چاہیے۔'
>
> (گلشنِ بے خار)

اسی طرح محمد حسین آزاد نے بھی 'آبِ حیات' میں ان سے صرفِ نظر کیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا سماجی شعور ان کی تمام شاعری میں جاری و ساری ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے بہت اہم بات کی ہے:

> 'نظیر اکبرآبادی خیالات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ واقعات کے شاعر ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ خیالات انسان کو بہکا کر دنیائے آب وگل سے دور لے جاتے ہیں اوراس کے اندر انسانی ہمدردی باقی نہیں رہنے دیتے۔ان کا یہ احساس کام کرر ہاتھا کہ انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ جووہ بلند خیالی اور بلند معیاری کے پردے میں کرتا ہے۔خود اپنے خیالات کو اتنا بلند کرلینا اوراپنے مذاق کو اتنا رَچ لینا کہ آپ ساری خلقت انسانی سے الگ ایک مخلوق ہوجائیں اورعوام الناس آپ کوادنیٰ وحقیر نظر آنے لگیں، کوئی بہت بڑا اکتساب نہیں ہے۔' ('ادب وزندگی'ص ۲۵۔۳۲۴)

مجنوں صاحب نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری اورشعور کے جس وصف کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی سب سے نمائندہ نظم 'آدمی نامہ' ہے اس میں انہوں نے مرکزی خیال یہی رکھا ہے کہ انسان اپنی بڑائی کا خیال کر کے فرشتہ، پیغمبر، یہاں تک کہ خدائی کا دعوے دار بھی بن جاتا ہے اور ادنیٰ حیثیت میں دیکھیے تو آدمی ہی انتہائی پست کاموں کے انجام دینے پر مجبور ہے۔کبھی اس کے جسم پر چیتھڑے ہوتے ہیں اورکبھی وہ بھی نہیں ہوتے، لیکن ان بظاہر اعلیٰ وادنیٰ انسانوں کو دیکھیے تو اپنی اصلیت اپنے انجام اوراپنے آخری تجزیے میں 'آدمی' ہی نکلتے ہیں۔

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بینوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

..................

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوے
منکر بھی آدمی ہوے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جاملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

'آدمی نامہ' میں جو جیتے جاگتے مرقعے سادہ لیکن پُر اثر لفظوں میں نظیرا کبرآبادی نے تیار کیے ہیں ان سے انگریزی شاعری کے اہم بنیاد گذار چاسر کی *Canterbury Tales* کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چاسر کے ان مرقعوں میں بڑی زندگی، سچائی اور مینا کاری ہے اور ان کے توسط سے ہمیں اس وقت کی انگلستانی سماجی زندگی سے بھرپور واقفیت ہو جاتی ہے۔ نظیرا کبرآبادی نے جو خاکے آدمی کے حوالے سے تیار کیے ہیں وہ اس قدر سچے اور زمینی ہیں کہ ان کے فن اور مشاہدے کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔

نظیر کی پوری شخصیت ان کی شاعری سے تراشی جاسکتی ہے۔ انہوں نے لڑکوں کو پڑھا کر اپنے روزانہ کے اخراجات پورے کیے لیکن عام طرزِ زندگی ایک فقیر، مفلس اور خوددار انسان سے عبارت تھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ مخمور اکبرآبادی نے نظیر کو اسکاٹ لینڈ کے مشہور عوامی شاعر رابرٹ برنس (Robert Burns) کے مماثل قرار دیا ہے اور دونوں میں اس خصوصیت کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے کہ مفلسی نے ان کے حوصلے اور قوتِ اظہار کو کبھی کُند نہیں ہونے دیا۔

نظیرا کبرآبادی کی تاریخِ پیدائش کا تعین نہیں ہوسکا۔ لیکن اندازاً تاریخ کی کتابوں میں ۱۷۳۹ء لکھا گیا ہے اور ان کا سنِ وفات ۱۸۳۰ء ہے۔ گویا یہ شاہ عالم ثانی کا دورِ حکومت تھا اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ یہ دور ہر اعتبار سے زوال اور آشوب کا ایک حُزنیہ مظہر تھا۔ اس میں نظیرا کبرآبادی نے اپنے سماج کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کو بے کم وکاست اس طرح بیان کر دیا ہے کہ ان میں واقعیت کا عنصر بھی شامل رہے اور شعریت بھی مجروح نہ ہو۔ اس اعتبار سے نظیر نے جس طرح اپنے زمانے کی شعری روایت اور لسانی رکھ رکھاؤ سے انحراف کر کے ایک نئی تخلیقی فضا مکمل طور پر تعمیر کی ہے جس میں زبان، بیان، حسنِ اظہار اور تاثیرِ سخن سب کچھ شامل ہے۔ اس کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ نظیرا کبرآبادی نے اپنی شعریات (Poetics) اور جمالیات اور (Aesthetics)

خود وضع کیں اور اس طرح کہ آج تک وہی اس کے منتہی نظر آتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی ایک سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ میں لفظ سیکولر کا ترجمہ لادینی نہیں بلکہ ہمہ دینی، کرتا ہوں اور اگر کسی کو سیکولر کے معنی جیتے جاگتے حوالوں سے سمجھنا ہوں تو وہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا مطالعہ کرے کہ اس میں انہوں نے مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی، کسی کو انسانی تناظر سے ہٹ کر نہیں دیکھا، وہ عید اور شبِ برات کو بھی اتنی امنگ و ترنگ سے بیان کرتے ہیں جتنا ہولی اور دیوالی کے تہواروں کو۔ امیر خسرو کے بعد وہ پہلے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستان کی مقامی فضا کو اس کے موسموں اور اس کے زمینی حوالوں کے ساتھ شاعری کا حصہ بنایا اور جس طرح امیر خسرو کو یہ فخر تھا کہ وہ ہندوستان کی پہچان ہیں اسی طرح نظیر بھی کہہ اٹھے ۔

جیسا بھی ہے نظیر مگر آگرے کا ہے

اب اس آگرے میں تاج محل بھی ہے دریائے جمنا بھی ہے، میلے ٹھیلے، تہوار اور بازار بھی ہیں، عام کھیل تماشے بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کردار بھی کہ جو مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں، ان سب کی عکاسی کرتے ہوئے جہاں ایک سماجی تاریخ مرتب ہوتی ہے، وہیں نظیر کا فلسفۂ حیات اور فلسفۂ سماج بھی پوری طرح اجاگر ہوتا ہے۔

نظیر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یقیناً دولت اور ثروت انسانی زندگی میں اہمیت رکھتی ہے، لیکن اسے دیوتا کا درجہ دے دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں 'مفلسی نامہ'، 'روٹی نامہ'، جیسی نظمیں ان کے اقتصادی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں لیکن یہ شعور عام آدمیوں کی زندگی کے حوالے سے ایک زندہ حقیقت کے طور پر صورت پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً مفلسی کے یہ اشعار دیکھیے ۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

.................

کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

اس مفلسی کے ذیل میں تمام ماحول کھنچتا چلا آتا ہے۔ کہیں گھر بار کے کردار ہیں، کہیں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے ہیں، کہیں وہ تضادات ہیں جو صاحبِ حیثیت ہونے اور نہ ہونے کا تعین کرتے ہیں، کہتے ہیں۔

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

اسی مضمون کو 'کوڑی' کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں۔

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

نظامِ زر نے جو ابتری معاشرے میں پھیلائی اس کے مختلف زاویے نظیر کی شاعری میں موجود ہیں اور انہوں نے اس امر پر خاص توجہ دی ہے کہ جب انسان مفلس و نادار ہوتا ہے تو اس کی جمالیاتی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ اس طرح نظیر اکبرآبادی کارل مارکس کے اس فلسفے کے ایک پیشرو نظر آتے ہیں کیونکہ مارکس نے یہی کہا ہے کہ ذرائع پیداوار کی اجارہ داری اور دولت کی نامنصفانہ تقسیم انسان کے اخلاق اور جمالیاتی شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نظیر کہتے ہیں۔

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں نور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور

پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

..................

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

جس معاشرے میں چاند سورج بھی روٹیاں نظر آنے لگیں وہ انسانی ابتری کی کس منزل پر ہوگا اس کا بھرپور اظہار صرف نظیرا کبرآبادی کی نظموں میں ملتا ہے۔

مال، دولت، امارت و منصب یقیناً زندگی کی بڑی حقیقتیں ہیں اور نظیر ہمیشہ ان میں وہ پہلو دیکھتے رہے جنہیں اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو شرفِ انسانیت کا معیار جاہ و منصب بن ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے انہوں نے جب یہ ہیئت اختیار کی کہ سر کے بال بڑھا لیے، جوگی کا لباس زیب تن کرلیا، ہاتھ میں لوہے کا چمٹا اور ساتھ میں ایک ریچھ کا بچہ۔ تو گویا اس معاشرے کے لیے وہ ایک سراپا احتجاج یا ایف۔ آئی۔ آر بن چکے تھے، لیکن اس ہیئت نے ان کی شاعری کو مضمحل یا سماج سے الگ تھلگ رہنے کی طرف مائل نہیں کیا بلکہ وہ بڑی امنگ و ترنگ کے ساتھ کبھی برسات اور کبھی جاڑے اور کبھی تیرا کی کے میلے پر خوش دلی کے ساتھ اظہارِ سخن کرتے ہیں اور کبھی خربوزے، نارنگی، سنگترہ، ککڑی، تربوز جیسے مقامی پھلوں کو نظم کا موضوع بناتے ہیں۔ ان نظموں میں تخیل کا ایسا انوکھا پن ملتا ہے کہ تعجب، ظرافت، حیرت اور ندرت سب پر آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ 'جاڑے کی بہاریں' کا یہ بند دیکھیے ۔

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا

ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اِک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

درباداری اور آدابِ محفل پر خاص جان چھڑکنے والے معاشرے میں زندگی کا عوامی رنگ کیا تھا، اسے وسیع پیمانے پر نظیر نے ہی پیش کیا ہے۔ ان کا اکثر کلام پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مردِ ظریف ایک لاابالی انسان تھا جسے میلے ٹھیلوں ہی سے فرصت نہیں ملی لیکن ایسا نہیں، نظیر نے کائنات کے بنیادی سوالوں پر بھی غور کیا ہے اور ان کے بارے میں اپنا ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے، ان کی نظم 'بنجارہ نامہ' موت وحیات کے فلسفے کو ان مثالوں کے ساتھ پیش کرتی ہے جو ہمیں بھی عام زندگی میں نظر آتی ہیں، لیکن انہیں شاعری کا روپ اور حقیقت کا سروپ صرف نظیر نے ہی عطا کیا ہے۔ 'بنجارہ' کے یہ ابتدائی بند دیکھیے ۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا کوئی پلاّ سر بھارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

..................

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا ایک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکّر مصری قندگری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقاّ سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

..................

یہ بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھّم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاویگا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اِک کنبا کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ نظم نظیر اکبرآبادی کی ایک لازوال نظم ہے اور اس کی معنویت تخلیقی قوت، زبان و بیان کی ندرت اور اس میں بیان کیے جانے والے سماجی شعور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نظیر اکبرآبادی نے اس نظم کے علاوہ کچھ اور نہ بھی لکھا ہوتا تو ان کے ایک عظیم شاعر ہونے کی سند یہی نظم کافی تھی۔ قزاق اور وہ بھی اجل کا، اسے کس طرح بیان کیا ہے۔ نظیر کا زمانہ عام شہریوں کے لیے بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ٹھگوں، قزاقوں اور ڈاکوؤں کا دور دورہ تھا اور عام مسافر سرِ راہ لوٹ لیے جاتے تھے۔ نظیر نے اس میں یہ نکتہ رکھا ہے کہ عام ڈاکو اور قزاق تو چھپ چھپ کر رات کے اندھیرے میں لوٹنے کے لیے آتے ہیں۔ لیکن موت ایک ایسا قزاق ہے جو دن دہاڑے کھلی روشنی میں زندگی پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور ساری متاعِ حیات ایک ہی لمحے میں لے کر چلا جاتا ہے۔ انسان کبھی اس وقت اس انجام کو نہیں سوچتا جب وہ زندگی گذارنے کے لیے سامانِ عیش وعشرت کی فراہمی میں خود کو ذلیل وخوار تک کردیتا ہے لیکن پھر کیا ہوتا ہے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اس نظم میں نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ عظمت اپنی پوری بلندی پر نظر آتی ہے انہوں نے شکر، مصری، قند، گری، سانبھر، داکھ، منقاّ، سونٹھ، مرچ، کیسر، لونگ، سپاری جیسے عام الفاظ سے اپنے کلام میں موسیقیت، غنائیت اور ایک عوامی معنویت پیدا کی ہے یہ تخلیقی جدت معجزے سے کم نہیں۔ اسی طرح ڈانڈا، بانڈا، بھانڈا، مانڈا، جیسے الفاظ سے بھی غیر معمولی غنائیت پیدا کی ہے جب کہ 'ڈ' کی آواز کو ثقیل اور کریہہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ ان کی شاعری کے مختلف موضوعات کو بیان کرنے کے لیے صرف پورا کلیات ہی پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ تاہم 'ہنس نامہ'، ہولی اور دیوالی اور دنیا کی بے ثباتی اور بداخلاقی کے بعض زاویوں سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے کہ پھر نظیر کی شاعری بعض نقادوں کے لفظوں میں 'مبتذل' نہیں بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ معاشرہ مبتذل نظر آنے لگتا ہے جس میں انسان کی حرمت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا، بلکہ غیر انسانی رویوں کو معاشرے کی اکثریت کا مقدر بنادیا تھا۔ دنیا کو جب منفی رویوں کی روشنی میں دیکھا گیا تو اس کو 'کل جگ' کا نام دیا گیا لیکن نظیر کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ سماج اور یہ دنیا آپ کے لیے وہی ہوگی جو آپ اس میں اپنے عمل کے ذریعے مثال قائم کریں گے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہر عمل کا بدلہ فوراً ہی مل جاتا ہے ؎

کل جگ نہیں، کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

پھر یہی نقطۂ نظر پورے سماج کے رویوں پر ایک غیر معمولی تبصرہ یوں بنتا ہے ۔

ہشیار یار جانی یہ دیس ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

نظیرا کبرآبادی کی شاعری میں ان ناقدین نے جو ان کے کمالات کے معترف ہیں، متعدد موضوعات کی نشاندہی کی ہے جن میں اخلاقیات، انسان دوستی، حیات وموت کا فلسفہ، عوامی زندگی کی برکتیں اور عام انسان سے جڑے رہنے کی لذتیں، سب کچھ شامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس تمام مدت میں نظیر شناسی سے دلچسپی رکھنے والوں کے علم، آگہی، شعور، مطالعے اور مشاہدے میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جارہا ہے، نظیرا کبرآبادی کے ہاں انسانی نفسیات، سماجیات، جمالیات اور خیالات ومحسوسات کے نئے نئے دریچے وا ہوتے نظر آتے ہیں۔ نظیرا کبرآبادی اس سورج کی طرح نہیں جو اُفق پر کچھ دیر چمک کر غروب ہو جاتا ہے۔ وہ اس آفتابِ عالم تاب کی طرح ہیں کہ جس کی آمد کی خبر اُفق پر نمودار ہونے والی اوّلین سرخی سے ملنے لگتی ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ اپنی کرنیں پورے عالم پر منکشف کرتا چلا جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب تک دیکھنے والی آنکھیں اور محسوس کرنے والے دل دنیا میں ہیں، یہ سورج غروب نہیں ہوگا۔

# سو ہے وہ بھی آدمی

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی اہم سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی صدی ہے۔ خاص طور سے شمالی ہندوستان ان تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ مغل خاندان کی سیاسی کمزوری اور زوال کے ساتھ ہی اس کے دربار سے امراء، شعراء اور کاریگر و ہنرمند سب ہی ابتری اور لاعلمی کا شکار تھے۔ آگرہ اور دہلی جو کہ اب تک سیاست کے مراکز تھے، اب ان کی اہمیت کم ہو رہی تھی۔ جب مغل حکمراں سیاسی اور معاشی طور پر کمزور اور بدحال ہوتے چلے گئے تو اس کا اظہار ان کی تعمیر شدہ عمارتوں میں نظر آنے لگا۔ جو وقت کے ہاتھوں شکستہ، وخستہ ہو رہی تھیں اور جن کی مرمت کے لیے ان کے پاس ذرائع نہیں رہے تھے۔

وہ مغل امراء جو کبھی شان وشوکت اور دولت کے اظہار میں نمایاں ہوتے تھے اب گرتی ہوئی حویلیوں کی چاردیواری میں بند ماضی کے سنہری خوابوں میں محو تھے۔ امرا کا طبقہ اب نئے نام سے مشہور ہو رہا تھا۔ انہیں اشرافیہ کہا جانے لگا تھا، جو اپنے شجرے محفوظ کیے ہوئے اپنے آباؤاجداد کے کارناموں کی یاد میں معاشرے میں باوقار اور قابلِ احترام بنے ہوئے تھے۔

جہاں آگرہ اور دہلی اجڑ رہے تھے، وہیں اودھ، دکن، رام پور اور بنگال کی ریاستیں عروج پر تھیں، لہٰذا شعرا، علماء، استاد، کاریگر اور صنعت کار سرپرستی کی تلاش میں ان ریاستوں کا رخ کر رہے تھے خاص طور سے شعرا جن کے لیے سرپرستی لازمی تھی، جب مغل دربار میں اس کی گنجائش نہیں رہی تو یہ لوگ اپنے شہر کو چھوڑ کر سرپرست کی تلاش میں ہندوستان میں بکھر گئے۔ اشرافیہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے لیے کام کرنا اور محنت کی روزی کمانا باعثِ شرم تھا۔ اس لیے تو مرزا غالب مارس کی پروفیسری چھوڑ کر وظیفے کے لیے کوشش کرتے رہے۔

اس تناظر میں جب ہم نظیر اکبر آبادی کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ اپنے عہد کی اشرافیہ سے مختلف نظر آتے ہیں۔ اوّل انہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا اور اپنی زندگی درس وتدریس میں گذاری یعنی محنت کرکے روزی حاصل کی۔ دوسرے وہ اپنے شہر آگرہ یا الٰہ آباد ہی میں رہے اور سرپرست کی تلاش میں کہیں باہر نہیں گئے۔

معلّم کی حیثیت سے ان کا واسطہ نہ صرف طالب علموں سے رہا بلکہ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ لوگوں میں گھل مل جاتے تھے اور ان میں شامل ہو کر ان کے مشاغل اور سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے۔

ان کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستان میں ایک مشترک کلچر اپنی پختگی کو پہنچ گیا۔ لوگوں کو قریب لانے میں تہوار اور میلے اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ جب مجمع اکٹھا ہوتا ہے تو اس میں امیر وغریب، ہندو ومسلم، گورے وکالے سب مل جاتے ہیں۔ یہاں آکر فرد کی شخصیت مجمع میں شامل ہوتی ہے اور لوگوں کا مجمع سب کو آپس میں ملا دیتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم نظیر اکبر آبادی کی نظم 'آدمی نامہ' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے کس حد تک واقف تھے۔ ان کی یہ نظم میری نظر میں ایک معرکتہ الآرا نظم ہے، کیونکہ اس میں انہوں نے سماج کے طبقاتی نظام پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اپنے عہد کی اشرافیہ کی رعونت اور شان وشوکت کو یکدم مسترد کر دیا ہے۔ اس نظم میں نہ تو کوئی امیر وکبیر ہے نہ ہندو مسلمان، نہ ذات پات کی تفریق ہے جو دوسروں سے علیحدہ کرے بلکہ سب کے سب آدمی ہیں۔ انہوں نے بیک قلم مذہب وملت اور سماجی تفریق کو ختم کرکے سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور سب کا درجہ مساوی ہو گیا ہے۔ سب آدمی ہیں چاہے وہ امیر ہو یا غریب، برہمن ہو یا اچھوت، ہندو ہو یا مسلمان، مغل ہو یا شیخ۔ یعنی مذہب، دولت، ذات پات کا جو خول انسان پر چڑھا ہوا تھا اور جو اس کی آدمیت کو چھپاتا تھا انہوں نے اس خول کو اتار پھینکا اور چھپے اور پوشیدہ آدمی کو باہر لے آئے اور اس احساس کو پیدا کر دیا کہ فرد کی اصلیت کیا ہے؟ فطرت نے اسے کیسے پیدا کیا اور اس نے خود کو سماج کی روایتوں میں باندھ کر اپنی اصلیت کو کیسے مسخ کر دیا۔

ان کی یہ نظم جس طرح ان کے عہد کی عکاسی کرتی تھی، آج بھی وہ اس طرح سے ہمارے آج

کے سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ ایک زندہ نظم ہے۔ آدمی نامہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس میں انسان کی نفسیات، اس کے تہذیبی رویوں اور اس کی فطرت میں تبدیلی کے عمل کو دیکھ سکتے ہیں۔

جب کسی فرد کے پاس اقتدار اور طاقت آتی ہے تو اس کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس میں رعونت اور برتری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ توقع کرتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اس کی فرمانبرداری کریں اور اس کے احکامات کے تابع ہوں۔ لیکن جیسے ہی اقتدار اور طاقت جاتی ہے اس کی شخصیت پر چڑھا ہوا یہ خول اتر جاتا ہے اور وہ ایک بار پھر آدمی کی شکل میں آجاتا ہے۔ لہٰذا آدمی حقیقت میں آدمی ہوتا ہے، دولت، طاقت اور غربت و مفلسی اس کی شخصیت کو بدل دیتی ہیں۔ ایک مفلس اور غریب آدمی اپنی ذات، وقار اور عظمت کو کھو دیتا ہے اور آدمیت سے گر جاتا ہے۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں انسان بار بار مساوات کا نعرہ لگاتا ہے چاہے مذہبی مصلح ہوں یا سیاسی رہنما، اس نعرے کی گونج ہمیں سنائی دیتی ہے، لیکن مساوات کی یہ خواہش ادھوری ہی رہی ہے چاہے مذہبی تعلیمات ہوں یا انقلاب۔ کامیابی کے بعد معاشرے میں طبقاتی تقسیم آجاتی ہے ہم کہہ نہیں سکتے کہ انسان کی یہ خواہش کبھی پوری ہوگی یا نہیں اور نظیر اکبرالہ آبادی کا آدمی روایات کے انہیں خول میں چھپا رہے گا۔

اٹھارویں صدی میں جہاں مؤرّخ عبرت نامہ لکھ رہے تھے اور شاعر شہرِ آشوب کے ذریعے معاشرے کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے آگرہ شہر کی حالت پر لکھا ہے۔ یہ شہر کبھی مغل بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا ان کی تعمیر شدہ عمارات اور یادگاریں، کھوئی ہوئی شان و شوکت اب بھی ظاہر کرتی ہیں۔ اس شہر میں تاج محل ہے جس نے شہر کی شہرت کو دور دور تک پھیلا دیا ہے۔

مگر نظیر اکبر آبادی کے زمانے میں مغل زوال کے ساتھ ہی شہر بھی زوال کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کا قلعہ ویرانی و اداسی کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ تاج محل میں درخت و جھاڑیوں کی بھرمار نے اس کی خوب صورتی کو چھپا دیا تھا۔ اب نہ بابر کے بنائے ہوئے باغات تھے اور نہ امراء کی حویلیاں۔

نظیر اکبر آبادی شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرتے ہیں اور ان خستہ عمارتوں کے پس منظر میں سماج

کی خستگی اور ٹوٹ پھوٹ کو دیکھ رہے ہیں۔ جب بادشاہ اور امراء ہی نہ ہوں گے تو پھر دست کاروں، کاریگروں اور ہنرمندوں کو کون پوچھے گا۔ جب بازار میں گاہک ہی نہ ہوں گے تو تاجروں کے مال واسباب اور اشیا کو کون خریدے گا۔ صراف اور ساہوکار روپیہ پیسے کی ڈھیریاں لگائے بیٹھے ہیں، مگر پیسے ادھار لینے کے لیے کوئی آنے والا نہیں ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کا ذکر کیا ہے کہ جو حالات کا مارا ہوا ہے۔

یہاں تک کہ طوائفیں بھی اس بدحالی کا شکار ہیں کیونکہ ان کی سرپرستی بھی امراء کا طبقہ ہی کیا کرتا تھا۔ نظیر اکبرآبادی نے جب ان کا ذکر کیا تو انہوں نے اس طبقے کی محرومیوں کا کھلے عام ذکر کیا۔ لیکن انہیں خبر نہیں تھی کہ ان کی شاعری کو مرتب کرنے والے مولانا عبدالباری آسی ہوں گے، انہیں شہرِ آشوب کے اس حصے میں اس قدر فحاشی اور عریانی نظر آئی کہ جگہ جگہ نقطے لگا کر شعر کو پورا کیا ہے۔ اب یہ قارئین کی ذہانت یہ ہے کہ وہ ان خالی جگہوں کو پُر کریں اور دیکھیں کہ ان میں اور نظیر اکبرآبادی میں کیا فرق ہے۔ اگر مولانا کو لوگوں کے اخلاق کے خراب ہونے کا اس قدر خطرہ تھا تو انہیں دوسرا کام کرنا چاہیے تھا۔ جوش ملیح آبادی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ 'ہمارا معاشرہ ابھی نابالغ ہے۔'

اٹھارویں صدی کے ہندوستانی سماج کی ایک ادھوری تصویر ہمیں نظیر اکبرآبادی کے ہاں ملتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمان معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ان حالات کو بیان کرنے والے، ان پر نوحہ اور ماتم کرنے والے تو تھے مگر ان کا تجزیہ کرنے والے نہ تھے۔

جب بھی کسی سماج میں سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے ہیں تو ان پر غور وفکر کرنے والے، مفکر، فلسفی اور سماجی علوم کے ماہرین ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں ان پر غور کرنے والے شاعر اور علما ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اٹھارویں صدی میں جو کچھ شمالی ہندوستان میں ہو رہا تھا ان حالات میں شہرِ آشوب لکھے جا رہے تھے اور عام لوگوں کی حالتِ زار کو بیان کیا جا رہا تھا۔

شاعروں اور علما دونوں کے ہاں جس بات پر زور دیا جا رہا تھا وہ دنیا کی بے ثباتی پر تھا۔ لوگوں کو اس بات کی تنبیہ کی جاتی تھی کہ وہ اس دنیا سے دل نہ لگائیں اور اگلی دنیا کی فکر کریں۔ بقول نظیر اکبرآبادی ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ وارننگ امیر وغریب دونوں کے لیے تھی اور یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ اس ڈر اور خوف سے شاید معاشرہ سدھر جائے گا۔ اگلی دنیا کا خوف انہیں ایماندار، پاک اور صالح بنا دے گا۔

مگر اس پیار و نصیحت کے نتائج یہ نہیں نکلے۔

دیکھا جائے تو آج اور اٹھارویں صدی کی اس سوچ میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ ہم آج بھی شاعروں اور علما کے سحر میں مبتلا ہیں۔ سماجی علوم کے ماہرین اور مفکروں و فلسفیوں کی غیر موجودگی میں ہمارے مسائل کا تجزیہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کے اسکالرز ہیں اور ہم ان کے تجزیوں میں اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔

# رابرٹ برنز اور نظیر اکبر آبادی

سید محمد عبدالغفور شہباز

رابرٹ برنز پہلے مرگیا۔ (۲۱ جولائی ۱۷۹۶ء رابرٹ برنز کی وفات کی تاریخ ہے اور ۲۹ جنوری ۱۷۵۹ء تاریخ ولادت) جن دنوں رابرٹ برنز کی شاعری ممالکِ فرنگ میں اپنے خاص رنگ میں دلوں کو رنگ رہی تھی، نظیر کی شاعری وہی رنگ یہاں ہندوستان میں جھمکا رہی تھی۔ رابرٹ برنز نے اپنے ملک کی خاص زبان اختیار کی تھی، نظیر کو اس خصوص میں اس کی پوری نظیر تو پیش نہیں کرسکتا مگر اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ اُس نے بھی زبان کو بہت کچھ آزادی دی۔ شعرا عوام کے بازاری محاورات اور روزمرہ استعمال کرتے ڈرتے ہیں۔ اُس نے نہ فقط بازاری محاورات استعمال کیے بلکہ ان محاورات کے جادو سے ایک بولتا چالتا اچھا خاصا بازار بسا دیا۔ اس کو کسی لفظ کے استعمال میں عذر نہیں اور ہو بھی تو کیوں ہو۔ وہ شاعری نہیں کرتا بلکہ خیالی طور پر خاص خاص روپ بھرتا ہے جس طرح رابرٹ برنز نے زبان انگریزی کو خاص خاص الفاظ اور خاص خاص محاورات دیے ہیں، اُسی طرح نظیر نے زبان اُردو کو دیے ہیں۔ الفاظ ولغات کی کثرت جدتِ استعمال کے ساتھ اس کے کلام میں اس قدر ہے کہ اس خصوص میں حالی نے اس کو میر انیس پر ترجیح دی ہے میرے خیال میں بعض فرہنگ نویسوں کے لیے یہ ایک عمدہ منصوبہ ہے کہ وہ صرف نظیر کے لغات لے اور مترادف الفاظ اور ہم معنی محاورات کا التزام کر کے اُردو کی ایک جامع فرہنگ تیار کرے۔ جس طرح میرے ایک نہایت بلند خیال کامل العلوم دوست نے مقاماتِ حریری کے متعلق التزام کیا تھا۔ میں جانتا ہوں زبان اُردو میں کسی شاعری کا کلیات ایسا نہیں ہے جس میں اس قدر مختلف صیغوں کے الفاظ اس کثرت سے پائے جاتے ہوں۔ سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جن کا پہلے پہل اس کے ہاں استعمال ہوا ہے اور اگر پہلے پہل استعمال نہیں ہوا تو یہ یقیناً ہے کہ اس خوبی اور اس

پہلو سے پہلے ہی پہل ہوا ہے۔

مختلف مضامین کے اعتبار سے بھی رابرٹ برنز اور نظیر مماثل ہیں۔ رابرٹ برنز کے ہاں بھی اسی طرح ہر طبقے اور ہر درجے کے خیالات ہیں جس طرح نظیر کے ہاں۔ مضمون چاہے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو مگر شاعرانہ نقاشی کے لیے دونوں کے موقلم یکساں طور پر تلے ہوئے ہیں۔ رابرٹ برنز سہمے ہوئے زندہ چوہے کو ہمدردی بڑھانے کے لیے پیش کرتے ہیں تو نظیر مردہ چوہوں کی ایک مظلوم جماعت کو خوان میں لگا کر لاتے ہیں اور ہنستے ہنستے رلا دیتے ہیں۔ رابرٹ برنز کتے کی دوڑ بھاگ دکھاتے ہیں تو نظیر اُچھلتا کودتا ہرن سامنے لاتے ہیں۔ رابرٹ برنز کے فوجی مذاق کی نظموں کے مقابل میں نظیر جنگ نامہ خیبر اور اسی وضع کی اور نظمیں پیش جا سکتی ہیں۔ رابرٹ برنز کے اگر سونگ ہیں تو نظیر کے بھی گیت ہیں، جو موج اور لہر کے گلے سے ادا ہو رہے ہیں۔ رابرٹ برنز کے جام میں اگر بادۂ ارغوانی (اسکاچ ڈرنک) ہے تو نظیر نے بھی ادھر سبزی چھانی ہے۔ رابرٹ برنز کاؤنٹر ہے تو نظیر کا جاڑا ___ رابرٹ برنز کی صفائی کے ساتھ مڑنے والی ڈیون ہے تو نظیر کی مینڈھا بھنور اُچھالن چکر سمیٹ مالا والی جمنا ___ رابرٹ برنز کو اگر مضامین ایڈیسن کا وظیفہ ہے تو نظیر کو مقالات سعدی کا ___ رابرٹ برنز کو رسمی پادریوں سے انحراف ہے تو نظیر معمولی عاملوں اور عالموں کو بہکا اور بھٹکا ہوا جانتا ہے:

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

کسی قدر شوخی طبیعت میں بھی دونوں کو شرکت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمدردی دونوں کی گہری ہے۔ یہ گہری ہمدردی کا اثر ہے کہ نظیر اور رابرٹ برنز دونوں کا کلام ہر گھر میں پڑھا جاتا ہے اور ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اونچے محلوں میں بھی یہ راگ اُسی بلند ہے جس طرح ذلیل جھونپڑوں میں۔ مسجد اور گرجوں میں بھی یہ آواز اسی طرح گونجتی ہے جس طرح مندر اور میکدوں میں۔ بڑے بازاروں میں بھی اس سودے کا اسی طرح رواج ہے جس طرح چھوٹی دکانوں میں۔ شاعری پہلے بہت بلندی پر تھی، جو لوگ سوسائٹی کی پستی میں تھے ان کا ہاتھ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ وہ دور ہی سے درشن کر کے چلے جاتے تھے۔ رابرٹ برنز اور نظیر دونوں کی کوشش سے وہ اپنا سنگھاسن چھوڑ کر جھروکے سے نیچے آئی اور اکبر اور شاہ جہاں نہیں بلکہ ہماری ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا

کی طرح اخلاق کے ساتھ ہر سولجر اور سیلر اور ہر سپاہی اور خاصی سے باتیں کرنے لگی۔ ہر ایک شخص کا حال پوچھا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب حالت سلوک کیا۔ جو روتے تھے ان کے آنسو پونچھ دیے جو اداس تھے، ان کی باچھیں کھلا دیں۔ جو مسکراتے تھے اُن سے قہقہے سنوا دیے۔ غرض ایک آن کی آن میں سارے مجمع میں ہنسی خوشی پھیل گئی۔ اب وہ جھروکہ درشن پر بھی جا کر کیوں نہ بیٹھے۔ یہ خوشی جوں کی توں پھیلی رہے گی۔ جس طرح رابرٹ برنز کی نسبت کہا گیا ہے، عام انسانی قلب کی گہرائی میں اس کی قوت رہ کر زور دکھاتی ہے۔ اُسی قوت اور اتنی ہی سچائی کے ساتھ نظیر کے حق میں بھی کہا جا سکتا ہے ___ رابرٹ برنز کی ہمدردی پہلے گھر اور کنبے میں ظاہر ہوئی پھر رفتہ رفتہ عالمگیر ہوگئی۔ اسی طرح نظیر کی ہمدردی بال بچوں سے شروع ہوئی اور پھر تمام بنی نوع پر پھیل گئی۔ دونوں اپنے گھر کے روح پرور حلقے میں ہمدردی کی ایک جاں بخش اور دلنواز گرمی پھیلاتے ہیں اور جب نظر اٹھا کر ملک کو دیکھتے ہیں تو پرتو آفتاب کا کام کرتے ہیں۔ دونوں کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور پھر سیدھے دل ہی میں جا کر ٹھہرتے ہیں۔ دونوں ہر ماں باپ کے دل کو چھوتے ہیں۔ نہیں، بلکہ دونوں کے ہاں کچھ نہ کچھ ہر شخص کے لیے ہے۔ کیڑوں کے لیے بھی دونوں کے دل ویسے ہی دکھتے ہیں جس طرح آدمیوں کے لیے۔ بقول حالی:

تونے دل ایسا دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دُکھایا جاتا

برے سے برے آدمی حتیٰ کہ شیطان اور شیطان کی خالہ کے لیے بھی دونوں کے دل میں رحم ہے۔ اُسی عام ہمدردی کا نتیجہ ہے کہ دونوں کا کلام منفعت نظام ایک ذخیرۂ عام ہے جس میں ہر شخص اپنی حاجت کی چیز پا سکتا ہے۔ مرحلہ زندگی کا ہر مسافر اثنائے سفر میں اس سے استقلال اور ہمت حاصل کر سکتا ہے۔ چورتھکا ماندہ زخمی ہر ایک کوئی نہ کوئی تریاق اس سے لے سکتا ہے۔

(ماخذ: 'زندگانیِ بے نظیر'، تالیف: سید محمد عبدالغفور شہباز، سید محمد حسنین، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

# ہاورڈ زِن۔ایک تعارف

اِرم مظفر

ماضی میں تاریخ جب بھی لکھی گئی طاقتوروں کے ایما پر لکھی گئی۔کمزور شکست خوردہ اور عام افراد اس تاریخ میں خال خال ہی ملتے ہیں۔دنیا کی بیشتر تاریخ فاتح کی پذیرائی کرتی نظر آتی ہے۔ہمارا سابقہ زیادہ تر ایسی ہی تاریخ سے رہا ہے جو ریاست، فاتح اور طاقت کے تناظر میں لکھی گئی ہے اور ہم ایسے تاریخ دانوں کو زیادہ جانتے ہیں جنہوں نے ریاست، قومیت، جنگ اور فتح کی پذیرائی کی ہے۔اگر لکھنے والوں کا مطالعہ کیا جائے تو چند ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے روایتی تاریخ کو ماننے سے انکار کر دیا اور ماضی میں گذرے ان واقعات وشواہد کو جاننے کی کوشش کی جس کا تعلق عام افراد سے رہا ہے اور تاریخ کے ایسے پہلو کو اجاگر کیا جس کا مرکز کمزور عوام اور پسے ہوئے طبقات تھے۔ایک ایسا ہی نام ہاورڈ زن (Howard Zinn) کا ہے جنہوں نے امریکہ کی لکھی جانے والی تاریخ کو استعمار کی تاریخ جانا اور ماضی میں جا کر عوام کے گذرے دنوں کا احوال پیش کرنے کی کوشش کی۔

ہاروڈ زِن نہ صرف تاریخ نویس تھے بلکہ ایک سرگرم سیاسی وسماجی کارکن، سول رائٹس موومنٹ کے مشیر، سماجی نقاد اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔اس کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کے پیشے سے بھی منسلک رہے۔زِن کی وجۂ شہرت صرف امریکی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ان کا کردار جبر اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد میں بھی فعال نظر آتا ہے۔جنوب میں چلنے والی سیاہ فاموں کی Civil Rights Movement ہو یا ویت نام میں امریکہ کی جارحیت، زِن نے دل کھول کر استعمار کی مخالفت کی ہے۔یہ وہ آواز تھی جو امریکی استعمار کے خلاف امریکہ کی سرزمین سے ہی اٹھی اور اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دی۔

ہاورڈ زِن کی کتاب 'The Peoples History of United States: 1492 to Present' نے تاریخ لکھنے کی روایت تبدیل کر دی۔ یہ کتاب روایتی تاریخ کے متبادل کے طور پر سامنے آئی۔ یہاں طاقت کے محور ایوانوں کی سیاست اور محلوں میں ہونے والی سازشوں کی بجائے عوام کی بات کہی گئی ہے۔ اس کتاب میں ماضی کا وہ رخ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق عام افراد سے ہے۔ یہاں ہاریوں، مزدوروں، مقامی باشندوں، سیاہ فام نسل، خواتین اور دیگر پسے ہوئے طبقات کا ذکر کیا گیا ہے وہ افراد جن کو ماضی کے صفحات میں جگہ نہ مل سکی زِن نے ان کی بات کی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ گیارہ زبانوں میں کیا جا چکا ہے۔

ہاورڈ زِن کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں ایک یہودی تارکِ وطن گھرانے میں ہوئی جو نیویارک آ کر آباد ہو گیا تھا۔ زِن نے بچپن سے ہی غربت کو محسوس کیا کہ ماں اور باپ دونوں نوکری کر کے گذارا کرتے تھے۔ بچپن سارا بروکلین میں گذرا۔ دس سال کی عمر سے چارلس ڈکنس کو پڑھنا شروع کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنے والد کے ساتھ جونیئر ویٹر کے طور پر کام کرنے کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصے بعد نیوی یارڈ میں مزدوری کرنا شروع کر دی۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ اوائل عمری میں ہی انہوں نے مزدوروں کے ساتھ ہونے والے استحصال کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اس بات کا اعتراف بعد میں وہ اپنی کئی تحریروں میں کرتے نظر آتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں مارکس کے نظریات اور ڈکنس کے ناول ان کی ذہنی تربیت کا باعث بنے۔

نیویارک میں رہائش پذیر کم آمدنی والے گھرانوں کے بچے 'بروکلین سٹی کالج' میں پڑھنا اعزاز سمجھتے تھے اس کالج کو غریبوں کی ہاورڈ مانا جاتا تھا۔ بروکلین سٹی کالج کو سیاسی گہما گہمی کے حوالے سے کافی شہرت حاصل تھی یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم اسٹالنزم، کیپٹل اِزم اور سوشلزم کے نظریات پر ہمہ وقت بحث میں مصروف ملتے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہاورڈ زِن نے اس کالج میں داخلہ لینے کی بجائے نوکری کو ترجیح دی یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زِن کا کالج نہ جانے کا فیصلہ غلط ثابت ہوا اور وہ اپنی عمر کے طالب علموں سے ذہنی طور پر پیچھے رہ گئے بلکہ یہاں ان کی تربیت ایک مختلف طریقے سے ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسے میں زِن نے ایک نوجوان یونین آرگنائزر کے طور پر کام کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ Left کی ہونے والی سیاست کی پیچیدگیوں سے آگاہی حاصل کرنا شروع کی ایسے میں ان کے خیالات و نظریات کو یونین کی

سرگرمیاں مزید جلا دیتی نظر آتی ہیں۔ کامیاب یونین آرگنائزر کے طور پر ابھرنے والے نوجوان کی زندگی میں ایک اور تبدیلی واقع ہوتی ہے جب زِن نے امریکی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ زِن نے ۴۵۔۱۹۴۳ء تک فوج کی نوکری کی۔ اس وقت زِن کا مقصد فاشزم کے خلاف جدوجہد تھا۔ زِن کا تعلق اس ۴۹۰ بمبار گروپ سے تھا جس نے مغربی فرانس کے شہر Royan پر نیپام بم آزمائے تھے۔ سالوں بعد جا کر وہاں بسنے والوں پر ان بموں کے اثرات دیکھے تو سوچ میں تبدیلی آئی اور جنگ کے خلاف جدوجہد مقصد ٹھہرا۔

زِن ۱۹۴۴ء میں رشتۂ ازواج میں منسلک ہوئے اور ساتھ ہی تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا۔ بی۔اے کی سند نیویارک یونیورسٹی سے لینے کے بعد ایم۔اے اور ڈاکٹریٹ کولمبیا یونیورسٹی سے کیا۔ ۵۶۔۱۹۵۳ء کے دوران نیوجرسی کے اُپسالا کالج میں تدریس سے منسلک رہے اور ساتھ ساتھ بروکلین کالج میں بھی پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں Spelman کالج کے شعبہ تاریخ سے وابستہ ہوگئے۔ اسپل مین کالج کی نوکری ان کی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کالج جارجیا، اٹلانٹا میں سیاہ فام خواتین کے لیے تھا یہیں سے زِن نے سول رائٹس موومنٹ میں سیاہ فاموں کے حقوق کی کھل کر حمایت کی۔ زِن اس کالج میں روسی ادب اور تاریخ پڑھایا کرتے تھے۔

ان شاگردوں میں مشہور ناول نگار ایلس واکر اور ماریان رائٹ (صدر چلڈرن فنڈز) شامل تھیں۔ جنوب میں چلنے والی تحریک کا اہم گڑھ اٹلانٹا تھا۔ جنوب کی سب سے سرگرم تنظیم Student Non Violent Coordinating Committee (SNCC) تھی زِن نے اس تنظیم کے مشیر کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس تنظیم کے لیے کام کرنے کا ایک مقصد تو واضح تھا فوج کی نوکری میں زِن نے محسوس کرلیا تھا کہ امریکی معاشرے میں کالے اور گوروں کا فرق بہت زیادہ ہے۔ سفید فاموں کے احساسِ برتری نے سیاہ فام باشندوں کے لیے ہر طرح کی سیاسی، سماجی اور معاشی حدود قائم کی ہوئی تھیں۔ ان کا پار کرنا سیاہ فاموں کے گناہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ موقع بہترین تھا کہ نسلی تعصب کے خلاف بھرپور جدوجہد کی جائے اور ہاورڈ زِن نے ایسا ہی کیا۔ اٹلانٹا میں تحریک کا ہونے والا کوئی بھی دھرنا یا مظاہرہ زِن کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ زِن نے قلم کی طاقت استعمال کرتے ہوئے امریکی معاشرے کے

تعصب اور یہاں پایا جانے والے معاشرتی تضاد کو کھل کر اجاگر کیا۔ SNCC سے پہلے زِن ۱۹۴۵ء میں بنائی گئی ایک کمیٹی The American Veteran Committee (AVC) میں بھی شامل تھے۔ اس تنظیم کی سب سے بڑی اور فعال شاخ بروکلین کی تھی جس میں ۳۰۰ سے زائد افراد شامل تھے۔ اس تنظیم نے بھی سیاہ فاموں کے حقوق کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۶۳ء میں زِن کو کالج کی ملازمت سے جواب دے دیا گیا۔ کالج صدر Albert Manley کو طالب علموں کی تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لینا ناپسند تھا تو تحریک کی جانب سے ہونے والی مزاحمت کالج کے اندر اور باہر برداشت کرنا انتظامیہ کے لیے دشوار تھا۔ زِن کی تحریک میں شمولیت پر بھی کالج صدر کو اعتراضات تھے۔ زِن اپنے شاگردوں کو جبر کے آگے نہ جھکنے کا حوصلہ دے رہے تھے جس کی پاداش میں انہیں نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اسپل مین کالج کی ملازمت کے دوران گذارے شب و روز اور سیاہ فاموں کے حقوق کی تحریک کے واقعات کو زِن نے اپنی کتاب SNCC: The New Abolitionists میں قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اپنی سوانح 'You Cant be Neutral on Moving Train: A Personal History of Our Times' میں لکھتے ہوئے زِن نے اسپل مین کالج میں گذارے دنوں کو دلچسپ اور علمی قرار دیا ہے۔ یہاں وہ انکساری سے اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ اپنے شاگردوں سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۴ء میں زِن کو دوبار FBI کی کڑی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تفتیش کے بعد اپنی اہلیہ کو اعتماد میں لے کر زِن نے فیصلہ کیا کہ ان تمام ذاتی خطوط کو ضائع کر دیا جائے جن سے ان کے کئی کمیونسٹ دوستوں کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ میں McCarthyism زوروں پر تھا۔ زِن کا سیاسی شعور ہی تھا جو ویت نام جنگ پر شدید تنقید کا باعث بنا۔ ایک بمبار کا امن پسند کے طور پر سامنے آنا حیرت کی بات نہیں اس لیے کہ زِن نے جنگ کے بعد کی ہولناکیوں اور تباہیوں کو محسوس کیا تھا یہی وجہ ہے کہ جنگ کی مخالفت ان کی تحریروں کا حصہ بن گئی تھی۔

زِن نے ۱۹۶۴ء میں بوسٹن یونیورسٹی میں شعبۂ سیاسیات میں پروفیسر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۸۸ء میں ریٹائرمنٹ لی۔ ان تمام سالوں میں زِن کی جنگ کے خلاف نفرت اور امن

پسندی (Pacifism) کے کئی مظاہرے سامنے آتے رہے۔ یونیورسٹی میں ان کی سول لبرٹی کی کلاسیں بہت شہرت رکھتی تھیں اور ہر سمسٹر میں اس کلاس میں ۴۰۰ سے زائد طالب علم آیا کرتے تھے۔

اپنے شاگردوں کو جدوجہد کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ زِن نے امریکہ کی جارحانہ پالیسیوں کی ہر جگہ مذمت کی۔ ویتنام کی جنگ میں امریکی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک امن پسند کی حیثیت سے جنگ کے دوران ان کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ امریکی فضائیہ کے اس سابق بمبار سے Pacifist تک کا سفر چند سالوں پر محیط نہ تھا۔ گذرتے سالوں میں زِن کو بے بس لوگوں کی اذیت و کرب کا ادراک ہوا جو اپنے پیاروں کو جنگ میں کھو چکے تھے یا معذوری کی زندگی گذار رہے تھے۔ یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر گیا جب زِن نے رویان کا دورہ کیا جہاں کبھی نیپام بم سے حملہ کیا تھا۔ لوگوں کی رنج والم کی داستانیں دل پر اثر کرتی گئیں اور ایک امریکی بمبار جنگ کے خلاف جدوجہد کرنے والا سرگرم کارکن بن گیا۔ ۱۹۶۸ء میں ویت نام جا کر تین جنگی قیدی بھی رہا کرائے۔ اس دوران زِن کی دو تصانیف منظرِ عام پر آئیں جو کہ جنگ کے خلاف لکھی گئی تھیں۔
'Vietnam: The Logic of Withdrawal' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی یہ امریکہ میں چھپنے والی ان چند اوّلین کتب میں سے ایک ہے جس میں امریکی فوج کو ویت نام سے نکل جانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور ۱۹۶۸ء میں ایک اور تصنیف 'Disobedience And Democracy' کے نام سے شائع ہوئی۔ ان تحریروں نے امریکہ میں بے حد مقبولیت حاصل کی۔
'The Southern Mystique' میں زِن سیاہ فام باشندوں کی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ سفید فام لوگوں کے رویوں کا ذکر بھی کیا ہے جو کہ احساسِ برتری کے سبب امریکی معاشرے کو تقسیم کیے ہوئے تھا۔

۱۹۷۰ء میں 'The Politics of History' لکھی جس میں وہ اپنے ہم عصر تاریخ نویسوں کو امریکی نظام کے اندر ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں کا احاطہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔
خلیج کی جنگ میں ہزاروں بے گناہ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ اس سے پہلے عرب اسرائیل جنگ کو دیکھا جائے تو لبنان اور بیروت میں مرنے والے بے گناہ شہریوں کی تعداد فلسطینیوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اسرائیلیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ عراق پر امریکی حملے کو زِن نے کھلی

جارحیت قرار دیا۔ ۹/۱۱ کے بعد دہشت گردی کی جنگ کو انہوں نے انسانیت کے خلاف جنگ مانا۔ اس کے خلاف لکھتے ہوئے زِن کہتے ہیں کہ یہ جنگ انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے اور اس سے دہشت گردی ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھے گی۔ دہشت گردی کے خاتمے کی یہ جنگ بے گناہ انسانوں کے خلاف محاذ بن گئی ہے جو کہ امریکہ پر حملے کے ذمہ دار بھی نہیں ہیں۔ دہشت گردی اور جنگ میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے بے گناہ انسانوں کا قتل، دہشت گرد اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قتل کرتے ہیں اور جارح، ملٹری ٹارگٹ کو اپنا ہدف بنا کر شہریوں کے قتلِ عام کا باعث بنتے ہیں۔ عام لوگوں کو بے گناہ ہلاک کرنا، چاہے حادثہ ہو یا حملہ ہر طرح سے ناجائز ہے۔ زِن اس خطرے کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں جدید تکنیک نے جنگ کو مزید ہولناک بنا دیا ہے اور اس کی زد میں عام افراد کو زیادہ خطرات لاحق ہیں۔

ہاورڈ زِن کی ایک اور خوبی ان کا ڈرامہ نگار ہونا تھی۔ انہوں نے تین ڈرامے تحریر کیے۔ ۱۹۷۶ء میں 'Emma' جو کہ ایما گولڈ مین کی زندگی پر لکھا تھا، دوسرا ڈرامہ ۱۹۸۶ء میں 'Daughter of Venus' اور تیسرا ڈرامہ 'Marx In Soho' ۱۹۹۹ء میں پیش کیا گیا۔

زِن نے نوم چومسکی کے ساتھ مل کر 'پینٹا گون پیپرز' کو بھی مرتب کیا۔ اس میں ویتنام کی جنگ کے حوالے سے اہم معلومات و شواہد مواد ہیں۔

زِن کو کئی ادبی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ زِن کا انتقال ۲۷ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہوا۔ ان کے جانے سے عوام کے لیے لکھی جانے والی تاریخ کا باب بند نہیں ہوا بلکہ ان کا کام تاریخ نویس کو ایک نئی جہت دے کر ایک ایسے راستے کی طرف موڑ گیا جہاں تاریخ نویسوں کو اب تاریخ عوام کے حوالے سے لکھنی پڑے گی ایک عام فرد کو اب غیر اہم جان کر نہ تو اس کو نظر انداز کیا جا سکے گا اور نہ ہی اس کی جدوجہد کو دبایا جا سکے گا۔

# تاریخ، ہیرو اور عوام

## احمد سلیم

تاریخ میں فرد کا رول اہم ہے یا عوام کا؟ یہ سوال میرے مقالے کا بنیادی موضوع ہے۔ اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہیرو کوئی فرد ہوتا ہے یا جدوجہد میں سرخرو ہوتے ہوئے عوام؟ تاریخ اور عوام کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس پہلے سوال کے ساتھ کئی اور ذیلی سوالات بھی جڑے ہوئے ہیں:

ایک قوم کا ہیرو کیا دوسری قوم کا بھی ہیرو ہے یا اس کے برعکس ایک قوم یا ریاست کا ہیرو، دوسری قوم یا ریاست کا دشمن ہوتا ہے؟ پھر یہ بھی کہ ایک عہد کا ہیرو، کیا اسی ملک کے دوسرے عہد کا ولن بن جاتا ہے؟ یہ سوال یہیں پر نہیں رکتا بلکہ کئی نئے سوالوں کو جنم دیتا ہے: کیا تاریخ میں فرد یا سورما کا رول، عوام کے رول سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے یا اس کے برعکس عوام ہی اصل ہیرو ہیں اور فرد محض ان تاریخی حالات کے نتیجے کے طور پر اُبھرتا ہے جن سے عوام گزر رہے ہوتے ہیں؟

تاریخ سازی کے اس عمل میں درجنوں انفرادی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جب ایک فرد نے آگے بڑھ کر پوری تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ بلاشبہ اس میں عوام کے رول کو نہ منفی کیا جاسکتا ہے نہ گھٹایا جاسکتا ہے لیکن یہ قیادت ہی ہوتی ہے جو فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی ہے۔ عالمی تاریخ میں مارکس، لینن، نیلسن منڈیلا اور دوسرے کئی افراد اس دعوے پر پورے اُترتے ہیں۔ ہندو پاکستان کی تاریخ میں دُلا بھٹی، شہید بھگت سنگھ، ہوش محمد شیدی، عبدالغفار خان، مہاتما گاندھی اور دیگر متعدد شخصیات کے انفرادی تاریخی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مختلف مثالوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تحریک میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ رولٹ ایکٹ کے خلاف عوامی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور

ڈاکٹر ستیہ پال اس عوامی تحریک کے قائد تھے، جسے نو آبادیاتی حکمرانوں نے گولیوں کی بوچھاڑ سے کچل دینا چاہا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل روشن خیال مسلمان سیاستدان محمد علی جناح نے رولیٹ ایکٹ کی حمایت کرنے کی بجائے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مرکزی دستور ساز اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔۔ اس تحریک کے سورما کون تھے؟ کچلو اور جناح یا خون میں نہلا دیئے جانے والے وہ سیکڑوں عوام، جنھوں نے اپنے لہو سے آزادی کی تحریک کا ایک باب رقم کیا؟ کیا جناح اور کچلو کے بغیر یہ تحریک سر اٹھا سکتی تھی؟ یا کیا وہ اس تاریخی عمل کا حصہ بننے پر مجبور تھے؟ تاریخ میں اس طرح کے درجنوں واقعات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً 1930 میں قصہ خوانی پشاور کا قتل عام۔ 1943 میں حُر تحریک، 1948 میں بابڑہ فائرنگ، مشرقی بنگال میں بنگلہ اندولن، جس کے نتیجے میں شہید مینار بلند ہوا اور مینارِ پاکستان کی بنیادیں ہل گئیں۔

مقالے میں اس سوال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے عوام کے شراکتی کردار کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے مقالے میں پاک و ہند سے عوامی تحریکوں کی چند مثالیں سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح سندھ کی آزادی کی تحریک ''مرویسوں، سندھ نہ ڈیسوں'' پنجاب اور خیبر پختونخواہ کی کسان تحریکیں'' پگڑی سنبھال جٹا'' اور ''غلہ ڈھیر تحریک'' بلوچستان میں ''مگسی ایجی ٹیشن'' وغیرہ اس ضمن میں بطور خاص دیکھی جاسکتی ہیں۔ پھر بخت خان، فقیر اپی اور شہید بھگت سنگھ جیسے سورماؤں کے نام بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے تاریخ کا دھارا موڑنے کا عمل، نہ عوام کی شرکت کے بغیر ممکن ہے نہ ہیرو جیسی قیادت کے بغیر۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

چند برس اُدھر بھگت سنگھ کی سوانح عمری پر کام کرتے ہوئے میں اسی کشمکش سے دوچار تھا۔ مسودہ مکمل کرنے کے بعد بھی میں اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ آخر ہمیں ایک سورما کی کیا ضرورت ہے۔ ان دنوں بریخت کے معروف ڈرامے گاللیو گالیلیٔ کے ایک مکالمہ کی گونج بھی میرے اس تذبذب میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ کلیسا کے سامنے بظاہر جھک جانے اور اپنے سائنسی عقائد سے توبہ تائب ہوجانے کے بعد جب گاللیو سے اس کا شاگرد آندریا ملنے آتا ہے تو وہ اپنے استاد کی بزدلی اور غداری سے بے حد رنجیدہ ہونے کے باعث کہتا ہے:

''بدقسمت ہے، وہ قوم، جس کے پاس کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔''

اس کے جواب میں گالیلیو اپنا تاریخی جملہ ادا کرتا ہے۔

''نہیں آندریا! بدقسمت ہے، وہ قوم جسے ہیرو کی ضرورت ہے۔''

چنانچہ بھگت سنگھ کی سوانح عمری مکمل کرنے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بھگت سنگھ کے بارے میں اب میرے پہلے جیسے خیالات نہیں رہے۔ دو اہم سوال میرے سامنے تھے!

۱۔ بھگت سنگھ ہی کیوں اور وہ بھی ہمارے اس ہر لحہ بدلتے ہوئے عہد میں؟

۲۔ اگر بھگت سنگھ ضروری بھی ہو تب بھی کیا آج ہمارے حالات میں کسی ہیرو کی گنجائش ہے؟

ان سوالوں کے پیش نظر مجھے اپنے مسودے پر نظر ثانی کرنا پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ بھگت سنگھ آج بھی اہم ہوسکتا ہے، اگر ہم اسے خود اپنے موجودہ حالات کی روشنی میں دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ہمارے وطن میں حریت اور جاں فروشی کی کئی داستانیں رقم ہوئی تھیں۔ بلوچستان میں انفرادی اور اجتماعی ہیروازم کی متعدد مثالوں کے ساتھ ساتھ ہم نے حسن ناصر اور نذیر عباسی کی جانوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ یہ داستانیں ماضی میں مربوط اور پیوست بھی تھیں اور مستقبل کی جمہوری تعمیر کے عمل سے وابستہ بھی۔ حریت اور جانفروشی کی یہ انفرادی مثالیں بھی ایک اجتماعی جدوجہد سے عبارت رہی تھیں اور تقاضہ کرتی تھیں کہ ہم اپنے ماضی کے شہیدوں کو بھی اسی اجتماعی جدوجہد کے پس منظر میں دیکھیں۔۔۔ ان تصورات کے ساتھ جب میں نے شہید بھگت سنگھ کے بارے میں اپنی کتاب شائع کردی تو اس میں مذکورہ بالا بحث بھی شامل تھی، جس نے تاریخ میں ہیرو اور عوام کے رول کے حوالے سے ایک نئی بحث چھیڑ دی۔ ممتاز نقاد اور دانشور صفدر میر نے 'ڈان' میں، میری کتاب کا ایک تفصیلی محاکمہ شائع کیا۔ پہلے تو انہوں نے خود پاکستان کی تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے چند اہم سوالات اٹھائے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

> ''ابتدائی برسوں کے پاکستانی جغرافیے کی طرح ہماری تاریخ کا معاملہ بھی خاصا غیر معمولی ہے۔ ہم نے اپنے جغرافیے کو سہل کرلیا ہے مگر تاریخ کے ساتھ اصل گھپلا یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ اسے شروع کہاں سے کریں۔ پانچ ہزار برس پہلے سے، ہزار برس پہلے سے، چودہ سو برس قبل ایک اجنبی سرزمین پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے یا نرے

چالیس برس کی بات کی جائے۔ہم میں سے بہت سے ،خاص طور پر سکولوں کے بچے موخر الذکر متبادل کو ترجیح دیں گے کیونکہ اس سے بہت سے بکھیڑے خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ہمارے مورخ کو ''تنگنائے تاریخ'' کے محدود ہو جانے کی شکایت پیدا ہو گی۔ چنانچہ مورخ نے بالعموم ہزار برس والے متبادل کو آسان جانا اور چودہ سو برس یا پانچ ہزار برس کے متعلق یہاں تہاں کچھ ایسے ضمیمے لگا دیئے مگر ایسا کرنے کے باوجود بیان میں ایسے ایسے گھپلے ہیں جو چھپائے نہیں چھپتے۔ خاص طور پر ہم جوں جوں ماضی قریب کی طرف یعنی سامراج دشمن تحریکوں کے زمانے میں سفر کرتے ہیں، اس قسم کی دشواریوں سے بار بار واسطہ پڑتا ہے۔ اور اس عہد کے اختتامی حصے میں تو سارا منظر نامہ ایسا پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہماری جدوجہد سامراج کے خلاف تھی یا خود اپنے خلاف ہی جہاد کیا جا رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر جلیانوالہ کا ذکر کرنا پڑ ہی جائے تو ہم اس پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ بھگت سنگھ کا تو ذکر ہی ممنوع ٹھہرا ہے حالانکہ ہم میں سے ایسے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں جن کے بچپن میں لاہور کو ۲۴ مارچ (دراصل ۲۳ مارچ) ۱۹۳۱ کی صبح ایک جذباتی طوفان نے آ لیا تھا۔

اس روز سنٹرل جیل لاہور میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تھی (یہ کم بیش وہی جگہ تھی جہاں آج کل شادمان کالونی واقع ہے) یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اس قدر تاریخ ساز اور طوفانی واقعے کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ نہ ہماری تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی قومی تقویم میں اسے کوئی جگہ دی جاتی ہے۔''

صفدر میر نے جس تعجب کا اظہار کیا ہے، اس سے میں خود بھی دوچار رہا تھا۔ اس کا سادہ سا جواب یہ تھا کہ ہم اب تک قیام پاکستان کے مقصد کو واضح نہیں کر سکے تھے۔ صفدر میر نے بھگت سنگھ

کے بارے میں میری کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔

''حال ہی میں غیر پیشہ ور مورخ احمد سلیم نے ایک دلچسپ کتاب (بھگت سنگھ زندگی اور خیالات) کے ذریعے ہمیں تاریخ کے اس تہلکہ خیز واقعے کی یاد دلائی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر پھر کہتا چلوں کہ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہم نے اس واقعے اور اس کے محرکین کو طاق سیاں کی نذر کیوں کر دیا۔

خاصے کی بات تو یہ ہے کہ مصنف جس نے بھگت سنگھ پر مواد جمع کرنے میں دقیقہ رسی اور مشقت سے کام لیا اور پھر اس مواد کو گہرے جذباتی لگاؤ سے کتاب کے قالب میں ڈھالا وہ بھی اسے منظر عام پر لانے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے۔''

اس کے بعد خاصے طنزیہ لہجے میں انہوں نے میرے اٹھائے سوالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''احمد سلیم پچھلے کچھ عرصے سے ''ہیرو کی ضرورت'' کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ ابھی کوئی دو مہینے پہلے جدید پاکستانی ادب و ثقافت پر منعقدہ ایک سیمینار میں پنجابی ادب پر بات کرتے ہوئے انہوں نے چند حالیہ تحریروں میں (خاص طور پر نجم حسین سید کے حلقے سے) قرون وسطی کی شخصیت دُلا بھٹی کے ظہور کے حوالے سے یہی سوال اٹھایا تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتابچے کے ذریعے بھی ایک طرح کی تنگ نظر قومیت پرستی، پنجاب کے حکمران طبقے کی کاسہ لیسی اور اس کے استبدادی عزائم کی بالواسطہ علمبرداری کی مذمت کی ہے۔''

صفدر میر مزید لکھتے ہیں:

''بھگت سنگھ'' کے مصنف کے خیال میں ہمارے ادب میں ہیرو اور ہیرو پرستی کے رجحانات سماجی اور سیاسی سطح پر نقصان دہ ہیں کیونکہ ان کے ذریعے عوام میں جمود اور مفعولیت فروغ پاتے ہیں۔ اپنی تقدیر اپنے ہاتھ

میں لینے کی بجائے وہ دیومالائی کرداروں اور نجات دہندوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ہیرو پرستی کے جنون میں مبتلا ادیب یہ حقیقت نظر انداز کردیتے ہیں کہ تاریخ کے اصل معمار عوام ہی ہوتے ہیں۔ اور عوام ہی ہیرو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسے ادباء کا خیال ہے کہ تاریخ ہیرو کو جنم نہیں دیتی بلکہ ہیرو تاریخ کو تخلیق کرتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ یہ نقطہء نظر تاریخ میں ان لاکھوں افراد کے حقیقی کردار کی نفی کرتا ہے جن کی جدوجہد کا ذکر کیے بغیر انسانیت کے کسی باب کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔''

میری اس بحث کو لے کر صفدر میر نے اسے ایک اور پنجابی سورماء 'دُلا بھٹی' سے جوڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش کی اور میرے استدلال کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا:

''دراصل نجم حسین سید اور ان کے حلقے کے دیگر ادیبوں کے دُلا بھٹی کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوششوں کا محاکمہ کرتے ہوئے احمد سلیم ان جدید ادیبوں کے سیاسی، سماجی اور طبقاتی نقطہ ہائے نظر کے بارے میں شک و شبے کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس امر سے قطع نظر کہ یہ شکوک حقیقی بھی ہیں یا نہیں، احمد سلیم نے ایسی فلسفیانہ بحث چھیڑ دی ہے جس کا حتمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمیں تاریخ میں کسی بھی معروف شخصیت کے تذکرے سے بچنا چاہیے مبادا عوام کے تاریخ ساز کردار کے دعوے دار ہمیں عوام کے تاریخی کردار کا منکر نہ گردان لیں۔''

صفدر میر کے خیال میں:

''ہم تاریخ کی کسی بھی عوامی تحریک (خواہ وہ سوویت انقلاب ہی کیوں نہ ہو) پر نظر ڈالیں تو ہمیں بہت سی نمایاں شخصیات (بادشاہ شہزادے، باغی وغیرہ) سے واسطہ پڑتا ہے کہ جن کے کارناموں سے تاریخ اٹی پڑی ہے۔ مثال کے طور پر سوویت یونین کی تاریخ میں ہمیں ایگور کا ذکر ملتا ہے اور پھر یہ سلسلہ خوفناک ایوان، پیٹر اول، پوگاچیف، لینن اور دوسرے زعما تک چلتا ہے۔ ان شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے یا ان کے کارہائے نمایاں

کو سراہتے ہوئے سوویت مورخین کبھی پریشان نہیں ہوئے وہ عوام کے
تاریخ ساز کردار کی نفی تو نہیں کر رہے یا اسے کم تو نہیں کر رہے۔''

یہ ۱۹۸۷ کا دور تھا۔ ضیاء آمریت کے خلاف سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ادب و فن کی تحریک بھی عروج پر تھی۔ دوسری طرف صفدر میر نے ہیرو پرستی کے عالمی رجحان کی بھی نشاندہی کی اور لکھا:

''ہمارے ہاں یکا یک ''ہیرو مخالف'' رجحانات نمودار ہونے کی ایک وجہ شاید آج کل دنیا بھر میں بائیں بازو کی جماعتوں میں ''شخصیت پرستی'' کو رد کرنے کی لہر ہو۔ سوویت یونین میں سٹالن پرستی نے دنیا بھر میں ایسے چھوٹے بڑے رہنما پیدا کر دیئے تھے جو مطلق العنانی اور عوام پر اپنی رائے ٹھونسنے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ جہاں ان میں بعض لوگوں نے حقیقی طور پر اپنے عوام کی جدوجہد آزادی میں رہنمائی کی تھی (مثلاً ٹیٹو، ماوزے تنگ، سوئیکارنو) وہاں کچھ لوگ محض سربراہ حکومت ہونے کے ناتے یہ روپ دھارے ہوئے تھے۔ تیسری دنیا میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے عہد میں یہ بات روزمرہ کا معمول بن گئی ہے اور اس نے جگہ جگہ شخصیت پرستی کو فروغ دیا۔ جب ''سٹالن مخالف'' تحریک شروع ہوئی تو شخصیت پرستی کی مخالف تحریکوں نے ہر جگہ سر اٹھایا۔ تاہم جہاں بعض جگہوں پر سیاسی اور قومی شخصیات کو داخلی وجوہات کی بنیاد پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں اکثر ممالک میں سابق نوآبادیاتی اور سامراجی قوتیں، نوآزاد ممالک کی کمزور سماجی ساخت اور معاشی ڈھانچوں کو سازشوں اور زبردستی مسلط کردہ فوجی بغاوتوں کے ذریعے غیر مستحکم کر رہی تھیں۔ لومبا، نکروما اور سوئیکارنو کی معزولی ایسی ہی شخصیت مخالف تحریکوں اور سامراجی سازشوں کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔''

صفدر میر نے اس مسئلے کو ادب سے جوڑتے ہوئے لکھا:

''عین ممکن ہے کہ ادب میں شخصیت مخالف رجحانات پر حد سے زیادہ زور

کا ایسی سامراجی سازشوں سے کوئی تعلق نہ ہو مگر ان رجحانات کا جس نفسیاتی رویے سے تعلق ہے وہ بالآخر اگر سیاسی نہیں تو ثقافتی اور ادبی سطح پر اسی سمت رہنمائی کرتا ہے۔''

یہ ایک طویل اور دلچسپ بحث تھی اور یہی آج کا سوال بھی ہے دراصل تاریخ میں عوام کے اجتماعی کردار اور انفرادی ہیرو کی نشاندہی ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ میں خود بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی انفرادی دہشت گردی، ایک مارکسی جدوجہد میں تبدیل ہو رہی تھی۔ خود بھگت سنگھ نے اپنی تحریروں میں تشدد اور دہشت گردی کا مذاق اڑایا تھا۔۔۔ انہوں نے کسی کی جان لینے کے عمل کو بزدلانہ فعل قرار دیا تھا لیکن خاص تاریخی حالات میں، وہ جس طرح کی سرگرمیوں میں شریک رہے تھے، ان کی نفی کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ یہ سب کچھ کال کوٹھڑی سے نکلنے کے لیے کر رہے ہیں۔۔۔ انہیں اپنی بعض سرگرمیوں کے مکمل طور پر درست ہونے پر اصرار نہیں تھا لیکن وہ ایک ذمہ دار انقلابی کے طور پر ان سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

بھگت سنگھ کے ایک ساتھی اجے کمار گھوش کے بقول:

''ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ آزادی اور سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کے لیے کیسے جدوجہد کی جائے؟ انفرادی مگر منظم مسلح سرگرمیوں کو کیسے شروع کیا جائے۔ اس قسم کی سرگرمیوں کے علاوہ عوام کے شک وشبہ اور ہچکچاہٹ کو دور کرنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ خوف اور دہشت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ملک کو آزاد کروانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ عوام دشمن اور غیر مقبول حکمرانوں کو جا بجا حملے کر کے تحریک کو زندہ کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ آگے چل کر اس سرگرمی کو زیادہ مسلح اور منظم کر کے سوشلزم کی تعمیر کے لیے فوج تشکیل دی جائے۔''

صفدر میر نے اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی ہے کہ:

''جیل کے اندر یا باہر زندہ بچ جانے والے کم وبیش سبھی دہشت پسند اس نتیجے پر پہنچے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے زیادہ سائنسی، زیادہ مارکسی اور غیر جذباتی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ اجے کمار گھوش بھی ان لوگوں

میں شامل تھے۔''

یہ بحث ۲۰۱۱ کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات میں بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ضیاء آمریت کے دور میں تھی۔ اس بحث کا نتیجہ بہت سادہ اور سہل ہے۔ اجتماعی جدوجہد اور حریت پسندی کے انفرادی عمل کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا کہ ''تاریخ ان گنت سوانح کی کشید کا نام ہے'' عوام کے اجتماعی کردار کو گھٹایا نہیں جا سکتا لیکن یہ قیادت ہی ہوتی ہے جو فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہے۔

# عام لوگوں کی تاریخ ــــ تاریخ نویسی کا نیا اُفق

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

تاریخ کے مضمون اور تاریخ نویسی کے فن نے زمانۂ قدیم سے آج تک ترقی کی انگنت منزلیں طے کی ہیں۔ انسانی معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ علم کے حصول کے ذرائع میں بھی ترقی ہوتی رہی ہے، اور اس کے نتیجے میں علوم وفنون کے ذخیرے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ آج کا علم، ماضی کے مقابلے میں اپنی وسعت اور گہرائی دونوں میں کہیں زیادہ وقیع ہو چکا ہے۔ دیگر مضامین کی طرح تاریخ کا مضمون بھی آج ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ دیگر علوم کے ساتھ ارتباط اور ان سے استفادے کے نتیجے میں بھی اس مضمون میں نئی جہتیں پیدا ہوئی ہیں اور اب یہ ایک ایسا علم بن چکا ہے جو سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، علم الانسان، جغرافیے، ادبیات اور مذہبیات ــــ غرض مختلف علوم کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنی ثروت میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ جدید سائنس کی ترقیات نے بھی ایسے نئے ذرائع معلومات اور تحقیق کے ایسے آلات واسباب (tools of research) بہم کر دیئے ہیں جن کے استعمال سے تاریخی معلومات کے دائرے کو ہی وسعت حاصل نہیں ہوئی بلکہ حقائق کی توثیق اور ان کی درستگی کو طے کرنے کی سہولت بھی فراہم ہوگئی ہے۔ یہ بڑی قابلِ قدر کامیابیاں ہیں مگر ان تمام کامرانیوں کے باوجود جو تاریخ نویسوں اور تاریخ کے محققوں کو حاصل ہوئی ہیں، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج بھی منظرِ عام پر آنے والی تاریخ کا ایک بڑا حصہ معروضیت سے خالی ہے اور اس میں اب بھی بہت سے تعصّبات (biases) باآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دوسرے علوم سے استفادے کے نئے مواقع نکلنے اور وسائل تحقیق میں قابلِ ذکر اضافے کے بعد تاریخ کا علم ماضی کے مقابلے میں زیادہ مبنی برحقائق، تعصبات سے پاک اور معروضیت کا حامل

بن جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس ناکامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ تاریخ لکھنے کا کام اکثر و بیشتر موضوعی (subjective) تناظر میں ہی ہورہا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو افراد ہی کے اپنے ذاتی رجحانات اور ذہنی میلانات ہوتے ہیں جن کی اگر شعوری طور پر تربیت نہ ہوئی ہو اور ان کو معروضی طرزِ فکر و عمل سے ہم آہنگ نہ کیا گیا ہو تو وہ بہت آسانی کے ساتھ غیر معروضی رَو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خارجی ماحول بھی فرد کو غیر معروضی انداز میں سوچنے کی راہ پر لگا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومتوں کی پالیسیاں، ذرائع ابلاغ اور معاشرے میں بسنے والے افراد، مؤرّخ کے نقطۂ نظر اور اس کی تحقیق پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ تاریخ نویس نے اگر مختلف نقطہ ہائے نظر سے واقفیت حاصل نہ کی ہو اور وہ محض ایک مخصوص نقطۂ نظر کے دائرے میں پروان چڑھا ہو، تو ایسے تاریخ نویس کے لیے تو غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز اختیار کرنا اور بھی دشوار ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اس امر کا اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس کا کام کتنا پسماندہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے تاریخ نویسوں کی کمی نہیں جو مکھی پر مکھی مارنے ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ یہ ان ہی کے طفیل ہے کہ آج ہمارے پاس جو تاریخی کتب موجود ہیں یا جو نئی چیزیں آ رہی ہیں ان میں سے بیشتر میں وہی بادشاہوں اور درباروں کے قصے، شخصی حکمرانیوں کے احوال، حکمراں طبقات کی باہمی چپقلشیں، توسیع پسند ملکوں کے جارحانہ اقدامات، اقتدار کی غلام گردشوں سے نکل کر آنے والی کہانیاں اور اپنے زمانے کے بڑے لوگوں کے مشاغل کی تفصیلات تو موجود ہیں لیکن یہ متعلقہ معاشروں اور ان میں بسنے والے عام لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا پاتیں۔ ہمارے تاریخی سرمائے کی یہ کم مائیگی ہر لحاظ سے افسوسناک ہے۔

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جہاں صنعت و حرفت، تجارت، بینکنگ اور سائنس کے شعبوں میں اپنی ترقیات کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں وہیں ان کی ایک اہم پہچان ان کی دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں کی آزاد فضا بھی ہوتی ہے جس میں رہ کر محقق اپنا تحقیق اور تلاش کا کام قدرے یکسوئی کے ساتھ کرتے اور اپنے نتائجِ تحقیق کو مؤثر انداز میں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو ان معاشروں میں بھی تاریخ کا مضمون بڑی حد تک وہاں کے مروجہ سماجی و سیاسی نظام کے دائرے میں مقید نظر آتا ہے۔ اگر تاریخ اور تاریخ نویسی سو فیصد اسی دائرۂ کار کی پابند نہیں ہے تب بھی اس کا بڑا حصہ یا اس کا واضح تر رجحان اس دائرے کے اندر رہنے کا ہی ہے۔ قومی

ریاستوں کے قومی تشخص اور قومی نظریات نے تعصبات کو ایک مقدس قومی سانچہ یا قومی لبادہ فراہم کر دیا ہے۔ ماضی کی جو چیز اس سانچے کے اندر سموئی جا سکتی ہے اس کو سمو لیا جاتا ہے اور جن چیزوں اور حقائق سے یہ سانچہ مطابقت نہیں رکھتا یا جن کی گنجائش اس سانچے میں موجود نہیں ان چیزوں کو کم تر اور کم اہم گردان کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سی چیزیں تاریخ نویسی کے دائرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ ماضی وحال کی تاریخوں میں جو موضوعات تواتر کے ساتھ نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں ان میں سرِفہرست ایک عام آدمی اور عوامی زندگی کی اجتماعی شکلیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خواتین، غلام، پس ماندہ طبقات، غریب ہنرمند، جسمانی معذوریوں کے حامل افراد، غرض بڑی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن کو تاریخ کے منظرنامے میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ جن لوگوں کو تاریخ نویسوں نے نظر انداز کیا وہ کوئی غیر اہم لوگ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نظر انداز کر دیئے جانے والے لوگ ہی تاریخ کے زیادہ قابلِ ذکر اور زیادہ فعال کردار تھے۔ چنانچہ تاریخ نویسی کی یہ ایک دیرینہ کمزوری چلی آ رہی تھی کہ اس کے چھوٹے بڑے بیانیوں میں ایک عام آدمی غائب تھا۔ اور اگر اس کا کوئی وجود تھا بھی تو وہ ایک غیر اہم اور ایک غیر کار آمد فرد کی حیثیت سے تھا۔ تاریخ اور تاریخ نویسی کا یہ اتنا بڑا سقم تھا کہ اس کی طرف توجہ دینا ناگزیر تھا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صدیوں سے چلی آنے والی تاریخ نویسی کی اس کمزوری کو سب سے پہلے خود تاریخ نویسوں نے ہی محسوس کیا اور اس کی تلافی کی کوشش بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی۔ یہ طے کرنا تو قدرے مشکل ہوگا کہ ماضی میں نظر انداز کیے جانے والے تاریخی کرداروں کی تلاش کا کام پہلے پہل کب اور کہاں شروع ہوا لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ماضی کے بظاہر غیر اہم نظر آنے والے لیکن دراصل تاریخ میں بڑا موئثر اور حقیقی کردار ادا کرنے والے افراد کی طرف توجہ انقلابِ فرانس اور امریکا کی آزادی کے بعد مبذول ہونا شروع ہوگئی تھی لیکن بیسویں صدی میں اس سمت میں جو کاوشیں ہوئیں وہ زیادہ ارتباط اور تسلسل کے ساتھ ہوئیں۔ امریکا کی آزادی اور انقلابِ فرانس ایسے عہد ساز واقعات تھے جنہوں نے فرد کی آزادی اور اس کے دائرۂ کار کے حوالے سے غور وفکر کی راہیں کھولیں۔ فرانس میں والٹیئر اور روسو، برطانیہ میں ٹامس پین اور امریکا میں

نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے والے اور امریکی آزادی کے علمبردار قائدین اور مفکرین سے اس رجحان کا آغاز ہوا۔ یورپ اور امریکا میں یہ دور فیوڈل ازم کے خلاف نئے ابھرتے ہوئے تجارت پیشہ طبقے کی بغاوت کا دور تھا۔ اسی طبقے نے فیوڈل ریاستوں کی جگہ قومی ریاستوں کی داغ بیل ڈالی۔ فیوڈل ازم کے خلاف اس طبقے کی جدوجہد کا تقاضہ تھا کہ یہ اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرتا اور وسیع تر معاشرے میں اپنے لیے ایسے حلیف تلاش کرتا جو جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف لڑائی میں اس کا ساتھ دے سکتے۔ تجارت پیشہ سرمایہ دار طبقے نے فرد کی آزادی کا نعرہ اسی خیال سے بلند کیا کہ معاشرے میں موجود نچلے طبقات اس نعرے کے حوالے سے اس کی رفاقت پر آمادہ ہو جائیں۔ اس دور کے بڑے بڑے سیاسی دعوے اسی پس منظر میں سامنے آئے۔ امریکا کا اعلانِ آزادی اور امریکی دستور اسی رجحان کے عکاس تھے۔ تاہم سرمایہ دار طبقہ معاشرے کے نچلے طبقات کے ساتھ اپنے وعدے وعید میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ تو ان طبقات کی مدد سے جاگیرداروں کے خلاف اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعدازاں اس طبقے نے اپنی قومی ریاست بنانے کے بعد نچلے طبقات اور محنت کشوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ اس دور کے بارے میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرد، اس کے حقوق اور آزادی کے الفاظ تو گردش میں آ گئے لیکن ان تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے ضمن میں کوئی بڑی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ ان طبقات کی اپنی جدوجہد اور کاوشیں تھیں جنھوں نے ان کے وجود کو تسلیم کروایا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں یورپ اور امریکا میں معاشرے کے پسے ہوئے طبقات اور خاص طور سے محنت کشوں نے سماجی انصاف کے حصول کے لیے جو طویل اور صبر آزما جدوجہد کی اس نے ان کو تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش کردار بنا دیا۔ تجارتی کمپنیوں میں کام کرنے والے کارکن، کاروباری اداروں کے کلرک، کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش، کوئلے، نمک اور دیگر معدنیات کی کھدائی کرنے والے کانکن، ریلوے اور بحری جہازوں کی انگیٹھیوں میں کوئلہ جھونکنے والے محنت کار، یہ وہ لوگ تھے جن کے خون پسینے سے یورپ وامریکا اور دنیا کے دوسرے خطوں میں تاجروں اور صنعت کاروں کا کاروبار چلتا تھا۔ محنت کشوں کے حالاتِ کار بہت مخدوش ہوتے تھے۔ انہیں طویل گھنٹوں کی محنت کے عوض معمولی سی اجرت دی جاتی تھی۔ ان کو انتہائی انسانیت کُش حالات میں کام کرنے کی وجہ سے طرح طرح کی

بیماریاں لاحق ہوتی تھیں۔ نیز ان کے خاندان بھوک، تنگ دستی اور بیماریوں کی آماجگاہ بنے رہتے تھے۔ معاشرے کے پسماندہ ان طبقوں کا کردار مشین کے ایسے کَل پُرزوں کی طرح تھا جن کے بغیر مشین ناکارہ ہو جاتی ہے مگر جن کی انفرادی اہمیت کی طرف بالعموم نظر نہیں جاتی۔ یہ غریب غربا جریدۂ عالم پر اپنے بہت نمایاں نقوش کے باوجود تاریخ کے صفحات میں قدرے تاخیر سے اجاگر ہوئے۔ اس طرف پہلے پہل توجہ مبذول ہوئی تو ادیبوں اور ایسے دانش وروں کی طرف سے ہوئی جو معاشرے کے ساتھ زیادہ جڑے ہوئے تھے اور جو گرد و پیش سے صرفِ نظر پر آمادہ نہیں تھے۔ اسی پڑھے لکھے طبقے سے یہ رجحان پیشہ ور تاریخ نویسوں تک پہنچا جنھوں نے پہلی مرتبہ یہ سوچا کہ ان کے معاشرے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کو صرف حکمرانوں کی نظر سے دیکھنے اور دکھانے کے نتیجے میں ہمیں ماضی کا کوئی زیادہ بھرپور، متنوع اور حقیقت سے قریب تصور حاصل نہیں ہوتا۔

بیسویں صدی میں یہ تصور کہیں زیادہ شدت سے تاریخ نویسوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ بعض تاریخ نویسوں نے عمومی مطالعوں سے رخصت لیتے ہوئے خصوصی مطالعوں اور خاص طور سے اب تک نظر انداز کیے جانے والے گوشوں کو زیرِ بحث لانے کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جے۔ ایل۔ ہیمنڈ (J.L.Hammond) اور باربرا ہیمنڈ (Barbara Hammond) نے کوئی دس سال کے عرصے میں اور ایک سیریز کی شکل میں تین کتابیں مزدوروں کے موضوع پر لکھیں۔ ان میں پہلی کتاب 'دیہات کے مزدور' *(The Village Labourer)* ۱۹۱۱ء میں، 'شہری مزدور' *(The Town Labourer)* ۱۹۱۷ء میں اور 'مہارت یافتہ مزدور' *(The Skilled Labourer)* ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئیں۔ ان تینوں کتابوں کا موضوعِ گفتگو مزدور اور ان کی زندگیوں کے تجربات اور کوائف تھے۔ صنعتی انقلاب نے مزدوروں پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے تھے اور مزدوروں پر جبر کی کون کون سی نئی جہتیں پیدا ہوئی تھیں، اُن کا بڑا مؤثر اظہار ان کتابوں میں ہوا۔ ان کتابوں نے پڑھنے والوں کو محنت کشوں کی اجتماعی زندگی، ان کی ثقافت، ان کے مشاغل، رجحانات اور روزی روزگار کے مسائل کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔[۱]

۱۹۳۸ء میں سی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول (C.D.H.Cole) اور ریمنڈ پوسٹگیٹ (Raymond Postgate) کی مشترکہ کاوش 'عام لوگ' (The Common People) منظرِ عام پر آئی۔[۱]

۱۹۴۴ء میں ایک اور معرکتہ الآرا کتاب منظرِعام پر آئی۔ یہ جی۔ایم۔ٹریولیان (G.M.Trevalyan) کی 'انگلستان کی مصوّر سماجی تاریخ' *(Illustrated English Social History)* تھی۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب برطانوی تاریخ کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی پہلی جلد چوسر (Chaucer) کے زمانے کے انگلستان اور ٹیوڈر (Tudor) حکمرانوں کے دور سے متعلق ہے۔ دوسری جلد میں شیکسپیئر اور اسٹورٹ (Stuart) حکمرانوں کے دور کا ذکر ہے۔ تیسری جلد اٹھارویں صدی اور چوتھی جلد انیسویں صدی کا احاطہ کرتی ہے۔[۳] ٹریولیان نے عہدِ وسطیٰ اور وکٹورین دور کے درمیان انگریزی معاشرے کا بڑا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ وہ مشکل عبارت آرائی اور گنجلک خیالات کے بجائے بہت سادہ الفاظ میں اس پورے عہد کی تصویر کشی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس نے شعوری کوشش کی کہ اپنی کتاب میں سیاست اور حکمرانوں کا ذکر نہ کرے۔ یہاں تک کہ کتاب کے بارے میں اس نے یہ دعویٰ تک کیا کہ یہ عام لوگوں کی ایک ایسی تاریخ ہے جس میں سے سیاست کو نکال باہر کیا گیا ہے۔[۴]

ٹریولیان کی خواہش اور دعویٰ اپنی جگہ لیکن صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ وہ سیاست پر براہِ راست بات تو نہیں کرتا لیکن اس نے انگلستان کے معاشرے کے سماجی و اقتصادی روزمرہ کو جس تفصیل کے ساتھ رقم کیا ہے اس میں زیرِ سطح اس عہد کی سیاست کو بھی باآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ دیہی زندگی کی بڑی چابکدستی کے ساتھ منظرکشی کرتا ہے۔ وہ شہری زندگی کے امور کی نقشہ گری کچھ یوں کرتا ہے کہ اس میں کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں، نچلے طبقات کی بے بسی اور ان کا استحصال، ٹریڈ یونینوں کی سرگرمیاں، تعلیم کی بڑھتی ہوئی وسعت، صنعتی و کاروباری طبقے کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں اور فراغت کے اوقات کی دلچسپیاں، ادیبوں اور شاعروں کے حلقے، نوآبادیات سے آنے والی دولت کی کارفرمائی، نودولتیوں کی عیاشیاں، جنگوں کے کوائف، فوجی زندگی کے طور اطوار، عورتوں کی زندگی، رؤسا کی بیگمات، عام گھرانوں کی عورتوں اور نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والی ملازماؤں کے ایک دوسرے سے مختلف لباس، شوق اور مشاغل غرض یہ سب چیزیں بہت تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ٹریولیان انگلستان کے معاشرے کے اندر بحیثیت مجموعی ایک آگے بڑھنے کا رجحان دیکھتا ہے۔ وہ خوشحال ہوتے ہوئے طبقات کی خوشحالی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور پس ماندہ طبقات کی پسماندگی پر اس کا رویہ ہمدردی کا ہوتا ہے۔

ایک اور چیز جو اس کی کتاب میں اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے وہ برطانوی معاشرے کے عام لوگوں میں اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے اور زیادہ سے زیادہ آسودگی حاصل کرنے کا رجحان ہے۔ وہ اس دور میں سامنے آنے والے تعلیمی اصلاح پسندوں کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نئے تجربات کرنے والوں، نیز سائنسی ایجادات اور دریافتوں کو خاص طور سے منظرِ عام پر لاتا ہے۔ برطانیہ میں جس طرح سے مقامی حکومت کا نظام ایک تدریج کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نظام نے دیہی اور شہری علاقوں کی سطح پر لوگوں کو متحرک کیا اس کی تفصیلات بھی اس کی کتاب کا حصہ ہیں۔ اس عہد کے بڑے لوگ جنھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں کوئی بھی قابلِ ذکر کام کیا خواہ وہ پینٹر ہو یا ادیب، سماجی رہنما ہو یا سائنس دان، کوئی موجد ہو یا موسیقار، ٹریولیان نے سب کے کاموں اور کارناموں کا ذکر اپنی کتاب میں کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ یہ سب لوگ ایک زندہ معاشرے کے چلتے پھرتے کرداروں کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک طویل عہد کی جو تصویر کشی ٹریولیان نے الفاظ کے ذریعے کی ہے اس میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو اس کو ٹریولیان نے مختلف تصویروں، خاکوں یا کارٹونوں کی مدد سے پورا کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب کا بیانیہ اور اس میں شامل عکسی چیزیں مل کر بیسویں صدی تک کے انگریزی معاشرے کو بھرپور طور پر ہمارے سامنے لے آتی ہیں۔ ٹریولیان اپنی تاریخ کو سماجی تاریخ یا سوشل ہسٹری کا نام دیتا ہے۔

سماجی تاریخ نویسی یا تاریخ کے ذریعے معاشرے کی نقش گری کا کام دوسری جنگِ عظیم کے بعد کہیں تیزی سے آگے بڑھا۔ پہلی اور دوسری جنگ کے نتیجے میں یورپ میں بڑی تباہی تھی۔ خاص طور سے دوسری جنگ نے براعظم کو ایسی تباہی سے دوچار کیا جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بھرے پُرے شہر ویران ہو گئے، عمارتیں کھنڈر میں تبدیل ہو گئیں، کروڑوں لوگوں کی ہلاکت ہوئی اور اس سے زیادہ لوگ دربدری کا شکار ہوئے۔ جنگ کے فوراً بعد شہروں کی تعمیرِ نو کا کام شروع ہوا۔ لیکن تعمیرِ نو کا یہ کام صرف عمارتوں، سڑکوں، پُلوں، ریلوے اسٹیشنوں اور رہائشی مکانوں کی تعمیر کا کام نہیں تھا بلکہ یورپ کو بہت وسیع تر مفہوم میں تعمیرِ نو کے کام کو شروع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ جنگ کی ہولناکیوں نے اہلِ یورپ کو نفسیاتی اعتبار سے ایک ایسی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا جس سے نکلنے کے لیے ضروری تھا کہ جنگ و امن کے حوالے سے بنیادی مسائل کو زیرِ غور لایا جائے۔ تب جنگوں کے اسباب، معاشرے میں اونچ نیچ کی موجودگی، صنفی تفریق غرض مختلف

مسائل پر تحقیق کا ڈول ڈالا گیا۔ خود تاریخ نویسوں نے بھی ایک نئے انداز سے ماضی کو دیکھنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے اب تک عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کو اور پھر اپنے زمانے تک کو صرف سیاسی حوالوں سے دیکھا تھا۔ مگر اب جو معاشرہ سازی کی نئی شعوری کوششیں ہونی شروع ہوئیں تو ہر چیز کو اس کے ماضی کے تناظر میں سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ چنانچہ تعلیم، صحت، تعمیرات، صنعت و تجارت، سماجی بہبود، غرض ہر شعبۂ زندگی کے باب میں کی جانے والی گفتگو کو ماضی سے مربوط کرکے آگے بڑھایا گیا۔ یوں تاریخ کے صفحات پورے معاشرے کے لیے کھل گئے اور سماجی تاریخ نویسی کو تیزی سے فروغ حاصل ہونا شروع ہوگیا۔ ۱۹۵۹ء میں ڈورس میری اسٹینٹن (Doris Marry Stenton) کی کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا 'انگریزی معاشرہ عہدِ وسطیٰ کے اوائل (۱۰۶۶ء تا ۱۳۰۷) میں'۔[۵] تھی تو یہ عہدِ وسطیٰ کے بارے میں لیکن کتاب کی مصنفہ نے اس کے اندر عام آدمی کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس میں بادشاہوں اور نوابوں کا ذکر بھی آیا مگر یہاں بھی انداز غیر روایتی طور پر محلوں کے اندر کی زندگی، بادشاہوں، نوابوں اور امراء کی نجی زندگیوں کی تفصیلات کو اجاگر کرنے کا رہا۔ شہری اور دیہی علاقوں میں کس طرح کے روابط تھے، حکمران دیہات میں شکار کے لیے جاتے تو وہاں ان کے مشاغل کی نوعیت کیا ہوتی، یہ سب تفصیلات کتاب کا حصہ بنیں۔

ڈورس میری اسٹینٹن ہی نے ایک اور کتاب 'انگریز عورت، تاریخ میں'[۶] بھی لکھی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں انگلستان کے معاشرے میں عورتوں کی حیثیت، ان کے کردار اور ان کی سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی۔ اس کتاب میں زمانۂ قدیم سے ۱۸۶۹ء تک کے زمانے کا احاطہ کیا گیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سماجی زندگی کے مطالعے شروع ہوتے ہی تاریخ نویسوں کا رخ دیہی زندگی کی طرف ہوگیا۔ چنانچہ ابتدا میں منظرِ عام پر آنے والی سماجی تاریخوں میں ایک بڑا حصہ دیہات کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۹ء ریجنالڈ لینرڈ (Reginald Lennard) کی شائع ہونے والی کتاب 'دیہی انگلستان ۔ ۱۰۸۶۔۱۱۳۵'[۷] قابلِ ذکر ہے جس میں تقریباً نصف صدی کے انگریزی دیہی معاشرے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لینرڈ کی کتاب کے بعد ایک اور قابلِ ذکر کتاب ہینری پیلنگ (Henry Pelling) کی ۱۹۶۳ء میں

چھپنے والی کتاب 'برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تاریخ'[8] تھی۔ اس کتاب میں برطانیہ کے مزدوروں کی تحریک کے مختلف مراحل، ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا احاطہ کیا گیا۔

۱۹۶۳ء میں ای۔ پی۔ تھامپسن (E.P.Thompson) کی کتاب 'انگلستان کے محنت کش طبقے کی تعمیر'[9] شائع ہوئی۔ یہ بجائے خود ایک تاریخ ساز کتاب ثابت ہوئی، کیونکہ اس نے بعد میں ایسی ہی کئی اور کتابوں کی راہ ہموار کی۔ تھامپسن خود بھی محنت کش طبقات سے بہت قریب رہے تھے۔ وہ تاریخ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اشتراکی اور امن کی تحریکوں کے فعال رکن تھے۔ ان کی علمی سرگرمیوں کا ایک بڑا محور اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں چلنے والی برطانیہ کی انقلابی تحریکیں تھیں۔ ویسے تو انہوں نے ولیم مورس (William Morris) اور ولیم بلیک (William Black) کی سوانح حیات بھی لکھیں۔ وہ ایک صحافی اور مضمون نگار کی شہرت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری اور شاعری بھی ادبی حلقوں میں مقبول رہی لیکن وہ بڑا کام جس نے ان کو علمی و سیاسی اور انقلابی حلقوں میں ناقابلِ فراموش بنا دیا وہ انگلستان کے محنت کش طبقے کی مذکورہ بالا تاریخ ہی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یورپ میں بالخصوص اور عالمی سطح پر بالعموم، ایٹمی اسلحے کے خلاف جدوجہد میں صرف کیا۔

ای۔ پی۔ تھامپسن کی کتاب کے بارے میں ایک اور مصنف آرتھر مارِوِک (Arthur Marwick) کا کہنا ہے کہ:

> 'یہ تاریخ پر ایک مختلف انداز سے نظر ڈالنے کی سچی کوشش ہے، جس کے نتیجے میں محنت کش عوام کے احساسات و جذبات اور ان کی شعوری کوششیں صحیح تناظر میں سامنے آجاتی ہیں۔ یہ وہی عوام ہیں جن کے حوالے سے دوسرے تاریخ نویسوں کا رویہ یہ رہا ہے کہ جیسے یہ کوئی غیر فعال اور بے چہرہ لوگ تھے، جو تاریخ کے مرکزی دھارے سے الگ رہے تھے۔'[10]

ای۔ پی۔ تھامپسن اپنی کتاب میں جب محنت کش طبقے کے تاریخی کردار کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہیں تو وہ محض چند حقائق یا واقعات کا ذکر نہیں کرتے بلکہ خود اس طبقے کی نوعیت اور مجموعی معاشرتی نظام کے اندر اس کی حیثیت کے بارے میں بڑی فکر انگیز نظری گفتگو بھی کرتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ 'طبقہ دراصل ایک عمل کا نام ہے نا کہ ایک ڈھانچے (Structure) یا ایک ترکیب کا۔

یہ بڑی معنی خیز بات ہے جس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک طبقاتی نظام میں، مثلاً ایک سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کشوں کو پورے اقتصادی ڈھانچے کا ایک جز تسلیم کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ جز اس پیداواری نظام کا ناگزیر حصہ ہے اور اگر رہا ہے تو پھر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک خاص وقت اور علاقے میں خود کسی ارتقائی مرحلے سے گزر رہا ہے اور اس نسبت سے اس کے ڈھانچے میں محنت کشوں کا کردار کیا ہے محنت کش طبقے کا سرمایہ دارانہ نظام سے نامیاتی تعلق ایک ایسی حقیقت ہے جس کو سمجھے بغیر نہ تو اس نظام کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی محنت کشوں کے احوال وکوائف کے ضمن میں کوئی مفید گفتگو کی جاسکتی ہے۔

۱۹۶۶ء میں ای۔ پی۔ تھامپسن نے ایک اہم مقالہ لکھا جو مشہورِ زمانہ ٹی۔ ایل۔ ایس۔ (TLS) کے ۷/اپریل کے شمارے میں شائع ہوا۔[۱۱] اس مقالے کا عنوان تھا 'نیچے سے شروع ہوتی تاریخ' (History From Below) یہ ایک بنیادی مقالہ ثابت ہوا جس نے بعد میں بہت سے مقالوں اور کتابوں کا راستہ کھولا۔ اس میں تھامپسن نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ انسانی تاریخ میں جو ارتقائی سفر ہوا ہے اس میں زیادہ اہم کردار تو ان لوگوں کا تھا جو عام لوگوں کے زمرے میں آتے تھے، جو اپنے اپنے شعبوں میں محنت کے ذریعے معاشرے کی گاڑی کو آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیئے جانے والے لوگ تھے ان کو نہ تو حکومتوں نے اور نہ ہی معاشرے کے مقتدر لوگوں نے درخورِ اعتنا سمجھا۔

عام لوگوں کی تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے ایک اور بڑا نام اور بڑا کام ای۔ جے۔ ہوبس بام (E.J.Hobsbawm) کا نظر آتا ہے۔ ہوبس بام مارکسی نقطۂ نظر کے حامل مؤرّخ ہیں جنہوں نے برطانیہ کی تاریخ کا مارکسی زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کتابوں میں جو چیز نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کی اپنی بقا اور حقوق کی بازیافت کا رجحان ہے۔ ہوبس بام خاص طور سے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرے پر تحقیق کرتے ہیں۔

سماجی تاریخ نویسی کا رجحان جوں جوں مقبول ہوتا گیا اس کو زیادہ مؤثر اور زیادہ قابلِ اعتبار بنانے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ ماضی کے کسی بھی دور کے بارے میں موجود مخطوطے، ہم عصر تحریریں، یادداشتیں، سفرنامے، غرض مختلف النوع نوادرات (Archives) تو میسر تھے ہی، اب

عام لوگوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخ نویسی کے ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جوں ہی اس خیال نے فروغ پایا کہ ایک عام آدمی کی یادداشتیں بھی ماضی کے واقعات کو دریافت کرنے کے لیے یا جو واقعات پہلے محفوظ ہو چکے ہیں ان کی توثیق کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں، ویسے ہی اس فن کے بارے میں غور وفکر شروع ہوا کہ یادوں کو محفوظ کرنے کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ اگر لوگوں سے بالمشافہ ملاقات کر کے ان کے تاثرات ریکارڈ کیے جائیں تو ایک پہلے سے طے شدہ سوال نامہ مفید ہو سکتا ہے یا بغیر کسی تنظیم وترتیب کے، بلاتکلف بات چیت کا انداز زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے موضوعات زبانی تاریخ نویسی (Oral History) کے فن کا حصہ بنے اور اس فن سے وابستہ لوگوں نے اپنے اپنے طور پر ان سوالات کا جواب بھی دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اب زبانی تاریخ نویسی ایک ترقی یافتہ فن بن چکا ہے اور اس کے اوپر بے شمار کتابیں اور تحقیقی مقالے دستیاب ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب اس حوالے سے تاریخ نویسوں کی الگ تنظیمیں بھی بن چکی ہیں اور اس صنف سے متعلق تحقیقی جریدے بھی شائع ہونے لگے ہیں۔ *The Journal of the Oral History Society* اسی قسم کا ایک جریدہ ہے جو ۱۹۷۲ء سے شائع ہو رہا ہے۔

زبانی تاریخ نویسی کے نتیجے میں اب ایک عام آدمی بزبانِ خود تاریخ میں اپنے کردار کو محفوظ کروا رہا ہے۔ ماضی کے واقعات کی نت نئی جہتیں کھل کے سامنے آرہی ہیں اور یہ بات بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج تاریخ کا سرمایہ جتنا وقیع ہو چکا ہے اتنا اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

کتابوں، مسودوں اور تاریخی محفوظ خانوں میں رکھے ہوئے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ زبانی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پر اب جو سماجی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں وہ پچھلے تقریباً ایک سو سال میں لکھی گئی تاریخوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلچسپ، بامعنی اور گہرائی کی حامل نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ کتاب کا ذکر کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مشہور مؤرّخ ہاورڈ زِن (Howard Zin) کی شہرۂ آفاق تصنیف 'ریاست ہائے متحدہ کی ایک عوامی تاریخ۔۱۴۹۲ تا حال' ہے۔[۱۲]

ہاورڈ زِن کی کتاب پہلی بار ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا کہ یہ

اس وقت تک لکھی گئی امریکی تاریخ کی کتابوں میں پہلی کتاب تھی جس میں تاریخ کو امریکی عورتوں، فیکٹریوں میں کام کرنے والوں، سیاہ فام امریکیوں، مقامی لوگوں اور تارکینِ وطن کے نقطۂ نظر سے اور ان کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں محفوظ کی گئی تاریخ کو ماتحت گروہوں کی تاریخ کا نام بھی دیا گیا۔ زمانی اعتبار سے زِن کی تاریخ کا کینوس بہت وسیع تھا۔ اس میں کرسٹوفر کولمبس سے لے کر صدر کلنٹن تک کے دور میں امریکا میں جو کچھ ہوا اس پر عوام کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی۔ زِن کا طرزِ تحریر سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش بھی ہے۔ وہ جملوں کی ملمع سازی تو نہیں کرتے لیکن الفاظ کے انتخاب سے معنی آفرینی ضرور پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے ایک باب کا عنوان ہے۔ 'جنگ ریاست کی صحت ہوتی ہے' (War is the health of the state)۔ ایک باب کا عنوان ہے 'جب تک گھاس اُگ رہی ہے اور پانی بہہ رہا ہے' (As long as grass grows or water runs) ایک اور باب کا عنوان ہے 'مگر تسلیم و رضا نہیں، نجات، مگر آزادی نہیں' (Slavery Without Submission, Emancipation without Freedom)۔

امریکی تاریخ پر ہی ۱۹۴۴ء میں ایک اور ضخیم کتاب منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا نام 'امریکی عوام: ایک قوم، اور معاشرے کی تشکیل' [۱۳] ہے اس کتاب کے چھ مرتبین تھے، جن میں گیری بی۔ ناش (Gary B.Nash) اور جولی رائے جیفرے (Julie Roy Jeffrey) اصل مرتبین تھے جبکہ باقی چار ان کے معاونین تھے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل تھی۔ پہلی جلد ۱۴۹۲ء سے ۱۸۷۷ء تک کا احاطہ کرتی ہے، جبکہ دوسری جلد ۱۸۶۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۲ء تک کے دور کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں چھ صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ زندہ اور متحرک انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مرتبین نے نقشوں، تصاویر اور اعداد و شمار کے جدولوں کے ذریعے کتاب کے مضامین کو اور زیادہ قابلِ فہم اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ خاص طور سے انہوں نے پرانی اور نئی تصویروں کے ذریعے پڑھنے والوں کو مختلف ادوار میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات سے بہت قریب کر دیا ہے۔ کتاب کے مرتبین کسی مخصوص نظریے کے زاویے سے چیزوں کو دیکھنے کے بجائے یہ کوشش کرتے ہیں کہ جو چیز جس شکل میں ان کے سامنے آ رہی ہے اس کو محفوظ کر لیں۔ ان کی واحد کوشش بلکہ شعوری کوشش یہ نظر آتی ہے کہ پڑھنے والوں کی نظریں

وسیع تر معاشرے سے ہٹ نہ جائیں۔ اگر کتاب میں سیاست کا ذکر آتا ہے تو وہ بھی اس حوالے سے کہ اس نے معاشرے پر کیا اثرات مرتب کیے یا معاشرے کے رجحانات سیاست میں کس طرح متشکل ہوئے۔ کتاب کے مرتبین اس کے بارے میں خود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

'ماضی کو دیکھنے کے مختلف زاویے موجودہ کتاب کو پچھلے ۲۰ سال میں لکھی گئی بیشتر نصابی کتابوں سے متمیز کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بہت سے سرکاری واقعات مثلاً صدارتی انتخابات، بین الاقوامی معاہدوں اور اقتصادی موضوعات پر کی جانے والی قانون سازی کو نجی زندگیوں کی کہانیوں کے ساتھ مربوط کر کے دکھایا گیا ہے۔ ہم نے تاریخی ترتیب کے ساتھ اپنی قوم، ملک اور معاشرے کی تاریخوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم قومی سیاسی واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو ہم ان کے ان اثرات پر بحث کرتے ہیں جو انہوں نے ہمارے صوبوں اور مقامی سطح پر سماجی اور اقتصادی زندگی پر مرتب کیے۔' [۱۴]

کتاب کے مرتبین مزید لکھتے ہیں کہ:

'کتاب میں جنگوں کا تذکرہ صرف اس طرح نہیں ہوا ہے جس طرح کہ وہ میدان میں لڑی گئیں یا سفارتی حلقوں میں ان کا اظہار ہوا بلکہ وہ اس طرح موضوعِ بحث بنیں کہ گھروں کے محاذ پر ان کے کیا اثرات اور ردِعمل پیدا ہوئے۔ کیونکہ یہ داخلی محاذ ہی ہے جہاں جنگیں معاشرتی تبدیلی کا سب سے بڑا ذریعہ بنی ہیں۔ جو چیز اس کتاب میں ایک مستقل تصوّر کے طور پر جاگزیں ہے وہ عام امریکیوں کا امریکا کے خاص واقعات کے ساتھ تال میل کا تصور ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ہم نے اس کتاب میں یہ کوشش کی ہے کہ اپنی تاریخ کے انسانی ہونے کو اجاگر کر سکیں۔ یعنی یہ کہ ہماری تاریخ ہمارے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں کس طرح نظر آتی ہے۔' [۱۵]

سماجی تاریخ نویسی کا یہ متاثر کن مرقع ہمارے سامنے کن کن لوگوں کو لے کر آتا ہے، اس سے

مصنّفین کی دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں امریکی تاریخ کے مختلف ادوار کے لوگ...... امیر، متوسط، غریب، مرد، عورتیں، غلام، سفید فام، سیاہ فام، کسان، کانکن، مزدور، نرسیں، لانڈریوں میں کام کرنے والے، مذہبی اداروں کے کارکن، اقلیتیں غرض معاشرتی زندگی کا شاید ہی کوئی طبقہ یا شعبہ ہو جس کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ امریکی معاشرے میں تجارت وصنعت کے فروغ، فلم انڈسٹری کے بننے اور ترقی کرنے کے مختلف مدارج، صحافت کے شعبے میں ہونے والے تجربات، لوگوں کے لباس اور فیشن، شہری آزادیوں کی تحریک، لبرل ریاست کے پسِ پردہ اقتصادی عوامل، پھر نیولبرل ازم کے ابھار، امریکی معاشرے میں لکھنے اور پڑھنے کے رجحانات، کتابوں کی صنعت کے فروغ، ادب اور شاعری میں ہونے والے تجربات، غرض ایک پورا جہاں ہے جس کو اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گیارہ سو سے زیادہ بڑے سائز کے صفحات پر مشتمل یہ کتاب امریکی معاشرے کی تہہ در تہہ کیفیات اور مختلف معاشرتی پرتوں کی بہترین عکاس ہے۔ اور اس میں بیک نظر چھ سو سال کی طویل امریکی زندگی متحرک انداز میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سماجی تاریخ نویسی اور عوام کی تاریخ لکھے جانے کے جو تجربات اب تک ہوئے ہیں ان میں ایک اہم اور قابلِ ذکر تجربہ کرس ہارمن (Chris Harman) کا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر سے عوام کی تاریخ لکھنے کا ایک بڑا تجربہ تو ہاورڈ زِن نے کیا تھا جس کی کتاب کا ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر آئے ہیں۔ زِن کی کتاب صرف امریکی عوام کی تاریخ تک محدود تھی۔ لیکن مارکسی نقطۂ نظر سے ہی ایک اور کتاب کرس ہارمن نے ایک قدم آگے بڑھ کر لکھی۔ ہارمن نے اپنی کتاب کو کسی ایک ملک یا معاشرے تک محدود رکھنے کے بجائے اس کے دائرۂ کار کو پھیلا کر پورے عالمی کینوس کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہارمن کی کتاب 'دنیا کی عوامی تاریخ' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔[۱۶] اس کتاب کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہاورڈ زِن نے لکھا کہ: 'بہت سے لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا ایسی کوئی کتاب ہے کہ جس میں دنیا کو اس طرح سے برتا گیا ہو جس طرح میری کتاب نے اس ملک (امریکا) کو برتا تھا۔' زِن کا کہنا تھا کہ جس کتاب کی لوگوں کو تلاش تھی وہ اب ہارمن نے لکھ دی ہے۔[۱۷] حقیقت یہ ہے کہ کرس ہارمن نے صرف زِن کے امریکی کینوس کو پھیلا کر عالمی ہی نہیں بنا دیا بلکہ اس نے اپنی کتاب میں نظری وفکری اعتبار سے کئی نئے زاویے بھی متعارف کیے۔ ہارمن

صرف عوامی زندگی کے واقعات اور سماجی صورتِ حال کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ وہ واقعات کے درمیان رشتہ بھی تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات یوں اہم اور قابلِ ستائش ہے کہ واقعات محض مجرد واقعات نہیں ہوتے بلکہ اسباب کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو واقعات کو متشکل کرتا چلا جاتا ہے۔ ان ہی اسباب پر نظر رکھی جائے تو واقعات کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ معاشرے میں موجود سماجی نظام، سماجی رشتوں کی نوعیت کو طے کرتا ہے اور پھر یہ سماجی رشتے اپنے آپس کے تعلقات کے حوالے سے معاشرے کو اگلے مرحلوں کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ہارمن اپنی کتاب میں پیداواری نظام، پیداواری رشتوں، سماجی ساختوں اور تہذیب وتمدن کے ارتقا پر اُن کے اثرات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے انہوں نے عالمی تاریخ کو ذرائع پیداوار اور پیداواری نظاموں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ تاریخ کو چار بڑے ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور ابتدائی کمیونزم کے نظام کا دور، دوسرا عہدِ وسطیٰ، تیسرا عظیم تبدیلیوں سے منسوب زمانہ اور چوتھا اٹھارویں صدی سے شروع ہونے والا دور جس میں دنیا نے امریکی انقلاب، انقلابِ فرانس اور صنعتی انقلاب وغیرہ کا مشاہدہ کیا۔ کرس ہارمن تاریخ کو زمانی اعتبار سے تقسیم کرنے کے بعد ہر عہد کا الگ الگ مطالعہ کرتے ہیں اور کسی بھی عہد میں مشرق اور مغرب سبھی کرّوں اور خطوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ قدیم معاشروں کی بابت گفتگو کرتے وقت وہ قدیم ہندوستان، یونان کی شہری ریاستوں، روم کے عروج و زوال اور عیسائیت کے عروج سے بحث کرتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کی بابت لکھتے وقت وہ افراتفری (Chaos) کی صدیوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس باب میں وہ چین، بازنطین، ایشیا اور افریقہ میں اسلامی انقلابی، رجحانات، افریقہ کی تہذیبی صورتِ حال اور یورپی فیوڈل ازم پر بالصراحت گفتگو کرتے ہیں۔ عظیم تبدیلیوں کے باب میں وہ فتحِ ہسپانیہ اور نشاۃ الثانیہ سے اصلاحِ معاشرہ تک اور ایشیائی سلطنتوں کی آخری چمک کی بابت گفتگو کرتے ہیں۔ ہارمن کی کتاب کا ایک اہم حصہ 'نیا عہد نیا زمانہ' ہے۔ اس میں وہ یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح دو سوا دو سو سال میں دنیا کے نقشے پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس باب میں وہ امریکی انقلاب، انقلابِ فرانس، صنعتی انقلاب، مارکسزم، امریکا کی خانہ جنگی اور پیرس کمیون جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

یورپ اور امریکا میں سماجی تاریخ نویسی اور عام لوگوں کو تاریخ کا موضوع بنانے کا رجحان

صرف یورپ اور امریکا تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ رجحان اب تقریباً تمام ان ملکوں تک پھیل چکا ہے جہاں کی درس گاہیں اور خاص طور سے سماجی علوم کے شعبے زیادہ فعال ہیں۔ جنوبی ایشیا میں تاریخ نویسی اور اس کے جدید تر رجحانات کی طرف جتنی توجہ ہندوستان میں دی جا رہی ہے، اتنی شاید کسی اور ملک میں نہیں دی جا رہی۔ ہندوستان نے آزادی کے بعد اپنی جامعات میں تاریخ کے شعبوں کو خاصی اہمیت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر سالانہ کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایک ہسٹری کمیشن قائم ہوا جس نے تاریخی موضوعات پر تحقیق کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں آئینی اور جمہوری نظام کم و بیش تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے اور باوجود اس حقیقت کے کہ ہندوستان کی جمہوریت بھی نہ تو کوئی مثالی جمہوریت ہے اور نہ یہ داخلی تضادات اور مسائل سے آزاد ہے لیکن وہاں اتنی جمہوری فضا ضرور موجود رہی ہے کہ جس میں تحقیق کرنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اور اپنے جداگانہ زاویوں سے تحقیق کا کام کرتے رہے ہیں ان کو اتنی آزادی ضرور بہم رہی ہے کہ وہ ریاست کے اختیار کردہ بیانیے سے ہٹ کر متبادل تاریخ نویسی کا راستہ اختیار کر سکیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بہت سے ایسے ادارے اور افراد موجود ہیں جنھوں نے سرکاری تاریخوں سے ہٹ کر بھی تاریخ نویسی کی ہے اور بہت سے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کے جواب روایتی تاریخ نویسی سے میسر نہیں آتے۔

ہندوستان کے تاریخ نویسوں میں اب سے ۲۰، ۲۵ برس قبل ایک رجحان سبالٹرن تاریخ نویسی کا پیدا ہوا۔ اس تحریک کے روحِ رواں رانا جیت گوہا تھے۔ جنھوں نے چند ہی برسوں میں ایک اچھے خاصے بڑے گروپ کے ساتھ مل کر سبالٹرن ہسٹری کو ایک باقاعدہ رجحان اور تحریک کی شکل دے دی۔ سبالٹرن مؤرّخوں کا خیال تھا کہ جس طرح فوج میں سبالٹرن ایک معمولی سا سپاہی ہوتا ہے جس کا ذکر فوج کی قیادتوں اور اس کی فتوحات کے تذکروں میں جگہ نہیں پاتا جبکہ وہ فوج کا سب سے کارآمد فرد ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ نہ ہو تو فوج کس کو کہا جائے گا اور جرنیل فتوحات کیسے حاصل کریں گے۔ جس طرح فوج کا سپاہی انتہائی اہم مگر تاریخی تذکروں میں غائب نظر آتا ہے اسی طرح سبالٹرن مؤرّخوں کے خیال میں تمام شعبہ ہائے زندگی میں بظاہر کم تر درجوں پر فائز مگر معاشروں کا پہیہ مستقل طور پر چلانے والے عام لوگ تاریخ کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ ان مؤرّخوں کا خیال ہے کہ ہمیں ان سب لوگوں کو منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ گزشتہ ۲۰، ۲۵ برسوں میں

تاریخ نویسی کے سبالٹرن طرزِ فکر کے زیرِ اثر بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں تحقیقات ہو چکی ہیں جو ہمیں ماضی کا ایک زیادہ زندہ اور توانا شعور فراہم کرتی ہیں۔ ان تاریخوں کے سامنے آنے کے بعد اب تک لکھی جانے والی حکمرانوں، سلطنتوں، درباروں اور جنگوں کی تاریخ قدرے سطحی دکھائی دینے لگی ہے۔

ہندوستان ہی میں مارکسی تاریخ نویسوں نے بھی تاریخ لکھتے وقت اس کے سماجی پہلوؤں کو خاطرخواہ اہمیت دی ہے۔ مارکس ازم کی رو سے تو معاشرہ ہی بنیادی حقیقت قرار پاتا ہے اور ایک سماج یا معاشرے کے ذرائع پیداوار اور آلاتِ پیداور ہی اس معاشرے میں سماجی رشتوں اور طبقات کی نوعیت کو طے کرتے ہیں۔ معاشرے کا سیاسی نظام اس کے سماجی در و بست ہی سے اٹھتا ہے۔ سو سیاسی نظام کے تجزیے کے لیے بھی سماج کا مطالعہ ناگزیر قرار پاتا ہے۔ چنانچہ مارکسی مفکرین اور تاریخ نویسوں نے ہمیشہ تاریخ لکھتے وقت سماجی حقائق کو بنیاد کے طور پر سامنے رکھا ہے۔ البتہ ہندوستان میں چونکہ ایک عرصہ قوم اور قومیت کے مباحث، علمی فضا پر چھائے رہے لہٰذا بہت سے مارکسی دانشور بھی ان ہی امور پر اظہارِ خیال میں مصروف رہے۔ البتہ اب وہاں کے اشتراکی اور مارکسی دانشور بڑی تیزی سے معاشرے کے ان حلقوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں جو اس سے پہلے ان کے تاریخی مطالعوں کا موضوع نہیں بنے تھے۔ یہ مارکسی مفکر اور تاریخ نویس جب جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کے تجزیاتی سانچوں کی مدد سے ہندوستان کے ماضی کے ادوار میں سماج کے مختلف حلقوں کی تاریخ لکھتے ہیں تو ان کی تاریخوں میں کہیں زیادہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کتابیں تو بے شمار منظرِ عام پر آ چکی ہیں لیکن محض ایک مثال کے طور پر علی گڑھ سے شائع ہونے والی 'ہندوستان کی ایک عوامی تاریخ'[۱۸] کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل ایک سلسلۂ مطبوعات کا نام ہے جو بالآخر کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ سرِدست اس کی چار جلدیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں پہلی جلد 'ماقبلِ تاریخ' (Pre History)، دوسری جلد 'وادئ سندھ' (The Indus Civilization)، تیسری جلد 'ویدک دور' (The Vedic Age) اور چوتھی جلد 'موریا دور' (Morian India) کے بارے میں ہے۔ کتابوں کا یہ سلسلہ 'دی علی گڑھ ہسٹورین سوسائٹی' (The Alligarh Historian Society) کا منصوبہ ہے جو تاریخ کو سائنسی نقطۂ نظر سے لکھنا اور پیش کرنا چاہتی ہے۔ اس سوسائٹی کی کوشش ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں فرقہ

وارانہ اور تعصبات پر مبنی تاریخ کی توجیہات کی مزاحمت کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستانی تاریخ میں پس ماندہ طبقات اور عام لوگوں نے معاشرہ سازی کا جو کردار ادا کیا وہ سب اس عہد کے مآخذ کی مدد سے سامنے لایا گیا ہے۔ جس طرح سبالٹرن اسٹڈیز کے روحِ رواں گوہا تھے اسی طرح ہندوستان کی عوامی تاریخ کے منصوبے کے روحِ رواں پروفیسر عرفان حبیب ہیں جو ایک مارکسی مورّخ کی حیثیت سے اور خاص طور سے عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان پر اپنے کام کے حوالے سے دنیا بھر کے تاریخ کے حلقوں میں معروف ہیں۔

## عام لوگوں کی تاریخ اور پاکستان

عام لوگ جس طرح تاریخ کا موضوع بنے ہیں، اس پر گفتگو کرتے ہوئے لامحالہ ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں بھی اس حوالے سے کچھ کام ہوا ہے یا نہیں اور اگر ہوا ہے تو یہ کس سطح کا کام ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ بحیثیت مجموعی پاکستان میں اب تک جو تاریخ لکھی گئی ہے اس میں عوام کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی تاریخ کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے یہاں لکھی گئی تاریخ زیادہ تر روایتی تاریخ ہے جس میں حکومتوں کی آمد و رفت، بادشاہتوں کے قیام اور ان کے زوال یا پھر حکمرانوں کے سوانحی تذکروں کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔

زمانۂ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کی تاریخوں پر ہی کیا موقوف پاکستان میں انیسویں اور بیسویں صدی سے متعلق تاریخیں بھی حکمرانوں یا سیاسی قیادتوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور اس تاریخ کے تناظر میں قیامِ پاکستان کی تحریک یہ دونوں بھی زیادہ سے زیادہ چند شخصیات یا جماعتوں ہی کا احاطہ کرتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بارے میں پاکستان کی تاریخ دو قومی نظریے کے حوالے سے لکھی جاتی ہے۔ یہی سرکاری تاریخ نویسی کا رجحان ہے اور اسی کا اظہار بیشتر غیر سرکاری مورّخوں کے کام میں بھی ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں لکھی جانے والی تاریخوں میں نہ تو زمانۂ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے معاشروں کی صحیح طور پر عکاسی ہو پاتی ہے اور نہ ہی ہم بیسویں صدی میں پاکستانی علاقوں میں پیش آنے والے واقعات کو سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے علاوہ کسی دوسرے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود تحریکِ پاکستان میں عوام کے مختلف حلقوں کا کیا کردار تھا، اس کو بالوضاحت دیکھنے کے بجائے ایک عمومی رائے دے دی جاتی

ہے کہ مسلم لیگ نے رابطہ عوام مہم شروع کی تو مسلمان جوق در جوق اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ لیکن ایسا کہتے وقت ہم یہ دیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ 'عوام' تو ایک مجموعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تفصیل میں جا کر دیکھیں تو یہ مزدور ہوں گے، کسان ہوں گے، کاریگر اور کلرک ہوں گے، طالب علم اور اساتذہ ہوں گے، عدالتوں سے وابستہ یا سرکاری دفتروں میں ملازم ہوں گے، ان کے انفرادی اور گروہی پیشہ ورانہ اور علاقائی مفادات ہوں گے۔ ان سب نے پاکستان کے قیام کو کس نظر سے دیکھا تھا، اس ملک سے ان کی توقعات کیا تھیں۔ اس ضمن میں عملاً انہوں نے کوئی کردار ادا کیا؟ ان تمام امور کا ہماری تاریخ کی کتابوں میں بالعموم ذکر نہیں ہوتا۔ قومیت کے نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی تاریخیں زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص سیاسی فکر کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس تاریخ نویسی کا محدود دائرہ کار اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو وسعت دی جائے اور اس میں پھیلاؤ پیدا کیا جائے۔ ماضی میں چند لوگوں نے اس سمت میں تھوری بہت کوششیں کی بھی ہیں لیکن یہ کوششیں انفرادی سطح پر اور بغیر کسی ادارے یا حکومت کی پشت پناہی کے کی جاتی رہی ہیں۔ ملک کے دور دراز اور پس ماندہ علاقوں میں بھی بعض لوگوں نے جو تاریخ کا ایک اچھا ذوق رکھتے تھے اپنے طور پر اپنے خطوں کے ماضی کو تاریخ میں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ بعض اضلاع اور چھوٹے شہروں کی تاریخیں دستیاب ہیں ہر چند کہ وہ پیشہ ورانہ انداز میں نہیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اپنے مصنفوں کے ذوق کی نشاندہی ضرور کرتی ہیں۔ بعض لوگوں نے زمانۂ قدیم سے لے کر عہدِ وسطیٰ بلکہ اس کے بعد تک کے عرصے کی تاریخ کو اس کے سماجی پس منظر کے ساتھ لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً سبطِ حسن کی 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' ایسی ہی کتاب ہے۔

پاکستان میں اب تک سماجی تاریخ نویسی کی صورتِ حال یقیناً اچھی نہیں رہی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی تاریخ لکھنے کے امکانات مفقود ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وسیع و عریض میدان مستقبل کے تاریخ نویسوں کے لیے کھلا ہوا ہے اور اس میدان میں مختلف النوع حوالوں سے تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔ اس ضمن میں چند تجاویز پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات تو اس قسم کی تاریخ کی اہمیت کو محسوس کرنا ہی ہے۔ اب جب کہ دنیا کے مختلف معاشروں کے حوالے سے سماجی تاریخ کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں ہم پاکستان میں بھی ان نمونوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ملک کی سماجی

تاریخ لکھنے کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں۔

سماجی تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے ملک میں موجود تحقیقی ادارے اور جن جامعات میں تاریخ کے شعبے موجود ہیں ان جامعات میں عام لوگوں کی تاریخ کو موضوعِ تحقیق بنانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں اگر محققین کی پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت پیش آئے تو ان کو یہ تربیت بھی فراہم کی جاسکتی ہے۔ عوام کی تاریخ کا لکھنے کا کام انفرادی سطح پر کیا جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی ایک محقق بہت زیادہ پہلوؤں پر تحقیق نہیں کر پائے گا۔ اس لیے کارآمد طریقے کے طور پر محققوں کی ٹیموں کے ذریعے ایسی مشترکہ تحقیقوں کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے جو باہم مربوط بھی ہوں اور جس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف محقق کام کریں۔ اس طرح کی تاریخوں کو اچھے ایڈیٹروں کی ایک ٹیم ایڈٹ کرسکتی ہے جس کے ذریعے مختلف لوگوں کے کاموں میں تناسب اور ان کے کام میں ارتباط یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں بعض ایسے موضوعات کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے جن پر مستقبل کے محققین اور تاریخ نویس کام کرسکتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کی مجموعی تاریخ میں عوام کے کردار مختلف عوامی تحریکیں جن میں سے کچھ ملک گیر سطح کی حامل تھیں جبکہ بہت سی بعض مخصوص صوبوں اور ضلعوں تک محدود تھیں ان سب کا ذکر ہوسکتا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک، ۱۹۶۰ء کے عشرے میں بلوچستان میں ابھرنے والی قومیتی تحریک، ۱۹۷۳ء میں بلوچستان ہی میں مزاحمتی تحریک، ۱۹۸۳ء میں سندھ میں ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک اور ۲۰۰۷ء میں وکلاء کی طرف سے چیف جسٹس کو بحال کروانے کی تحریک قابلِ ذکر ہے۔ ان سب تحریکوں کا ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ ان میں عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی طرح پاکستان میں بہت سی صوبائی اور قومیتیں خودمختاری کی تحریکیں بھی مختلف ادوار میں جاری رہیں۔ سابق صوبہ سرحد میں ہشت نگر کی تحریک، بلوچستان میں پٹ فیڈ تحریک، سندھ میں سندھ ہاری تحریک، پنجاب میں اوکاڑہ کسان تحریک، یہ سب تحریکیں لائق ہیں کہ ان کے اوپر تحقیق کی جائے اور ان کے اسباب و نتائج اور ان کے دوران اختیار کی جانے والی حکمتِ عملی اور نیز ان میں عام لوگوں کی شمولیت معروضی انداز میں زیرِ بحث لایا جائے۔ اسی طرح معاشرے کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے پچھلے ۶۵ برسوں میں پاکستانی معاشرے میں جو کردار ادا کیا ہے یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی جو جو مثالیں قائم کیں ہیں وہ سب تاریخ کا حصہ بننے کی اہل ہیں۔

# حوالہ جات

۱۔ جے۔ ایل۔ ہیمنڈ اور باربرا ہیمنڈ کی کتابوں کو ای۔ سری دھرن (E.Sreedharan) سماجی تاریخ کے ذیل میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ سری دھرن برطانیہ میں سماجی تاریخ نویسی کی شروعات کا سہرا فیبئن سوشلسٹوں اور انقلابی۔ لبرل دانشوروں کے سر باندھتے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصے میں سماجی تاریخ نویسی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سری دھرن کے خیال میں آرنلڈ ٹوائن بی نے نچلے طبقات پر صنعتی انقلاب کے مرتب ہونے والے سخت گیر اثرات کو منظرِ عام پر لانے کا جو کام کیا، اسی کا تسلسل جے۔ ایل۔ ہیمنڈ اور باربرا ہیمنڈ کے بیش بہا کام میں دیکھنے میں آیا۔ ملاحظہ ہو:

E.Sreedharan, *A Textbook of Historiography 500 BC to AD 2000* (New Dehli: Orient Longman, 2000), p.239

2- *Ibid.*, p.240

3- See: G.M. Trevelyan, *Illustrated English Social History* (in four volumes) (England: Penguin Books Ltd., 1964).

4- E. Sareedharan, *op.cit.,* p.240

5- Doris Mary Stenton, *English Society in the Early Middle Ages 1066-1307* (London: Penguin Books, 1967).

6- Doris Mary Stenton, *The English Woman in History* (London, George Allen and Unwin Ltd., 1957).

7- Reginald Lennard, *Rural England 1086-1135* (Oxford: Clarendon Press, 1966).

8- Henry Pelling, *A History of British Trade Unionism* (England: Penguin Books, 1969)

9- E.P.Thompson, *The Making of The English Working Class* (London: Victor Gollanez, 1963)

10- Arthur Marwick, *The Nature of History* (London: Macmillan Press Ltd., 1981), p.230

11- E.P.Thompson, 'History From Below', *TLS,* 7 April, 1966.

# ایرک ہابس بام۔ایک اہم سماجی مؤرّخ

میری ہیوز وارنگٹن
ترجمہ:ہما غفار

لیو پولڈ پرس ہابس بام اور نیلی گرون کے بیٹے ایرک ہابس بام نے۱۹۳۲ء، انگلینڈ نقل مکانی سے قبل ویانا اور برلن میں تعلیم حاصل کی۔ انگلینڈ میں تعلیم کا سلسلہ سینٹ میری لی بون (St. Mary Lebone) گرامر اسکول اور کنگز کالج ، کیمبرج میں جاری رہا، اور وہیں سے بی۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی تعلیم مکمل کی۔انہوں نے اپنی علمی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا ایک بڑا حصہ برک بیک کالج، لندن میں گزارا[1] ہابس بام نے تاریخ اور سیاست کے گوناگوں موضوعات پر کافی کچھ لکھا، لیکن ان کی وجہ شہرت 'سرمایہ داری نظام کی کامرانی اور کایاپلٹ' (Triumph and trnasformation of capitalism) کی تاریخ لکھنے کے حوالے سے زیادہ ہے، جس کا آغاز 'دہرے انقلاب' سے ہوتا ہے(اول برطانیہ کا صنعتی انقلاب اور دوم فرانس کا سیاسی انقلاب) اور اختتام ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں وسیع علاقہ میں پھیلی ہوئی کمیونسٹ ریاستوں کے سقوط پر ہوا۔اس ضمن میں ان کی یہ تصانیف اہم ہیں: (*The Age of Revolution: Europe 1789-1848,* (1962); *Industry and Empire, an Economic History since 1750,* (1968), *The Age of Capital 1848-1875; The Age of Empire 1875-1914,* (1987); and *Age of Extremes, the Short Twentith Century 1914-1991,* 1994).

ہابس بام کے نزدیک ۱۷۸۰ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان، 'دہرے انقلاب' کے عہد نے یہ مشاہدہ کیا کہ:

12- Howard Zinn, *A People's History of The United States 1492- Present* (New York: Perennial imprint of Harper Collins Publishers, 2001.

13- Gary B. Nash, Julie Roy Jeffrey, *et.al* (eds.) *The American People Creating a Nation and a Society,* vols. 1 and 2 (New York: Harper Collins College Publishers, 1994).

۱۴۔ ایضاً،ص xiii

۱۵۔ ایضاً۔

16- Chris Harman, *A People's History of the World* (New Dehli: Orient Longman, 2007).

۱۷۔ کرس ہارمن کی محولہ بالا کتاب کی پشت پر ہاورڈ زن کا بیان۔

18- *A People's History of India* (In different volumes) (New Dehli: Tulika Books, 2006).

اس کتاب کی مختلف جلدیں مختلف مصنفوں کی تحریر کردہ ہیں، لیکن ان میں سب سے سرکردہ نام پروفیسر عرفان حبیب کا ہے جو عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان، خاص طور سے اس کے زرعی نظام پر ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس ضمن میں ان کا کام انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۹۔ سیّد سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۷۵ء)

'صنعت کی کامیابی بحیثیت صنعت نہیں، بلکہ سرمایہ دارانہ صنعت کے، حریت و مساوات کی عمومی کامیابی نہیں، بلکہ متوسط طبقہ یا بورژوا لبرل معاشرہ کی، 'جدید معیشت' یا 'جدید ریاست' کی نہیں، بلکہ دنیا کے مخصوص جغرافیائی حصے میں پائی جانے والی معیشتوں اور ریاستوں کی (یورپ اور شمالی امریکہ کا کچھ حصہ)، جن کا مرکز ہمسایہ اور حریف ریاستیں عظیم برطانیہ اور فرانس تھے۔'

(The Age of Revolution, p.1)

موجودہ سماجی ڈھانچے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے پیداوار پر جو بار مسلط کر دیا تھا اس کو بام عروج تک پہنچانے میں برطانیہ نے رہنمائی کی (ایضاً، ص۲۸) وہاں، کاشتکاری پہلے ہی سے بڑے پیمانے پر مارکیٹ کے لیے تھی، دیہی علاقہ کے طول وعرض میں مصنوعات پھیل چکی تھیں اور 'ذاتی منافع اور معاشی ترقی کو حکومتی پالیسی کے اعلیٰ عناصر کے طور پر قبول کیا جا چکا تھا۔' (ایضاً، ص۳۱)۔ زمینداروں کی ایک مختصر تعداد زمین کے بڑے حصے پر قابض تھی اور انہوں نے اپنی زمینیں مزارعوں کو پٹے پر دے دی تھیں۔ یہ مزارع بڑھتی ہوئی شہری مارکیٹ میں فروخت کے لیے غذائی اجناس کی پیداوار کرتے تھے۔ کاشتکاروں کی بڑھتی ہوئی وہ تعداد جو کاشتکاری کا کام حاصل نہ کر سکی وہ معیشت کے غیر زرعی شعبہ میں غیر مستقل مشاہرہ پر کام کرنے لگی۔ (ایضاً، باب۔۸) ابتداً انہوں نے شہری تاجروں کے لیے دکانوں یا گھروں میں کام کیا۔ نئی ٹیکنالوجی اور برآمدات اور مقامی مارکیٹ کے پھیلاؤ کے نتیجے میں آخر ہوا یہ کہ بہت سے لوگ فیکٹریوں کی ہراساں کر دینے والی صورتِ حال کے اندر مزدوری کرتے نظر آئے۔ ہابس بام کا استدلال ہے کہ اس صنعتی انقلاب نے مزدور کو مفلس کر ڈالا اور ابھرتی ہوئی صنعتی پرولتاریہ کو اب تین چیزوں میں سے انتخاب کرنا تھا: آیا وہ متوسط طبقہ کے ضابطوں میں شریک ہو جائے یا ان کا اتباع کرے، زندگی کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے یا بغاوت کر دے۔ اور ان کے لیے لکھا یہ تھا کہ 'بغاوت نہ صرف ممکن تھی بلکہ فی الواقع لازم بھی۔' اس کا خیال ہے کہ مزدوروں اور سوشلسٹ تحریکوں، ۱۸۴۸ء میں فرانس، آسٹریا، پروشیا، ہنگری، بوہمیا اور اٹلی کے کچھ حصوں میں انقلابات سے زیادہ کوئی بھی چیز ناگزیر نہ تھی (ایضاً، ص۲۰۴)۔ تاہم ان انقلابات کو ایک سیاسی متبادل کی حیثیت سے ناکام ہی ہونا تھا

کیونکہ مزدوروں میں تنظیم، پختگی، قیادت اور سب سے بڑھ کر تاریخی مطابقت کی کمی تھی (The Age of Capital، ص۲۱)۔

اس کے بجائے یہ عہد ثابت ہوا (۷۵۔۱۸۴۸ء) لبرل 'بورژوازی' کی کامرانی کا عہد ثابت، کیونکہ اس عہد میں انقلابات نے غریبوں میں بھڑک اٹھنے والی بے اطمینانی کو زائل کر دیا اور معاشی، ادارجاتی اور ثقافتی بالادستی کو کامیابی حاصل ہوئی (The Age Of Empire، ص۹)۔ ہابس بام کا ایقان ہے کہ اس بالادستی کو صنعتی (برطانیہ) اور سیاسی (فرانس) انقلابات کے ذریعے تحفظ فراہم کیا گیا۔ اس کے مطابق فرانسیسی انقلاب (۹۹۔۱۷۸۹ء) بورژوازی کے مابین عمومی نظریات پر اتفاقِ رائے کے ذریعے ممکن ہوسکا۔ یہ لوگ اشرافیہ کے استحقاقِ نظامِ مراتب اور رومن کیتھولک چرچ کی سیاست وقوت کے خلاف اور ایک ایسی ریاست کی تخلیق کے حامی تھے جہاں 'سیکولر ریاست ہو جس میں شہری آزادیاں اور نجی کاروبار کے لیے ضمانت ہو اور ٹیکس دہندہ اور ملکیت رکھنے والوں کی حکومت ہو، (The Age of Revolution، ص۵۹، اس کے علاوہ دیکھیے :Echoes of The Marseillaise 1990) 'سرمایہ داری کے عہد' میں یہ 'دہرے انقلاب'، سرمایہ داری نظام کی عالمگیر کامرانی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے (۷۰ کی دہائی۔۱۸۴۸ء):

> 'ایک ایسے معاشرے کی کامرانی جسے یقین تھا کہ معاشی نشوونما کا دارومدار نجی کاروبار کی مسابقت پر ہے...... ایک ایسی معیشت جوان بنیادوں پر استوار تھی، چنانچہ وہ ایسی مضبوط بنیادوں والی بورژوازی پر قائم تھی جو کہ ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کو توانائی، اہلیت اور ذہانت نے ایک اعلیٰ مقام تک پہنچایا تھا اور ان کے اس کام کو استحکام بھی بخشا تھا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ نہ صرف یہ کہ ایسی دنیا قائم کریں گے جس میں دولت کی فراوانی موزوں طور پر تقسیم ہوگی بلکہ ہمہ وقت بڑھتی ہوئی روشن خیالی، عقلیت اور انسانی مواقع بھی ہوں گے، جس میں سائنس اور فنون کی ترقی ہوگی، مختصر یہ کہ ایک ایسی دنیا جس میں مسلسل اور تیز رفتار مادی اور اخلاقی ترقی ہوگی...... دنیا کے ادارے...... آہستہ آہستہ ایک سرحدی اعتبار سے وضاحت یافتہ 'قومی ریاست' کے بین الاقوامی نمونوں تک ترقی پا جائیں

گے جس میں ایک دستور کے ذریعے ملکیت اور شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ ایسی منتخب نمائندہ اسمبلیاں اور حکومتیں ہوں گی جو ان کے سامنے جوابدہ ہوں گی اور جہاں پر مناسب ہوا، عام لوگوں کی سیاست میں شرکت اس حد بندی کے ساتھ کہ وہ بورژوا سماجی ترتیب کی یقین دہانی کرتی ہو اور ان کے ہٹانے کے لیے کسی بغاوت کو ناممکن بناتی ہو۔'

(The Age of Capital, p.1)

یوں انیسویں صدی کی تاریخ کا پلڑا صنعتی انقلاب کی حمایت میں جھک گیا۔ حالانکہ ۱۸۷۰ء کی دہائی کی کساد بازاری سے، جو کہ 'عہدِ شہنشاہیت' (Age of Empire) (۱۹۱۴ء۔۱۸۷۵ء) کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، یہ واضح ہو چکا تھا کہ لبرل بورژوا کے ذریعے اور اس کے لیے جو دنیا تخلیق ہوئی ہے وہ جدید صنعتی دنیا کے لیے پائیدار پیمانہ ثابت نہ ہوگی (The Age of Empire, p.11) سیاسی حوالے سے لبرل عہد کا اختتام اس آگہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا کہ نظامِ مراتب کے حامل امرا اور بورژوا طبقہ 'نچلے طبقات' کے لیے نہ ہی آواز اٹھا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مدد پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔ 'نچلے طبقات' نے اب مزدور طبقے کی ان جماعتوں اور ان تحریکوں میں اپنے لیے آواز بلند کی جن کی سمت عمومی طور سے سوشلسٹ تھی۔ اس 'عہد' نے 'قوم' اور 'قومیت' کے نظریات کا ابھرنا بھی دیکھا (باب۔۶، The Age of Empire دیکھیے: Nation And Nationalism Since 1780) اس کی مزید خصوصیات میں بے لگام مسابقانہ نجی کاروبار سے گریز، برطانیہ کی صنعتی اجارہ داری، چھوٹے اور درمیانہ درجہ کے کاروبار اور حکومت کا کاروباری معاملات میں دخل اندازی سے اجتناب اور بڑی کارپوریشنوں کے قیام کی جانب پیش قدمی، زائد پیداوار اور اسراف، حکومت کی کافی حد تک دخل اندازی، سامراجیت۔ غلبہ کنندہ 'ترقی یافتہ' ممالک اور غلبہ شدہ 'ترقی پذیر' ممالک کے درمیان ایک تقسیم اور حریف قومی معیشتوں جیسا کہ برطانیہ، جرمنی، متحدہ امریکہ کے درمیان شدید بین الاقوامی مسابقت شامل تھیں۔

یہ حریفانہ سرگرمیاں پہلی جنگِ عظیم کی صورت میں ابھر کر سامنے آئیں، جو کہ 'انتہاؤں کا عہد' تھا یہ جنگ اس (Age of Extremes 1914-19) میں وقوع پذیر ہونے والی بہت سی

عالمگیر آفات میں اولین تھی۔ ہابس بام یہ سمجھتا ہے کہ 'مختصراً' بیسویں صدی تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: 'عہد آفات' (Age of Catastrophe آواخر ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۰ء)، 'سنہری عہد Golden Age) اواخر ۱۹۴۰ء تا ۱۹۷۳ء) اور 'تنزلی کا عہد' (The Landslide ۱۹۷۳ء تا ۱۹۹۱ء)۔ 'عہد آفات' یہ عہد اسم با مسمّٰی ہے۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائی کے درمیانی دور میں دنیا ہل کر رہ گئی۔ دو 'مکمل' جنگوں، بغاوتوں اور ابھاروں کی وجہ سے اور یہ ایک ایسے نظام کو طاقت میں لائی جس کے بارے میں سمجھا گیا کہ وہ بورژوا اور سرمایہ دارانہ معاشرے کا متبادل ثابت ہوگا، اس دور میں نوآبادیتی شہنشاہیتیں ڈھیر ہو گئیں، اور عالمی معاشی بحران سامنے آیا۔ یورپ کے کھنڈر سے کیونکر 'سنہری دور' ابھرا، اس بارے میں ہابس بام تجویز کرتا ہے کہ یہ پہلو مورّخین کی وضاحت کا ابھی تک منتظر ہے۔ جو چیز واضح ہے وہ یہ کہ معاشی، سماجی اور ثقافتی تبدیلی جو اس کے ساتھ منتج تھی وہ 'انسانی محفوظ شدہ تاریخ میں عظیم تر، سب سے تیز رفتار اور سب سے بنیادی تھی' (ص ۸ Age of Extremes,)۔ تاہم ۱۹۷۰ء کی ابتدائی دہائی میں دنیا شدید بے روزگاری، مندی اور تیزی کے دائرے، امیر اور غریب کے درمیان مستقل بڑھتے تفاوت اور کئی سوشلسٹ ممالک کے ٹوٹنے کے عمل کے خلاف نبرد آزما تھی۔

'انتہاؤں کے عہد' میں چار چیزیں نمایاں طور پر بڑھیں۔ پہلی، سرمایہ داری نظام کے نظریات اور طریقۂ کار کی تعمیرِ نو، جس نے اسے کیمونزم اور فاشزم کے بڑھتے ہوئے چیلنج سے کامیابی سے نمٹنے کا موقع دیا۔ اس نقطۂ نظر کے تحت، ہابس بام روسی انقلاب کی تصویر کشی بنیادی طور پر سرمایہ داری معاشروں کے لیے چوکنا کر دینے والی آواز کے طور پر کرتا ہے:

> 'جیسا کہ ہم بادی النظر میں دیکھ سکتے ہیں کہ سرمایہ داریت کے خلاف عالمگیر اشتراکی چیلنج کی قوت دراصل اس کے مخالف کی کمزوریاں تھیں۔ آفات کے عہد میں انیسویں صدی کے بورژوا معاشرے کے بکھرے بغیر نہ تو کوئی اکتوبر کا انقلاب آ سکتا تھا اور نہ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کا وجود ہوتا۔'
>
> (دیکھیں ص ۸، The Age of Extremes، 'The Present As History', In on History، ص ۲۳۷)

روسی انقلاب اور فاشزم نے سرمایہ داری نظام پر دباؤ ڈالا کہ وہ وسیع سماجی بنیاد کو اپنی گرفت میں لیں اور معاشی وعدوں پر عمل کریں۔ (ابواب ۴، ۵، ۹، Age of Extremes)

دوسرا یہ کہ دنیا اب یورپی مرکز (Eurocentric) نہیں رہی تھی۔ یورپی ممالک کی قوت اس وقت روبہ زوال ہوگئی جب ان کے نظریات اور صنعتیں گلوب کے ایک سرے سے دوسرے تک نقل مکانی کر گئے۔ یہ کایاپلٹ ترجمانی کرتی ہے Age of ....... Series کے پھیلے ہوئے احاطہ کار کی۔ جبکہ عہدِ انقلاب (The Age of Revolution) بنیادی طور پر مرکوز ہے برطانیہ اور فرانس میں ترقیاتی امور سے۔ 'انتہاؤں کا عہد' تمام دنیا میں تعمیر و ترقی سے عبارت ہے۔ تیسرا یہ کہ اس دور میں ماورائے قومیت سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ذرائع ابلاغ اور ذرائع آمدورفت میں نئی دریافتوں نے دنیا کو ایک 'واحد عملی یونٹ' بننے میں مدد دی۔ چوتھا یہ کہ یہ دور عبارت ہے 'روشن خیالی کے پروجیکٹ' کے پھیلاؤ سے جو کہ اخلاقی معیارات کے عالمی نظام کا قیام تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳، ۱۵، Barabarism: a User's Guide, in on History، صفحہ ۲۵۴)

یہ بیسویں صدی کی وہ ترقی تھی جس پر ہابس بام انتہائی تاسف کا اظہار کرتا ہے۔ وہ استدلال کرتا ہے کہ وہ لوگ جن کے پاس عمل کرنے کے لیے کوئی سماجی رہنما نہ رہے وہ ناگفتہ بہ امور انجام دیتے ہیں۔ دانشور یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ روشن خیالی کا منصوبہ سوائے اعلیٰ طبقے کے گورے مرد کے اختیارات کو پھیلانے کی خواہش کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن ہابس بام کی رائے میں یہ واحد بنیاد ہے ان تمام امنگوں کے لیے جو ایسے معاشروں کی تعمیر چاہتے ہیں جو انسانوں کے لیے زمین پر کہیں بھی ہوں رہنے کے لیے موزوں ہو اور بحیثیت فرد ان کے انسانی حقوق منوائے اور ان کا دفاع کرے۔ اس بنیاد کو ہٹا دیا جائے تو پھر ہم لوگوں کو پیشکش کریں گے ایک نفسانیت پر مبنی مادر پدر آزاد جنت میں داخل ہونے کا موقع۔ (ص ۲۵۴، 'Barbarism: a User's Guide', in on History) ہابس بام کا ایقان ہے کہ اس کا برملا اظہار ان کئی مظالم میں ہوا جو بیسویں صدی میں کیے گئے۔ بعض مؤرخین کا شاید یہ ماننا ہو کہ اس قسم کی چیزوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقتاً، ہابس بام اعتراف کرتا ہے کہ وہ بھی اسی انداز سے محسوس کرتا تھا:

> 'میں یہ سمجھتا تھا کہ تاریخ کا پیشہ، مثلاً نیوکلیئر فزکس کے برعکس کوئی نقصان تو نہیں پہنچائے گا۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ممکن ہے۔ ہمارے

مطالعے اسی طرح بم بنانے کے کارخانوں میں ڈھل سکتے ہیں جیسا کہ وہ ورکشاپس جن میں آئی۔آر۔اے نے کیمیکل کھاد کو دھماکہ خیز مواد میں تبدیل کرنا سیکھا۔'

('Outside and Inside History', in On Identity History' اور دیکھیں صفحہ۵، History Is Not Enough', صفحہ۲۷۷،ایضاً)

تاریخ ضرر پہنچا سکتی ہے کیونکہ ماضی کو انسانی اقدامات کے جواز کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ قومی، نسلی یا بنیاد پرستانہ نظریات کی زرخیزی کے لیے کھاد ہوسکتی ہے۔اور اگر کوئی مناسب ماضی نہیں ہے تو اسے تخلیق بھی کیا جاسکتا ہے (دیکھیں 'Introduction', In The Invention of Tradition، ص۱۴۔۱) اس کے ردِعمل میں مؤرخین کو چاہیے کہ شواہد کی برتری کا دفاع کریں اور تاریخ کے سیاسی ونظریاتی استحصال پر تنقید کی ذمہ داری کو بھی پورا کریں۔ ہابس بام کے نزدیک یہ خیال اس یقین کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ مؤرخین حقیقت اور فسانہ کے درمیان شواہد پر مبنی اور غیر شواہد پر مبنی بیانات کے درمیان فرق کر سکتے ہیں۔ (On History, pp.viii,6, 271-2)۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مؤرخین ایک معروضی مشاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے اپنے آپ کو موضوع بحث سے الگ رکھے۔ ہابس بام کا اصرار ہے کہ تمام مؤرخین 'اپنے زمان ومقامات کے مفروضات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔(ایضاً، صفحہ۲۷۶)۔لیکن 'مؤرخ' کے خطاب کا اہل ہونے کے لیے انہیں اپنے مفروضات کی ناقدانہ جانچ پڑتال کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہابس بام یہ بتاتا ہے کہ یہ اہم معاملات ہیں، تاہم اس نے ان کا زیادہ گہرائی سے جائزہ نہیں لیا ہے۔

حالانکہ وہ اس پر عمل پیرا ہوتا ہے جس کی وہ تلقین کرتا ہے جیسا کہ 'انتہاؤں کے عہد' کے تعارف میں وہ اپنی اس جدوجہد کے بارے میں بتاتا ہے جو اسے ان واقعات کو تاریخی حوالے سے بیان کرنے میں کرنا پڑیں جن کا اسے ذاتی طور پر تجربہ تھا (دیکھیں 'The Present as History', in On History، صفحہ۴۰۔۲۲۸)۔ پھر بھی وہ اپنی رائے پیش کرنے سے نہیں کتراتا۔جیسا کہ چند تبصرہ نگاروں نے نشاندہی کی ہے کہ 'انتہاؤں کے عہد' کا مطالعہ ہابس بام

کی ذاتی واقعہ نگاری کی وجہ سے اسے زیادہ قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔[2] وہ ہمیں یہ بتاتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا کہ وہ کن چیزوں کو قابلِ قدر گردانتا ہے۔ جیسا کہ یہ بہت واضح ہے کہ وہ مزدوری کرنے والے غریب اور صنعتی پرولتاریہ کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ 'سرمایہ داری کے عہد' کے تعارف میں سے اس اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

'اس کتاب کا مصنف جس عہد کو وہ (اس کتاب میں) برت رہا ہے۔ اس سے ایک قسم کی ناپسندیدگی، غالباً ایک قسم کے تنفر کو نہیں چھپا سکتا، اگر وہ کوئی اس کی عظیم الشان مادی کامیابیوں کو سراہ کر اور یہاں تک یہ سمجھنے کی کوشش کر کے کہ وہ کیا پسند نہیں کرتا...... اس کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کو ایک صدی پہلے چند لوگ سنتے تھے۔' صفحہ ۵

ہابس بام کا ان لوگوں کے ساتھ عہد 'جنہیں چند ہی لوگ سنتے تھے' کا واضح اظہار اس کی ان بڑی تعداد میں لکھی گئی کتابوں سے ہوتا ہے جو سماجی تحریک کی مختلف ہیئت اور بغاوت پر لکھی گئیں:
*Labour's Turning Point* (1948), *Primitive Rebels* (1959), *Labouring Men* (1964), *Captain Swing* (Welh G. Rude, 1969), *Revolutionairies* (1973), *Worlds of Lobour* اور *Bandits* (1969) (1984) یہ کتاب اصلاً ایف نیوٹن کے فرضی نام سے The Jazz Scene) ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی)۔[3] لیکن وہ مزدور طبقہ کی الگ روش کو افسانوی رنگ دینے کی خواہش کی بھی مزاحمت کرتا ہے۔ جیسا کہ ۱۸۳۰ء کے English Swing Riots کی روئیداد کے اس کے اور جی۔ روڈ (G. Rude) کے بیان میں ہمیں اس بات کی جان کاری سے نہیں بچایا جاتا کہ مزدور مداخلتِ بے جا، جلاؤ گھیراؤ اور دیہی دہشت کی کینہ پرورانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے (Captin Swing, p.11) نہ ہی وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کی کارروائیاں انقلابی سیاست کی ہم پلہ تھیں۔ مثلاً Primitive Rebels میں وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی سماجی تحریک میں سے اکثر کی ہیئت انقلابی سے زیادہ احیائی تھی وہ ماضی کی اقدار اور طریقہ کار کو بحال رکھنا چاہتی تھیں (جیسا کہ وہ حقیقتاً تھیں یا جیسا انہیں 'یاد' رکھا گیا)، ایک نئے معاشرے کی تشکیل نہیں چاہتی تھیں۔ 'رابن ہڈ قسم' کی سماجی رہزنی پر اس نے لکھا کہ:

'یہ جبر اور غربت کے خلاف، کسی خاص طبقے کے کاشتکاروں کے احتجاج سے کچھ زیادہ ہے، امیروں اور جابروں سے بدلے کے لیے ایک پکار، ان پر پابندیوں کا ایک مبہم سا خواب، افراد کی غلط کاریوں کی درستگی۔ اس کے مقاصد معتدل لیکن ایک روایتی دنیا جس میں لوگوں کے ساتھ منصفانہ رویہ ہو، نہ کہ ایک نئی اور کامل دنیا...... سماجی رہزنی کی تنظیم اور نظریہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور جدید سماجی تحریکوں سے کلی طور پر عدم مطابقت رکھنے والا ہوتا ہے۔'

(Primitive Rebels, p.5)

اس طرح ہابس بام اس مصنف کا بھی ناقد ہے جس نے اسے ایسی تاریخ لکھنے پر راغب کیا۔ مارکس۔ ہابس بام ایک پُر جوش مارکسسٹ نہیں ہے وہ اس سے ماورا جانے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ مارکس اور مارکسسٹ فکر میں کچھ دقیانوسی اور غلط ہے۔[۵] ہابس بام کو اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے بعد سے دنیا کی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے مارکس کی تاریخ کی مادی بصیرت سب سے بہتر رہنما ہے۔ ('Preface', In On History, p.ix) لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ ایقان بھی ہے کہ مارکسسٹ تاریخ کو باقی تاریخی بصیرت اور تحقیق سے الگ تھلگ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی نظر میں مارکس تحقیق میں نقطۂ آغاز ہے، نقطہ ورود نہیں۔ ('What do Historians Owe to Karl Marx', In On History, pp.14-56)

ہابس بام کی یہ گہری وابستگی شاید سب کے لیے پسندیدہ نہ ہو مگر ہابس بام کلی طور پر ان لوگوں کے لیے نہیں لکھتا ہے جن کی قلب ماہیت ہو چکی ہو۔ اس کے برعکس اس کی ترجیح وہ قاری دکھائی دیتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ تاریخ پر بحث سودمند ہے۔

# حوالہ جات


1- P. Keuneman, 'Eric Hobsbawm: a Cambridge Profile 1939', in R. Samuel and G. Stedman Jones (eds), *Culture, Ideology and Politics: Essays for Eric Hobsbawm,* London: Routledge & Kegan Paul, 1982, pp.366-8

2- See, for instance, R. McKibbin, 'Capitalism out of Control: Review of Age of Extremes', *Times Literary Supplement,* 28 October 1994, 4778: 4-6; and T.Judt, 'Downhill All the Way: Review of Age of Extrmes', *New Your Review of Books,* 25 May 1995, 42(9): 20-5.

3. For Details of his papers on forms of social movement and rebellion, see K.McClelland, 'Bibliography of the Writings of Eric Hobsbawm', in Samuel and Stedman Jones (eds), *Culture, Ideology and Politics,* pp. 332-63.

4. E. D. Genovese, 'The Polities of Class Struggle in the History of Society: an Appraisal of the Work of Eric Hobsbawm', in P. Thane, G. Crossick and R. Floud (eds), *The Power of the Past: Essays for Eric Hobsbawm,* Cambridge: Cambridge University Press. 1984, pp, 18-19.

5. Ibid., p.17.

6. Review of On History, *The Economist,* 19 July 1997, 344: 10.

# سندھ کا زرعی نظام اور سندھ ہاری کمیٹی کا کردار

ڈاکٹر تنویر احمد طاہر

## تاریخی پس منظر

سندھ قدیم تہذیب کا حامل علاقہ ہے۔ تاہم اس تہذیب کے سماجی ارتقاء میں اس علاقہ کی جغرافیائی صورت حال نے منفی کردار انجام دیا ہے۔ جنوب میں بحر ہند کے علاوہ کوئی ایسی قدرتی رکاوٹ موجود نہیں ہے جو اسے غیر ملکی حملوں اور مداخلتوں سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ سندھ پر برطانوی اقتدار سے قبل یہ مختلف النوع تہذیبوں کے حامل حملہ آوروں کی آماج گاہ رہا ہے۔ مختلف لیکن پسماندہ سماجی تشکیلوں سے تعلق رکھنے والے ان عناصر کی آمد نے سندھ کی اپنی تہذیب کے ارتقاء کے عمل کو ہمیشہ مسخ کیا ہے اور یہ آج بھی قبائلی جاگیردرانہ سماجی تشکیل کے شکنجے کا شکار ہے۔ آریاؤں سے لے کر عربوں' مغلوں اور پھر افغانوں تک سندھ میں آنے والے تمام حملہ آور اور مہاجر قبائل کی شکل میں آئے اور ان کے قبائلی تہذیبی عناصر نے سندھ کی تہذیب وتمدن کو قبائلیت میں جکڑے رکھا۔ جنہوں نے سندھ کے نسبتاً ترقی یافتہ سماجی تانے بانے' معاشی نظام اور اقدار پر منفی اثرات مرتب کیے اور یہ ایک کثیر النسلیاتی معاشرہ بن گیا۔ عرب دور میں اٹھارہ نئے قبائل سندھ میں داخل ہوئے (1) پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں مغرب اور شمال مغرب سے بلوچ قبائل اور جنوبی پنجاب سے جٹ قبائل نے سندھ میں ہجرت کی۔ اس ہجرت نے سندھ کی شہری آبادی میں قبائلی اقدار کے احیاء میں اہم کردار انجام دیا۔ 1739ء میں نادر شاہ اور بعد ازاں احمد شاہ درانی کے حملوں سے سندھ میں افغان قبائل بھی آباد ہونا شروع ہو گئے۔ کلہوڑہ قبائل کے اقتدار کے دوران افغان حملہ آوروں کو سالانہ خراج کی ادائیگی کے لیے سندھ میں نئی اراضی کی کاشت بڑھانے اور اپنی فوجی طاقت میں اضافے کے لیے بڑی تعداد میں بلوچ قبائل کو سندھ

میں آباد کیا گیا۔ قرون وسطیٰ میں عربوں کی آمد کے بعد زمین کو نجی ملکیت میں قرار دیا گیا۔ فاطمیوں کے دورِ اقتدار میں اراضی کے جاگیر کے طور پر عطا کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔۔ تاہم ریاست کو حاکمیت اعلیٰ کے باوصف زمینوں کی تقسیم اور جنس کی صورت میں ٹیکس وصول کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اراضی کی ملکیت کی مختلف شکلیں تھیں۔ جن میں خالصہ اراضی سندھ کے حکمرانوں کی ملکیت تھی' جاگیرداری اراضی' لگان کی وصولی کے لیے دی جاتی تھی' پٹے داری اراضی فوجی یا سول خدمات کے عوض تفویض کی جاتی تھی' زمینداری اراضی جن میں زمیندار کو ایک متعین ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا اور مذہبی اداروں' پیروں اور علماء کو عطا کردہ جاگیریں شامل تھیں۔(3) زیادہ تر اراضی موروثی ہاری کاشت کرتے تھے۔ جو ایک متعین لگان زمین دار کو ادا کرتے تھے وہ اپنے لیے مخصوص اراضی کی کاشت کا موروثی حق رکھتے تھے۔ یہ ہاری عام طور پر زمیندار کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ غیر موروثی ہاریوں کو موروثی حقوق حاصل نہیں تھے۔ کلہوڑوں نے علماء' پیروں خانقاہوں اور مدرسوں کو بغیر لگان جاگیروں کی تفویض کا عمل جاری رکھا اور اپنی فوج بڑھانے کے لیے ڈیرہ غازی خان سے تالپور قبائل کو بھی سندھ میں بلا کر آباد کیا گیا اور انہیں جاگیریں عطا کی گئیں۔ کلہوڑوں کے دور میں سندھی اور بلوچ قبائل کو شہری علاقوں میں آباد کرنے کے اقدامات نہیں کیے گئے اور پنجاب سے ہجرت کرنے والے ہندو خاندانوں نے شہروں میں تجارت' تعلیم اور ریاستی خدمات کے شعبوں میں قریباً اجارہ داری حاصل کرلی۔ تاہم سندھی حکمرانوں کے دور میں ہندوؤں پر زرعی اراضی کی ملکیت حاصل کرنے پر پابندی برقرار رہی۔ تالپوروں نے جلد ہی قوت پکڑلی اور بالآخر 1783ء میں اقتدار پر قابض بھی ہوگئے۔

## انگریزی تسلط کے زرعی نظام اور پیداواری رشتوں پر اثرات

سندھ پر 1845ء میں برطانوی قبضے کے وقت تالپوروں کی حکومت تھی۔ یہ حکومت بلوچی قبائل' بڑے زمین داروں اور پیروں' فقیروں اور علماء کی حمایت پر قائم تھی جب کہ عوام الناس اس حکومت کی زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے کی پالیسیوں کے باعث اس سے بے زار تھے۔ چنانچہ میانی اور ڈبو کی مختصر جنگوں میں حکمران میروں کے لیے لڑنے والوں میں سندھی شامل نہیں تھے۔(4) اس جنگ میں حصہ لینے والے سندھی برطانوی فوج کے سندھ ہارس رجمنٹ کا حصہ تھے۔

سندھ پر برطانوی فتح سابقہ ادوار کے حملہ آوروں کی نسبت قطعی مختلف تھی۔ ماضی میں حکمرانوں کی تبدیلی سماجی اور معاشی ڈھانچے ملکیتی رشتوں اور انتظامی نظام پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ لیکن برطانوی دور حکومت میں معاشرہ کیفیتی تبدیلی سے دوچار ہوا اور پرانے اداروں کی جگہ نئی سماجی قوتوں نے حاصل کرلی۔ برطانوی دور میں سندھ کی حیثیت ایک زرعی ذخیرہ گاہ کی تھی جس کا کام زرعی اجناس کی فراہمی' احمد آباد' بمبئی اور لنکاسٹر کی ٹیکسٹائل ملوں کے لیے خام کپاس فراہم کرنا تھا۔ زرعی آمدنی بڑھانے اور پیداوار بڑھانے کے لیے انگریزوں نے پیداوار کے طریقوں کو ترقی دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اراضی کاشت کرنے کی پالیسی اپنائی۔ تاکہ انہیں پیداواری اور ملکیتی رشتوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہ کرنا پڑے۔ اور انہیں وڈیروں' زمینداروں' پیروں اور فقیروں کی حمایت اور تائید حاصل رہے۔ چنانچہ نہری آب پاشی کے نظام کو وسعت دینے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی جس سے نہ صرف پیداوار اور مالیہ کی آمدنی میں اضافہ ہوا بلکہ زمین دار اور جاگیرداروں کا نوآبادیاتی نظم ونسق میں براہ راست مفاد بھی پیدا ہوا۔ انگریزوں نے سندھ میں نئے سیاسی' فوجی' عدالتی اور انتظامی ڈھانچے قائم کیے تاہم پیداواری رشتوں کو نا صرف قائم رکھا گیا بلکہ انہیں مزید مستحکم کیا گیا۔ البتہ انہوں نے خصوصی طور پر مالیہ کے نظام اور اراضی کی کاشت کاری کے نظام کو منظم کیا۔ انہوں نے جنس کے بجائے مالیہ کی ادائیگی نقد رقم میں کرنے کا نظام نافذ کیا۔ یہ نقد رقم کاشت کردہ اراضی کی متوقع کل پیداوار کے ایک تہائی پر مبنی تھی۔ اور مختلف اقسام کی اراضی کے لیے مختلف پیداواری ہدف مقرر کیے گئے تاہم مالیہ کی وصولی کا پرانا نظام برقرار رکھا گیا۔ سندھ پر فتح حاصل کرنے کے بعد سر چارلس نیپئر نے 2000 جاگیرداروں کی توثیق کی جن کی ملکیت میں 19 لاکھ بیگھم اراضی تھی۔ یہ وہ جاگیردار تھے جنہوں نے برطانوی اقتدار سے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا تھا۔ ان میں درجہ اول کے جاگیرداروں کو دو لاکھ 93 ہزار ایکٹر' 17 تالپور میروں کو چار لاکھ 79 ہزار ایکٹر' 55 سرداروں کو 56 ہزار ایکٹر' 15 خانقاہوں اور پیروں کو 2 لاکھ 20 ہزار ایکٹر اور 23 بلوچ قبائل کو 54 ہزار پانچ سو ایکٹر پر مبنی جاگیریں عطا کی گئیں۔ برطانوی عہد کے نظم اراضی کے تحت 04-1903 میں قریباً 75 لاکھ ایکٹر اراضی ایسی تھی جس کے زمینداروں کو قابل انتقال اور قابل وراثت مالکانہ حقوق حاصل تھے جب کہ ایک لاکھ 33 ہزار ایکٹر اراضی کے مالکان کو اراضی کے انتقال کا حق حاصل نہیں تھا۔ تاہم یہ دونوں قسم کے

زمیندار زمین کا طے شدہ لگان حکومت کو ادا کرنے کے پابند تھے۔ 1901ء میں 125 ایکڑ سے کم اراضی رکھنے والوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ افراد تھی۔ جب کہ 9 لاکھ 55 ہزار افراد پر مشتمل زرعی آبادی میں بے زمین کاشتکاروں اور ہاریوں کی تعداد 8 لاکھ 35 ہزار تھی۔ (5)۔ اس طرح سندھی معاشرہ واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک طرف تین ہزار کے قریب افراد 500 ایکڑ سے زائد رقبہ کی مالیت کے حامل تھے جب کہ 8 لاکھ سے زائد زرعی آبادی بے زمین ہاریوں پر مشتمل تھی۔

مالیہ کی نقد رقم میں ادائیگی متعین کر دی گئی تھی۔ خواہ پیداوار کم ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خراب فصل کی صورت میں مالیہ کی ادائیگی کے لیے نہ صرف چھوٹے بلکہ بڑے زمینداروں کو بھی بھاری شرح سود پر ہندو مہاجنوں سے قرضے لینا پڑتے۔ چونکہ زرعی زمین اب قابل انتقال جائداد ہو گئی تھی اور نئے عدالتی نظام کے باوصف ان قرضوں کی وصولی کے لیے زمین رہن رکھنے یا اس کی ملکیت شہروں میں رہنے والے ہندو ساہوکاروں کو منتقل ہونے کا عمل شروع ہوا۔ جب کہ بعض صورتوں میں قرض کی ادائیگی کے لیے زرعی اراضی کو پٹے پر دینے کا عمل شروع ہوا۔ زرعی اراضی کے یہ نئے مالکان یا پٹہ دار شہروں میں رہتے اور انہیں کاشت کاری کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا اور وہ کم داروں کے زیر نگرانی ہاریوں سے کاشت کاری کا کام لیتے تھے۔ 1920ء کے آخر میں قابل مزروعہ اراضی کا 31 فیصد ہندوؤں کو منتقل ہو چکا تھا۔ (6)

1866ء میں سندھ میں سول عدالتوں کا نظام رائج ہوا اور محض 16 سال بعد 1771 ہندو مہاجنوں کے پاس 1200 ایکڑ سے زائد زمین کی ملکیت موجود تھی۔ اس طرح لگان وصول کرنے والے مہاجن، قرضوں کے عوض زمین کے انتقال سے پیدا ہونے والے نئے زمین دار اور تاجر جدید سندھ کی شہری آبادی کا حصہ بن گئے جو عمومی طور پر ہندو تھے۔ جب کہ ہندو ساہوکاروں کے سندھ کے دیہات میں زمین کی ملکیت، قرضوں اور پٹہ داری کے باعث مفادات بڑھتے چلے گئے۔ اس صورت حال کے باعث سندھ میں شہری دیہی تقسیم میں مذہب کا عنصر نمایاں اہمیت حاصل کرنے لگا۔ پنجاب میں اس صورت حال کے تدارک کے لیے لینڈ ایلی نیشن ایکٹ منظور کیا گیا تھا جب کہ بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ ہونے کے باعث سندھ کے لیے ایسا کوئی قانون 1946ء تک منظور نہیں ہو سکا کیوں کہ بمبئی کی اسمبلی میں ہندو اکثریت تھی۔ 1936 میں سندھ بمبئی

سے علیحدہ الگ صوبہ بنا دیا گیا۔ جس کی اسمبلی میں مسلم اراکین کی اکثریت تھی تاہم 1946 تک مسلم زمینداروں سے تعلق رکھنے والے مختلف گروہوں کی ہوس اقتدار نے حکومت بنانے کے لیے ہندو اقلیت کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس نوع کی قانون سازی نہیں ہونے دی۔ بالآخر 1946 کی مسلم لیگ حکومت کے دور میں یہ قانون منظور ہو بھی گیا تو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل نے اس کی منظوری نہیں دی۔ تا کہ یہ زمینیں متروکہ املاک میں شامل کی جا سکیں۔

## سندھ ہاری تحریک کا قیام

انیسویں صدی کی تیسری دھائی میں چلنے والی خلافت تحریک نے سندھ کے متوسط طبقے خصوصاً تعلیم یافتہ شہری عناصر میں سماجی و سیاسی شعور کو متاثر کیا۔ اس تحریک نے سندھی اشرافیہ کے ساتھ ساتھ سندھی اہل دانش کو بھی متحرک کیا۔ مزید برآں 1917 کے روسی انقلاب کے محنت کش طبقوں اور محکوم قوموں پر اثرات کے تحت ہندوستان بھر میں انگریز دشمن اور جاگیردار دشمن تحریکوں نے بھی ان عناصر کو متاثر کیا۔ اسی دور میں بڑھتی ہوئی سیاسی کشمکش اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک نے سندھ میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ 1932ء میں سکھر بیراج کی تعمیر سے 75 لاکھ ایکٹر زمین کی بیراج سے آبپاشی ممکن ہوگئی۔ دس سال کے عرصہ میں 15 لاکھ ایکٹرئ قابل کاشت اراضی بڑے زمینداروں اور پنجاب سے آنے والے آباد کاروں کو فروخت کردی گئی۔ جب کہ چھوٹے زمینداروں کو توقع تھی کہ اس زمین سے انہیں اپنی اراضی میں اضافے کا موقع ملے گا جب کہ ہاریوں کو امید تھی کہ یہ زمین انہیں ہارپ گرانٹ کے طور پر دی جائے گی۔ اگرچہ سکھر بیراج کی اراضی سے محض 93 ہزار ایکٹر زمین ہارپ گرانٹ کے تحت ہاریوں کے لیے مختص کی گئی تھی۔ لیکن سخت اور نا قابل عمل شرائط کے باعث اس کا بہت کم حصہ ہاریوں کو حاصل ہو سکا۔ بہت سے ہاریوں کو اس گرانٹ کے تحت ملنے والی اراضی وقت پر قسطوں کی عدم ادائیگی پر منسوخ کردی گئی بلکہ ادا کردہ رقم بھی ضبط کرلی گئی۔ محمد ایوب کھوڑو کی وزارت نے ہارپ گرانٹ کی شرائط مزید سخت کردیں جس کے نتیجے میں 8 ایکٹر سے کم رقبہ کی الاٹمنٹ پر پابندی عائد کردی گئی۔ قبضہ کے لیے نصف رقم کی فوری ادائیگی اور بقیہ رقم دس اقساط کی بجائے پانچ اقساط میں ادا کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ہاریوں کے لیے اس گرانٹ سے فائدہ اٹھانا عملاً ناممکن بنا دیا گیا۔ (7)

انگریز دور میں مزارعت کا جو بندوبست نافذ کیا گیا اس میں ہاریوں کے حالات زندگی بہتر بنانے کے لیے کوئی قانون وضع نہیں کیا گیا۔ نسلوں سے اراضی کاشت کرنے والے ہاری کو اس قطعہ اراضی سے کسی وقت بھی بے دخل کیا جا سکتا تھا۔ ہاری کی زندگی عملاً زمین دار کی رضا پر منحصر تھی اور اسے زمین، بیوی، مویشی اور زندگی سے محروم کر دیے جانے کا خطرہ ہر لمحہ لاحق رہتا تھا۔ بدترین تشدد، بیگار، ذلت اور مختلف مطالبوں کی ادائیگی اس کا مقدر تھی۔(8)

مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر 1930ء میں سندھ ہاری کمیٹی کے قیام کا فیصلہ ٹنڈو جام میں ایک اجلاس میں کیا گیا۔ جس میں جمشید مہتا، پرنسپل گوکھلے، جی ایم سید، شیخ عبدالمجید سندھی، جیٹھ مل پرسرام اور کامریڈ عبدالقادر شریک تھے۔ مؤخر الذکر کے علاوہ بانی اراکین میں سے کسی کا تعلق ہاری طبقے سے نہیں تھا۔ تاہم یہ تمام اراکین کانگریس اور ترقی پسند روشن خیال نقطۂ نظر سے متاثر تھے ہاری کمیٹی کے ابتدائی مطالبات میں ہارپ گرانٹس کی صورت میں ہاریوں کو الاٹمنٹ، بٹائی کے نظام میں بہتری اور ہاریوں کو ان کے زیر کاشت رقبہ پر مستقل حق زراعت دینا شامل تھے۔(9) مندرجہ بالا مقاصد سندھ میں رائج کاشتکاری نظام میں کسی بنیادی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ محض معمولی مراعات اور حقوق کا تقاضا کرتے تھے۔ اس کی وجہ اس کمیٹی کے بانیوں میں جی ایم سید اور عبدالمجید سندھی جیسے رہنماؤں کی شمولیت تھی جو جاگیرداری نظام کے خاتمے کی تائید نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب ہاری کمیٹی میں قادر بخش نظامانی اور نور محمد پلیجو نے سکھر بیراج کی اراضی کی بڑے جاگیرداروں کو فروخت کرنے کی مخالفت کی قرارداد پیش کی تو جی ایم سید اور ان کے حامی ہاری کمیٹی سے الگ ہو گئے۔(10)۔

سندھ کے زرعی نظام میں ہاریوں کے علاوہ ایک طبقہ مقدم بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ جاگیروں میں کام کرنے والے ایسے کاشتکار مزارعے تھے جو غیر مالکانہ قبضے کا حق رکھتے تھے اور مالیے کا حصہ جاگیرداروں کو ادا کرتے تھے۔ یہ مزارعے اکثر اوقات خود کاشتکار نہیں تھے بلکہ ہاریوں سے کاشت کراتے تھے۔ بڑے جاگیرداروں کی طرف سے سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد ان مقدموں کی بے دخلی کے واقعات بڑھ گئے کیونکہ لاکھوں ایکٹر زمین کی آبپاشی اور بہتر پیداوار کے مواقع پیدا ہو گئے تھے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی ابتدائی سرگرمی کا محور مقدموں کی جاگیروں سے بے دخلی کا مسئلہ تھا۔ ان سرگرمیوں کی بدولت سندھ ہاری کمیٹی مقدموں کے لیے جاگیروں پر موروثی

حقوق منوانے میں کامیاب رہی۔ کمیٹی کی سرگرمیوں کا آغاز حیدرآباد سے ہوا اور جلد ہی اس کا دائرہ کار نواب شاہ' سانگھڑ اور لاڑکانہ کے اضلاع تک پھیل گیا اس میں مقدموں کے علاوہ چھوٹے زمین داروں سے تعلق رکھنے والے ہاری بھی دلچسپی لینے لگے کیونکہ ان کے زمین دار نسبتاً ایسی سماجی طاقت کے حامل نہیں تھے کہ وہ اپنے ہاریوں کو ان سرگرمیوں سے الگ کرنے کے لیے دباؤ ڈال سکیں۔

مسلمان زمیندار طبقہ اگر چہ سیاسی اور سماجی اختلافات' مفادات اور رقابتوں کی وجہ سے مختلف مگر روز بدلنے والے گروہوں میں تقسیم تھا۔ لیکن ہاریوں کے حقوق کے معاملے میں اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے متحد تھا۔ 1943ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کے دوران کراچی ضلع کی اراضی کے مالیہ نرخ میں نظر ثانی کا بل جب حکومت کی طرف سے اسمبلی میں پیش کیا گیا تو میر بندے علی تالپور کی طرف سے التوا کی تحریک تمام جاگیردار اراکین کی حمایت سے منظور ہوگئی۔ ان جاگیردار اراکین نے اللہ بخش وزارت کے منظور کردہ جاگیرداری ایکٹ کی ترمیم کے لیے کمیٹی قائم کرنے اور اعزازی مجسٹریسی کا نظام بحال کرنے کی قرارداد بھی منظور کی تاکہ ہاریوں کے خلاف ان کے استبدادی اختیارات میں مزید اضافہ ہو سکے۔ (11)۔

سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے بٹائی نظام میں تبدیلی اور ہاریوں کے لیے مستقل حق مزارعت کی جدوجہد کو 1940ء میں منظور کردہ بمبئی مزارعت ایکٹ کی منظوری سے مزید مہمیز ملی۔ سندھ حکومت نے اس ایکٹ کے خطوط پر سندھ میں بھی ایسا قانون نافذ کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے سندھ کے کلکٹروں کی سفارشات طلب کیں۔ 1942ء میں ان سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے ماہرین کی کمیٹی نامزد کی گئی جس نے بمبئی کے حق مزارعت کے قانون کی روشنی میں ایک مسودہ تیار کیا تاہم ایوب کھوڑو نے اس مسودہ کی شدید مخالفت کی۔ 26 جون 1943ء کو سندھ حکومت نے اس کے لیے ایک 17 رکنی کمیٹی قائم کی۔ جس میں سے 14 اراکین جاگیردار تھے جب کہ باقی چار سول ملازمین تھے (راجر تھامس کو بعد ازاں اس کمیٹی میں شامل کیا گیا)۔ اگر چہ اس کمیٹی میں ہاریوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ تاہم اس کمیٹی کی سرکاری سطح پر تشکیل بذات خود اس امر کا اقرار تھا کہ سندھ کا زرعی نظام بنیادی تبدیلیوں کا متقاضی ہے۔ کمیٹی کے دائرہ کار میں ان سوالات پر سفارشات مرتب کرنے کے لیے کہا گیا کہ (ا) کیا ہاریوں کو مزارعت کے حقوق ملنا

چاہیے؟(ب) اگر ہاں تو کن ہاریوں کو؟(ج) یہ حقوق کون سے ہونے چاہیے اور ان(د) سفارشات کو کس طرح نافذ کیا جائے گا۔کمیٹی کی اس اہم سماجی مسئلہ پر سنجیدگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا اجلاس 6 ماہ بعد منعقد کیا گیا۔جس کے مطابق 200 افراد کو سوال نامہ ارسال کیا گیا۔صرف 8 افراد نے جوابات ارسال کیے۔کمیٹی نے اپنی سفارشات مرتب کرنے میں دو سال صرف کیے۔23 اگست 1945ء کو پیش کی گئی اس کی رپورٹ میں کہا گیا کہ( 1)ہاریوں کو حقوق مزارعت دیے جانے چاہیے۔(2) یہ حقوق صرف ایسے ہاریوں کو دیے جائیں جو 8 سال یا اس سے زائد عرصہ کے لیے 4 ایکٹر کے رقبہ پر کاشتکاری کرتا رہا ہو۔(3) موروثی ہاریوں کے نام رجسٹرڈ کیے جائیں اور (4) جنس کی صورت میں مالیہ کی ادائیگی کے نظام کو جاری رکھا جائے۔رپورٹ نے ابواب پر کچھ قانونی پابندیاں بھی تجویز کیں۔اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کے لیے سندھ حکومت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔سندھ ہاری کمیٹی نے ان سفارشات کو قانونی شکل دینے‘ ہاریوں کی بے دخلی اور بٹائی نظام کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کو تیز کیا اور اس کے لیے مختلف شہروں میں جلسہ اور جلوس منعقد کیے۔جس کی وجہ سے اس کی تنظیم اور دائرہ اثر میں اضافہ ہوا۔حیدر بخش جتوئی ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت سے مستعفیٰ ہو کر 1945ء میں سندھ ہاری کمیٹی میں شامل ہو گئے۔دیگر دو کلکٹر جناب ایم مسعود اور تھام کنسن ہاریوں کی جدوجہد سے ہمدردی رکھتے تھے اور ہاری کمیٹی کی سرگرمیوں میں مدد بھی فراہم کرتے تھے۔(12) چنانچہ ''آدھو آدھ بٹائی'' تحریک ان اضلاع میں یعنی نواب شاہ اور سانگھڑ میں زیادہ مؤثر تھی جہاں مذکورہ کلکٹر متعین تھے۔

مسلم لیگی حکومت نے مزارعاتی قانونی کمیٹی کی سفارشات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔جس پر سندھ ہاری کمیٹی نے احتجاجی جلسوں اور مظاہروں کے ذریعے ان سفارشات کو قانونی شکل دینے کے لیے احتجاجی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا۔سرہاری ضلع نواب شاہ میں 4 مارچ 1947ء کو منعقد ہونے والی ہاری کانفرنس میں ''آدھو آدھ بٹائی'' کا مطالبہ اور ''ہاری حق دار'' کا نعرہ منظور کیا گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہاری ابواب ادا نہیں کریں گے اور زمین دار کے لیے صرف نصف پیداوار بٹائی کے طور پر اراضی پر چھوڑ دیں گے۔نواب شاہ میں جہاں ایم مسعود کلکٹر تعینات تھے اس فیصلہ پر عمل درآمد بھی کیا گیا۔سانگھڑ کے کلکٹر مسٹر تھام کنسن کی پہل کاری پر شہداد پور میں یکم جون 1947ء کو

زمین داروں اور ہاریوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں شدید بحث و مباحثہ کے بعد نصف بٹائی کا اصول منظور کرلیا گیا۔ بٹائی تحریک نے تھر پارکر ضلع میں بھی نمایاں پیش رفت کی جس کے دباؤ میں زمین داروں اور ہاریوں کے نمائندوں کی میر پور خاص کانفرنس منعقدہ 16 جون 1947ء میں نصف بٹائی کے اصول کی منظوری دی گئی۔ ان کانفرنسوں کے ذریعے سندھ ہاری کمیٹی کو زمینداروں کی طرف سے ہاریوں کی نمائندہ تنظیم تسلیم کرنے کی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

## ہاری تحقیقاتی کمیٹی کا قیام

1946ء کے انتخابات میں سندھ میں پہلی مسلم لیگی حکومت قائم ہوئی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے لیگی حکومتوں کے لیے اقدامات وضع کرنے کے لیے آٹھ نکاتی پروگرام ترتیب دیا جس میں ایک کمیٹی کی تشکیل بھی شامل تھی جو کاشتکاروں کے مسائل کا جائزہ لے کر عملی اقدامات کی سفارشات مرتب کرے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے جاری بٹائی تحریک اور قائداعظم کی ہدایت کے زیر اثر سندھ اسمبلی نے 3 مارچ 1947ء کو ایک ہاری تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دینے کی منظوری دی جو سر راجر تھامس، ایم مسعود اور نور الدین صدیقی پر مشتمل تھی۔ شروع میں آغا شاہی اور بعد ازاں گوپی چند بنواری اس کے سیکریٹری نامزد کیے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاڑکانہ کے بڑے زمیندار غلام رسول کیہر کو اس کا چوتھا رکن نامزد کیا گیا۔ کمیٹی کے لیے ایک مبہم دائرہ کار تجویز کیا گیا جس کے مطابق تحقیقاتی کمیٹی کو ہاریوں کی مبینہ شکایات کا جائزہ لینا' ایسے اقدامات تجویز کرنا جن سے ہاریوں کے لیے ''بہتر زندگی'' کے حالات مہیا ہوسکیں اور اگر اس ضمن میں ایسے حقوق کی سفارش کی گئی ہو جن سے ''زمینداروں کے مفادات'' متاثر ہوتے ہوں تو ان مفادات کے تحفظ کی سفارشات مرتب کرنا۔ اس تحقیقاتی کمیٹی نے بالآخر قیام پاکستان کے بعد جنوری 1948ء میں اپنی اکثریتی رپورٹ پیش کی جو سال کے آخر میں شائع کی گئی۔ جب کہ ایم مسعود کا اختلافی نوٹ 1949ء تک شائع نہیں کیا جاسکا۔

ہاری تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں ہاریوں کی بے دخلی پر تشویش کا اظہار کیا گیا تاہم اس نے بٹائی نظام کو باہمی اعتماد کا رشتہ قرار دیا اور اس میں پیدا ہونے والے تنازعات کے تصفیہ کا نظام وضع کرنے سے گریز کیا۔ اور 1943 کی مزارعاتی قانونی کمیٹی کی اس سفارش کو غیر معینہ مدت

کے لیے مؤخر کر دیا۔ جس میں تمام ہاریوں کو مستقل مزارعاتی حقوق دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ ایم مسعود نے کمیٹی کے مباحثوں میں زمینداری نظام کے مکمل خاتمے اور زمین کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کیا تاہم ان کے اختلافی نوٹ میں زمین کی ملکیت کسانوں کو دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ (13)۔ ایم مسعود کا اختلافی نوٹ کمیٹی کے جاگیردار دوست اراکین کے فیصلے کے تحت شائع نہیں کیا گیا۔ تاہم بعدازاں اس کی اشاعت بعض عوامل کی وجہ سے ممکن ہو سکی جن میں۔ ہاری کمیٹی، مزدور تنظیموں اور نئی ابھرتی ہوئی حزب اختلاف کے دباؤ، صنعت کار یوسف ہارون کے وزیراعلیٰ ہونے اور آل پاکستان مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی رپورٹ جس میں پاکستان میں زرعی اصلاحات کی سفارش کی گئی تھی۔

مسلم لیگ کی مرکزی قیادت بنیادی طور پر ہندوستان کے اقلیتی صوبوں سے تعلق رکھتی تھی اور اسے نوزائیدہ ملک میں مقامی جاگیردار اور زمیندار قیادت کی طرف سے شدید مزاحمت اور مسابقت کا سامنا تھا۔ وہ زرعی صلاحات کے ذریعے ان طبقوں کی طاقت اور اثر و نفوذ کو ایک حد تک کم کرنا چاہتی تھی تو دوسری طرف زرعی اصلاحات کے ذریعے حاصل ہونے والی اراضی پر مہاجرین کو آباد کرنا چاہتی تھی۔ مزید برآں اس کے ذریعے حکومت کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں سے پیدا ہونے والی عوامی مخالفت کا زور توڑنے میں مدد مل سکتی تھی۔ پنجاب کے سب سے بڑے زمینداروں میں شامل میاں ممتاز دولتانہ کی سربراہی میں مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی نے اپنی رپورٹ 1949ء میں شائع کر دی تھی۔ جس میں فوری طور پر زرعی اصلاحات کا نفاذ، جاگیروں اور انعامی زمینوں کی بلا معاوضہ منسوخی، جنس کے بجائے مالیہ کی نقد ادائیگی۔ زمیندار کا پیداوار میں 2/5 حصہ مقرر کرنا، 150 ایکٹر تک فی فرد نہری زرعی حد ملکیت جب کہ بارانی زمین کی صورت میں 450 ایکٹر حد ملکیت اور کسانوں کے حق مزارعت کو تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ (14)۔ پاکستان مسلم لیگ کونسل نے اس رپورٹ کو اصولی طور پر منظور کر لیا۔ تاہم اس پر عمل درآمد صوبائی حکومتوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

## قیام پاکستان کے سندھ کے زرعی نظام پر اثرات

قیام پاکستان کے بعد انتقال آبادی سے اگرچہ سندھ کے زرعی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی واقع

نہیں ہوئی کیونکہ زمین دار اور ہاری دونوں مسلمان تھے۔ البتہ ہندو آبادی کے انخلا اور مہاجرین کی آمد سے بنیادی طور پر شہری زندگی میں کیفیتی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ ہندو مہاجن اور ساہوکار انگریزی بندوبست کے باعث 30 فیصد سے زائد زمینوں کے مالک بن چکے تھے۔ ان کے ہجرت کر جانے کے بعد سندھی زمیندار یہ توقع رکھتے تھے کہ یہ زمینیں ان کو واپس مل جائیں گی' جب کہ ہاری سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ ان زمینوں کو نسلوں سے کاشت کرتے آئے تھے لہٰذا یہ زمین انہیں مل جائے گی۔ دوسری طرف مہاجرین کا مطالبہ تھا کہ ہندوؤں کی زمینیں ان کو دی جائیں۔ مرکزی حکومت نے ہندوؤں کی ملکیت کی تمام زمینوں کو متروکہ املاک قرار دے کر انہیں ہاریوں اور مہاجروں میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح قریباً 16 لاکھ ایکٹر زمین مہاجروں اور ہاریوں کو الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جب کہ بقیہ زمین مقامی زمینداروں نے صوبائی حکومت اور نوکر شاہی کے تعاون سے ہتھیالی۔ ایک طرف مہاجروں کو زرعی زمینوں کی الاٹ منٹ سے ہاریوں کی بے دخلی کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ دوسری طرف ایوب کھوڑو کی وزارت اعلیٰ کے دوران ہاریوں کی بے دخلی میں بڑے پیانے پر اضافہ ہوا کیونکہ زمینداروں کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ مرکزی حکومت ایسی مؤثر زرعی اصلاحات کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس کے تحت کسانوں کو حق ملکیت حاصل ہو جائے گا۔ بے دخلیوں کے ان بڑھتے ہوئے واقعات کے خلاف سکھر' شکار پور' حیدر آباد اور کراچی کے اضلاع میں ہاریوں نے زبردست احتجاجی سرگرمیاں کیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کی اپیل پر 15 جنوری 1950ء کو جاگیرداری اور زمینداری کے خلاف دن منایا گیا۔ جس کی مزدوروں اور ترقی پسند تنظیموں نے بھرپور حمایت کی۔ سندھ اسمبلی میں مزارعاتی قانون کی منظوری کے لیے مہم تیز تر کر دی گئی۔ 1949ء کے اواخر میں سندھ ہاری کمیٹی نے اس کے لیے قانون کا ایک مسودہ بھی تیار کیا اور اس کے لیے رائے عامہ ہموار کی۔ اس مسودہ قانون میں جنس کے بطور مالیہ ادائیگی اور ابواب کے خاتمے اور ہاریوں کو ان کی زیر کاشت زمینوں پر مستقل حق مزارعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

کراچی میں ہاریوں کے حقوق کی حمایت میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں طلبہ اور مزدور تنظیموں نے ہاریوں کی زمین سے بے دخلیاں روکنے اور متروکہ اراضی ہاریوں اور مہاجرین کسانوں میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ (15) گورنر سندھ اور وزیر اعلیٰ سندھ کے

ہاریوں کی طرف ہمدردانہ رویے کے باوجود سندھ حکومت ہاری تحریک کو دبانے کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ ہاری کارکنوں کو سندھ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بلا جواز گرفتار کیا گیا۔ ہاری رہنماؤں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ تاہم ہاری کمیٹی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ 12 مارچ 1950ء کو دادو میں ایک بڑی ہاری کانفرنس منعقد کی گئی جس میں جاگیرداری اور زمینداری نظام کے بلا معاوضہ خاتمے کا مطالبہ کیا گیا اور ''جو بوئے وہ کھائے'' کا نعرہ منظور کیا گیا۔ دادو کانفرنس میں 200 سے زائد مندوبین' مزدور اور ٹریڈ یونین تنظیموں کے نمائندوں' دیگر صوبوں کی کسان تنظیموں کے رہنماؤں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ملحقہ دیہات کے سیکڑوں کسان بھی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہوئے۔ دادو کانفرنس نے پہلی مرتبہ جاگیرداری نظام کے خاتمے اور کسانوں کو زمین دینے کا مطالبہ کیا۔ اجلاس نے ایک قرارداد کے ذریعے جمہوری نظام حکومت کے قیام' دولت مشترکہ سے پاکستان کی رکنیت ختم کرنے اور سامراج نواز پالیسی ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ کانفرنس نے سندھ میں آباد سندھی اور مہاجر کسانوں کے اتحاد کو فروغ دینے کے لیے حکومت کی آبادکاری پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''سندھ حکومت کی اس پالیسی کے تحت ہزاروں ہاریوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔ جب کہ ہزاروں مہاجر کسان زمین کے لیے ترس رہے ہیں۔'' اس کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ متروکہ اراضی سے زمینداروں کو بے دخل کیا جائے اور اس اراضی کو ہاریوں اور مہاجروں کو الاٹ کیا جائے۔ (16) سندھ اسمبلی کے رکن قاضی مجتبیٰ نے سندھ ہاری کمیٹی کے مطالبات کی حمایت کرتے ہوئے سندھ حکومت کی طرف سے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینوں کو متروکہ املاک قرار نہ دینے اور انہیں زمینداروں کو دینے کی پالیسی پر شدید تنقید کی۔ (17)۔

سندھ حکومت ہاریوں کے حق مزارعت کے مسئلہ پر تقسیم کا شکار تھی۔ زمیندار اور اراکین اسمبلی کسی قسم کی زرعی اصلاحات کی مخالفت کر رہے تھے۔ جب کہ سندھ کے پنجابی گورنر اور صنعتکار وزیر اعلیٰ اصلاحات کے حامی تھے۔ یوسف ہارون نے اپنی بجٹ تقریر میں اعلان کیا کہ حکومت اسمبلی کے اس سیشن میں مزارعت کا قانون پیش کرے گی جس میں ہاریوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ سندھ ٹینینسی بل جب کابینہ میں پیش ہوا تو کابینہ میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس کے لیے اسمبلی پارٹی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں ایوب کھوڑو نے بل کی مخالفت کرتے ہوئے

بل کی دفعہ 5 میں ترمیم پیش کی کہ ہاری کے لیے زیر کاشت رقبہ صرف چار ایکڑ ہونا چاہیے۔ جب کہ بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ ایک کاشتکار خاندان کا زیر کاشت رقبہ اس قدر ہونا چاہیے جو وہ بیلوں کی ایک جوڑی کے ذریعے با آسانی کاشت کر سکے۔ یوسف ہارون نے اس ترمیم کی مخالفت کی اور کہا کہ کھوڑو اپنی ترمیم اسمبلی میں پیش کریں۔ اس پر کھوڑو نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔ اسمبلی پارٹی کے تمام زمیندار اراکین نے کھوڑو کی تقلید کی اور اجلاس میں کابینہ کے صرف 5 وزراء اور 4 اسمبلی اراکین موجود رہ گئے تھے۔ اس طرح اجلاس کورم کی کمی کے باعث ملتوی ہو گیا۔

حقوق مزارعت کے مسئلے پر ہونے والی بحث کے دوران ہاریوں اور زمینداروں کی طرف سے کافی سرگرمی دیکھنے میں آئی۔ سندھ اسمبلی میں قانون مزارعت کے لیے دباؤ بڑھانے کے لیے سندھ ہاری کمیٹی نے کراچی میں 2 اپریل 1950ء کو ایک بڑی ریلی کا انعقاد کیا۔ جس میں 15 ہزار سے زائد ہاری اندرون سندھ سے کراچی آئے تھے۔ اس ریلی میں اردو بولنے والے ٹریڈ یونین کارکن، طالب علم اور کراچی کے ترقی پسند سیاسی کارکن بھی پر جوش انداز میں شریک تھے۔ کراچی کی سڑکوں پر ہاری حقدار کا نعرہ لگاتے ہوئے اس جلوس نے سندھ اسمبلی کے سامنے پرزور مظاہرہ کیا اور دھرنا دیا۔ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے سندھ ہاری کمیٹی کے سربراہ حیدر بخش جتوئی کی قیادت میں ایک وفد سے ملاقات کی جس میں انہوں نے اپنے مطالبات کو منظور کرنے پر زور دیا۔ (18)۔

سندھ حق مزارعت قانون کی منظوری کو مؤخر کرانے کے لیے ایوب کھوڑو نے بل کی دفعہ 35 میں ترمیم پیش کی کہ اگر بل منظور کر لیا جاتا ہے تو یہ محض اس وقت نافذ العمل ہوگا جب اسمبلی اس کے لیے قواعد منظور کرے گی۔ کھوڑو نے 22 ترامیم پیش کیں جو جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل اسمبلی نے منظور کر لیں۔ ان ترامیم کے ساتھ اسمبلی نے سندھ ٹینسی بل 4 اپریل 1950ء کو منظور کر لیا جو یکم نومبر 1950ء سے نافذ العمل ہونا تھا۔ سندھ ہاری کمیٹی نے اس قانون کو ہاری مخالف قانون قرار دیتے ہوئے رد کر دیا اور کہا کہ اس کے تحت زمینداروں کی طرف سے ہاریوں کے استحصال میں مزید اضافہ ہوگا۔ (19) اس قانون کے تحت ہاریوں سے ابواب غیر قانونی اور بلا جواز کٹوتیوں اور بیگار کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ تاہم اس ممانعت کا عملی طور پر کوئی نفاذ نہیں تھا تاہم

اس شق کی موجودگی کے باعث ہاریوں نے عدالتوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اپیل کا حق ضرور حاصل کرلیا تھا۔اس قانون کے تحت ایسے ہاریوں کو جنھوں نے ایک زمیندار کی کم سے کم چار ایکٹر زمین تین سال تک کاشت کی ہو کے لیے مستقل حق مزارعت تسلیم کرلیا گیا۔ایک مستقل ہاری کو صرف اسی وقت بے دخل کیا جا سکتا تھا جب وہ زمین یا زمیندار کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر رہے یا اگر زمیندار کو یہ زمین خود کاشت کرنے کے لیے درکار ہو۔خود کاشت کے لیے حاصل کردہ زمین کی حد 150 ایکٹر مقرر کی گئی۔تاہم زمیندار کے لیے لازم تھا کہ وہ ہاری کو متبادل زمین فراہم کرے۔اس قانون میں بٹائی نظام کی ناانصافیوں کا ازالہ نہیں کیا گیا۔ہاریوں کو اس قانون کے نفاذ میں زمینوں سے بے دخلیوں کی روک تھام اور افسران مال کے پاس اپنی سکونت اور حق مزارعت درج کرانے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔کیونکہ سرکاری عملہ زمینداروں کے تابع تھا لیکن ہاریوں کو پہلی مرتبہ یہ موقع ملا کہ اپنی شکایات کے ازالے کے لیے قانونی اقدامات کرسکیں۔سندھ ٹینیسنسی ایکٹ نے ہاریوں کو انتہائی محدود حقوق دیے اور ان کے بنیادی مطالبات مسترد کر دیے گئے۔جبکہ متروکہ اراضی کے ہاریوں کو مستقل مزارعت کے حق سے حکومت پاکستان کے احکامات کے تحت محروم کردیا گیا۔ریونیو کمشنر سندھ نذیر احمد نے ایک سرکولر مجریہ 5 مئی 1951ء کے ذریعے قرار دیا کہ متروکہ زرعی اراضی کے ہاریوں کو حقوق مزارعت حاصل نہیں ہوں گے اور مہاجر الاٹی کسی بھی ہاری کو کسی بھی وقت بے دخل کرسکتا ہے۔اس طرح وہ محدود حقوق جو سندھ کی جاگیردار زمیندار حکومت نے بادل نخواستہ منظور کیے تھے مرکزی حکومت نے متروکہ اراضی کے ہاریوں کے لیے منسوخ کردیئے۔جب کہ ایم جی قادر، عرفان اللہ اور غفران اللہ جیسے بڑے لوگوں کو بلا تصدیق لاکھوں روپوں کی مالیت کی زمین عطا کردی گئی۔(20)۔

قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں مرکزی قیادت کو تمام صوبائی حکومتوں کی طرف سے خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ایوب کھوڑو کو اسی پاداش میں خصوصاً کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی مخالفت کرنے پر برطرف کردیا گیا اور انہیں پروڈا کے تحت مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی جگہ پیر الٰہی بخش کو وزارت اعلیٰ دی گئی جنہیں میر غلام علی تالپور اور قاضی فضل اللہ کی حمایت حاصل تھی۔جب کہ سندھ لیگ اسمبلی پارٹی بدستور ایوب کھوڑو پر اعتماد کا اظہار کررہی تھی۔لیگ کی صوبائی پارٹی میں گروہ کی بندی کے باعث گورنر جنرل غلام محمد نے سندھ اسمبلی برطرف کرتے

ہوئے دسمبر 1951ء میں گورنر راج نافذ کردیا۔ مرکزی اور صوبائی قیادت کے مابین ان اختلافات میں مرکزی حکومت نے جاگیردار قیادت کو کمزور کرنے کی پالیسی اوسندھ ہاری کمیٹی کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کے تحت سندھ میں زرعی اصلاحات کے منصوبہ کا اعلان کیا۔ سندھ کے گورنر دین محمد نے انکشاف کیا کہ ہاریوں کو ان کی زیر کاشت اراضی پر مناسب حقوق دینے اورابواب اور دیگر غیر قانونی کٹوتیاں بشمول بیگار کے خاتمے کے لیے ایک قانونی مسودہ تیار کیا جا رہا ہے۔(21)

گورنر راج کے نفاذ کے بعد گورنر کو کلی انتظامی اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔ ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے گورنر نے زرعی اصلاحات کے لیے اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کا آغاز کیا اور ایک آرڈی نینس کے ذریعے سندھ ٹینینسی ایکٹ کی بعض دفعات میں ترامیم کردیں جن پر سندھ ہاری کمیٹی کو شدید تحفظات تھے۔ لیکن ہاریوں کے بنیادی مسئلہ یعنی مستقل حقوق مزارعت مہیا کرنے کے لیے کوئی ترمیم تجویز نہیں کی گئی۔ سندھ ہاری کمیٹی نے گورنر سے پرزور مطالبہ کیا کہ اس ضمن میں مثبت پیش رفت کی جائے تاکہ ہاریوں کو حقیقی فائدہ اور تحفظ حاصل ہوسکے۔ گورنر دین محمد نے 10 اکتوبر 1952ء کو اعلان کیا کہ حق مزارعت کے لیے تین سال تک مسلسل کاشت کی شرط ختم کردی جائے گی اور تمام ہاریوں کو مستقل حق مزارعت دیا جائے گا۔ ایک پریس کانفرنس میں گورنر نے اعلان کیا کہ قانون مزارعت میں ترامیم کے بعد زمینداری نظام بھی ختم کردیا جائے گا۔(22)۔ ان ترامیم کے چند دن بعد گورنر نے مرکزی حکومت کو جاگیرداری نظام کے خاتمے کے قانون کا مسودہ منظوری کے لیے ارسال کیا لیکن مرکزی حکومت نے اس مسودہ کی منظوری کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ سندھ کے جاگیردار اور زمیندار اراکین اسمبلی نے گورنر کے ان اقدامات کی پرزور مخالفت کی۔ لیکن سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے اس ضمن میں دباؤ بڑھانے کے لیے کوئی قابل ذکر سرگرمی نہیں کی گئی۔ مخاصمت کے اس ماحول میں گورنر دین محمد کو استعفیٰ دینا پڑا اور ان کی جگہ میاں امین الدین کو گورنر مقرر کیا گیا۔ جنہوں نے سندھ ٹینینسی ایکٹ 1950ء میں ترامیم کے ایک نئے مسودے کی منظوری دے دی جو سابقہ گورنر کے وعدوں سے مختلف تھا۔ اس قانون میں حق مزارعت کے بجائے حق کاشت کاری کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ اس طرح حق کاشت کے ذریعے زمیندار ہاری کو ایک اچھی زمین سے بے دخل کر کے خراب

زمین پر کاشت کاری کے لیے بھیجنے کا حق دار ہوگیا۔اس طرح حق کاشت کاری ہاری کے حق کے بجائے ایک فرض کی حیثیت اختیار کر گیا۔(23)

مشرقی پاکستان کے انتخابات میں مسلم لیگ کی عبرت ناک شکست کے بعد مرکزی قیادت نے مغربی پاکستان کے صوبوں کے انضمام سے ون یونٹ قائم کرنے کے منصوبے پر تیزی سے عمل در آمد شروع کر دیا۔ جس کی صوبہ سندھ، صوبہ سرحد، مشرقی بنگال اور بلوچستان کے قوم پرست رہنماؤں اور ترقی پسند سیاسی وطبقاتی تنظیموں نے مخالفت کی۔ سندھ میں ہاری کمیٹی اس جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کر رہی تھی۔ تاہم سندھ اسمبلی کے موقع پرست زمیندار اراکین نے اپنے ابتدائی مؤقف کے برعکس 11 دسمبر 1954ء کو ون یونٹ کی اسکیم کی منظوری دے دی۔اس تائید کے حصول کے لیے مرکزی قیادت نے ایوب کھوڑو کو ذمہ داری تفویض کی تھی جنھوں نے لاقانونیت، جبر وتشدد گرفتاریوں کے ذریعے ون یونٹ کے مخالفین پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ون یونٹ کے حق میں قرارداد منظور کرالی۔ سندھ میں ون یونٹ مخالف قوتوں نے اپنی سرگرمیوں کو متحد کرنے کے لیے ایک وسیع تر محاذ تشکیل دیا۔ اس کے لیے 7 اگست 1955ء کو طلب کیے گئے اجلاس میں سندھ عوامی محاذ، سندھ ہاری کمیٹی، خاکسار تحریک، سندھ نوجوان محاذ اور سندھ اسمبلی کی حزب اختلاف کے بعض اراکین شریک ہوئے۔ اس اجلاس نے ایک رابطہ کمیٹی تشکیل دی تاکہ ملک کی دیگر ون یونٹ مخالف قوتوں کو یک جا کر کے ایک ملک گیر ون یونٹ مخالف محاذ تشکیل دیا جا سکے۔ 13 اگست 1955ء کو اس رابطہ کمیٹی کا اجلاس شیخ عبدالمجید سندھی نے طلب کیا جس کی صدارت خان عبدالغفار خان نے کی۔ اجلاس میں پیر صاحب مانکی شریف، خان عبدالصمد اچکزئی، جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی اور دیگر نے شرکت کی۔ سندھ ہاری کمیٹی ون یونٹ مخالف محاذ کی تشکیل اور ون یونٹ کے خاتمے کی جدوجہد میں انتہائی سرگرمی سے شریک رہی۔ ون یونٹ کی اسکیم پر کام شروع ہونے اور ون یونٹ نافذ ہونے کے بعد سے سندھ ہاری کمیٹی کی جدوجہد کا اولین نکتہ ون یونٹ کی مخالفت قرار پایا اور ہاری ایجنڈا پس پشت ڈال دیا گیا۔

ون یونٹ کے قیام نے سندھ کی معاشی اور سیاسی قوتوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ سندھ میں آب پاشی کی وافر سہولتیں مہیا نہ ہونے کے باعث وسیع وعریض قابل کاشت اراضی بے آباد تھی۔ سندھ کی معیشت کی ترقی کے لیے سندھ حکومت نے کوٹری اور گدو بیراج تعمیر کیے۔ یہ

تخمینہ لگایا گیا تھا کہ ان بیراجوں کی تکمیل سے ڈھائی لاکھ بے زمین ہاریوں کو قابل کاشت اراضی پر آباد کیا جا سکے گا۔ لیکن کوٹری بیراج کی تعمیر مکمل ہونے پر ون یونٹ کا نفاذ عمل میں آ گیا جس کے نتیجے میں بیراج سے سیراب ہونے والی زمینیں ون یونٹ انتظامیہ کے سپرد کر دی گئیں اور ان زمینوں کو حاضر سروس فوجی اور سول افسران اور سندھی و پنجابی زمینداروں کو الاٹ کر دیا گیا۔ سندھ کے ہاریوں کو محض وہ زمینیں دی گئیں۔ جن کے خریدار نہیں تھے۔ یہ تمام زمینیں نیلام کے ذریعے الاٹ کی گئیں اور اس طرح سندھ کی زمینوں پر زمینداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ سندھ ہاری کمیٹی نے نیلام کے ذریعے زمینوں کی الاٹمنٹ کی بھرپور مخالفت کی اور کہا کہ اس طریقہ کار کی وجہ سے غریب اور بے زمین ہاریوں کے لیے زمین خریدنا ناممکن بنا دیا گیا جب کہ سندھ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ بیراج کی زمین ہاریوں کو رعایتی نرخوں پر آسان اقساط میں فروخت کی جائیں گی۔ ہاری کمیٹی نے مطالبہ کیا کہ بیراج سے سیراب ہونے والی سرکاری زمینوں کا کم سے کم نصف حصہ ہاریوں کے لیے مختص کیا جانا چاہیے۔ (24)

غلام محمد بیراج کی تکمیل کے بعد یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ بیراج سے سیراب ہونے والے 28 لاکھ ایکڑ میں سے ایک لاکھ ایکڑ اراضی پر 15 ہزار خاندانوں کو آباد کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایک لاکھ ایکڑ اراضی بھی فوجی خاندانوں کی آبادکاری کی تنظیم کے حوالے کر دی گئی اور اس بیراج کی زمینوں پر پہلا قدم رکھنے والے فوجی افسران کے خاندان تھے۔ (25)

ون یونٹ کے قیام کے بیان کردہ مقاصد میں مغربی پاکستان کے تمام حصوں میں قانونی' عدالتی اور مالیاتی نظام کی یکسانیت پیدا کرنا' بیان کیا گیا تھا۔ تاہم حیدر بخش جتوئی کے مطابق ون یونٹ کے نفاذ کے بعد کم از کم سندھ کے لیے یکسانیت کا مقصد نظر انداز کر دیا گیا۔ سندھ میں اسکولوں کے اساتذہ پنجاب کی نسبت انتہائی کم تنخواہ حاصل کر رہے تھے لیکن ان کے پرزور احتجاج کے باوجود ان کی تنخواہ یکساں نہیں کی گئیں۔ اسی طرح سندھ میں اراضی پر ٹیکسوں کی شرح پنجاب کی نسبت کافی زیادہ تھی۔ جو بعض اوقات کل زرعی آمدنی کا 50 سے 60 فیصد تک جا پہنچتی تھی۔ ریونیو بورڈ کے اختیارات کا مرکز لاہور میں واقع تھا۔ اس لیے سندھ کے کاشتکاروں کی صدائے احتجاج وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بے اثر ہو جاتی تھی۔ سندھ کے وہ ہاری جنہیں متروکہ اراضی الاٹ کی گئی تھی کو زمین سے بے دخل کر دیا گیا اور وہ زمین مہاجرین کو الاٹ کر دی گئی۔ آل پاکستان

مہاجر بورڈ نے ہاریوں کی بے دخلی کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا کہ متروکہ زرعی اراضی پر مقامی لوگوں نے غیر قانونی قبضے کیے تھے جن کو بے دخل کرنا ضروری ہے۔ (26)

اسی طرح سندھ میں ڈھل کی شرح کپاس پر 35 روپے اور گندم پر 25 روپے تھی جب کہ پنجاب میں بہتر اور زرخیز زمین ہونے کے باوجود یہ شرح بالترتیب صرف 18 روپے اور 15 روپے تھی۔ جسے بھرپور مطالبات کے باوجود یکساں نہیں کیا گیا۔ ون یونٹ کے نفاذ پر سندھی عوام کی اہم شکایات میں سندھی زبان کی سرکاری حیثیت کا خاتمہ، غیر سندھیوں کی آمد سے آبادی کی ترکیب میں تبدیلی، سندھ کی زمینوں پر پنجابیوں اور پٹھانوں کا قبضہ اور ملازمتوں میں سندھیوں کو یکسر نظر انداز کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم سندھ کے زرعی ڈھانچے کو سب سے زیادہ پنجابیوں کی آبادکاری نے متاثر کیا۔ بیراجوں کی زمینیں نیلامی کے ذریعے زیادہ تر پنجابیوں نے حاصل کیں بلکہ زیادہ قیمت کے حصول کے لیے بعض سندھی زمینداروں نے بھی اپنی زمینیں پنجابیوں کو فروخت کر دیں۔ نئے آبادکاروں نے ان زمینوں پر کاشت کرنے والے زیادہ تر ہاریوں کو بے دخل کیا اور ان کی جگہ پنجاب سے کسانوں کو لا کر آباد کیا گیا۔ ون یونٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہاریوں کو الاٹ شدہ متروکہ زرعی اراضی منسوخ کر کے مہاجرین کو ان کے کلیم کے عوض دے دی گئی۔ اس صورت حال کے خلاف نیشنل عوامی پارٹی نے لاڑھی، نواب شاہ میں ایک بڑا احتجاجی جلسہ جنوری 1958ء میں منعقد کیا۔ جس کی صدارت مولانا بھاشانی نے کی۔ اس جلسہ کے بعد ہاری کارکنوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی جس سے ہاریوں کو متحرک کرنے میں بڑی مدد ملی۔ محراب پور سے ہاریوں نے سندھ ہاری کمیٹی کے زیر اہتمام سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ جس میں سیکڑوں ہاریوں نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاری دی۔ الاٹی ہاری تحریک میں دیگر اضلاع کے ہاری بھی فعال ہونا شروع ہو گئے۔ سندھ نیشنل عوامی پارٹی اور سندھ ہاری کمیٹی نے مشترکہ طور پر 21 فروری 1958ء کو کراچی میں ایک بڑی احتجاجی ریلی کا اہتمام کیا۔ جس میں ہزاروں ہاری، طالب علم، مزدور اور ترقی پسند سیاسی کارکن شریک ہوئے۔ ریلی کے اختتام پر ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت شیخ عبدالمجید سندھی نے کی۔ جی ایم سید، محمود الحق عثمانی، کامریڈ عبدالقادر، سوبھو گیان چندانی، عزیز اللہ، کامریڈ غلام محمد لغاری نے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے ون یونٹ کی ناانصافیوں اور الاٹی ہاریوں کی بے دخلی پر بھرپور احتجاج کیا۔ اس سرگرمی کے نتیجے میں

صدر اسکندر مرزا نے شیخ عبدالمجید سندھی، محمود الحق عثمانی، کامریڈ عبدالقادر اور قاضی فیض محمد پر مشتمل وفد سے ملاقات کی اور انہیں ہاریوں کے مسائل پر ہمدردانہ غور کرنے کی یقین دہانی کرائی اور انہیں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کے لیے کہا۔ لیکن قاضی فیض محمد کے مطابق وفد کو الوداع کہتے ہوئے اسکندر مرزا نے ان سے کہا۔ ''قاضی صاحب جلسہ جلوس اور نعرہ بازی سے کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک خون دیا اور لیا نہیں جائے گا کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ جایئے اور قربانیاں دیجیے میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' (27)

اسکندر مرزا کی مذکورہ ''انقلابی'' ہدایت کی اصلیت 7 اکتوبر 1958ء کے اعلامیے سے سامنے آگئی جب انہوں نے ون یونٹ مخالف سرگرمیوں، سول نافرمانی اور نجی رضا کارانہ تنظیموں کے قیام کو مارشل لاء کے نفاذ کے اسباب کے طور پر بیان کیا۔ 8 اکتوبر کی رات کو فوجی انقلاب برپا ہوا اور کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سیکڑوں ہاری رہنما، کارکن بھی گرفتار کر لیے گئے۔ مارشل لاء کے دور میں سندھ ہاری کمیٹی کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ مارشل لاء کے خاتمے کے بعد سندھ ہاری کمیٹی ہاریوں کے مسائل پر کوئی مؤثر سرگرمی اور فعالیت کا مظاہرہ نہیں کرسکی البتہ جمہوریت کی بحالی کے لیے بننے والے اتحادوں اور محاذوں میں شریک رہی۔ ایوب خان کے دور حکومت میں پہلی بار زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اگرچہ یہ اصلاحات زرعی نظام میں بنیادی تبدیلی تو نہ لاسکیں البتہ ان کے ذریعے بڑے زمینداروں کی سیاسی اور سماجی قوت کو کسی حد تک کمزور ضرور کیا گیا۔ تمام جاگیریں بلا معاوضہ منسوخ کردی گئیں۔ 500 ایکڑ نہری اور 1000 ایکڑ بارانی زمین کی فی فرد حد ملکیت مقرر کی گئی۔ خاندان کے اندر اراضی کی منتقلی کی اجازت دی گئی۔ جس کے باعث بڑے زمینداروں کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ برقرار رکھنا ممکن ہوسکا۔ حد ملکیت سے زیادہ زمین حکومت معاوضتاً کو دے دی جائے گی۔ اس طرح سندھ کے زمینداروں نے ایک لاکھ 62 ہزار ایکڑ بے آباد زمین حکومت کو مہنگے داموں فروخت کردی۔ ان زرعی اصلاحات سے پانچ لاکھ ایکڑ زمین زمینداروں سے حاصل کی گئی۔ جس میں سے 2 لاکھ ایکڑ ہاریوں کو، ڈیڑھ لاکھ ایکڑ چھوٹے کاشتکاروں کو دی گئی۔ زرعی اصلاحات میں ہاریوں کو مستقل حقوق نہیں دیے گئے اور نہ ہی 1950ء کے قانون حقوق مزارعت کے نفاذ کو اصلاحات کا حصہ بنایا گیا تھا۔

ایوب دور حکومت میں 1962ء میں گدو بیراج کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس بیراج سے سیراب ہونے والی 7 لاکھ 23 ہزار ایکٹر زمین میں سے دو لاکھ ایکٹر ہاریوں کے لیے مختص کی گئی تھی لیکن عملاً یہ زمین غیر سندھی کو دی گئی۔ اس بیراج کی زمین میں سے ایک لاکھ 44 ہزار ایکٹر بذریعہ نیلام فروخت کر دی گئی۔ مزید برآں سول افسروں حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی افسروں تربیلا اور منگلا ڈیم کے متاثرین، گودھرا اور کشمیر کے مہاجرین، اسلام آباد کے دارالحکومت کی تعمیر کے متاثرین، ایوارڈ یافتگان، کھلاڑیوں وغیرہ کو فراخ دلی سے یہ زمین الاٹ کی گئی۔ (28)

ایوب حکومت کی طرز حکمرانی، زرعی، صنعتی، تعلیمی اور خارجہ پالیسیوں سے ملک کے تقریباً تمام حلقے اور طبقے متاثر ہوئے تھے۔ جن کی ناراضگی کا اظہار ایوب خان کے خلاف بھرپور احتجاج کی شکل میں سامنے آیا۔ جس میں بنگال سندھ، سرحد اور بلوچستان کے قوم پرست، جاگیردار، زمیندار، دیہی و شہری متوسط طبقہ، طالب علم، مزدور اور کسان سبھی شامل تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایوب خان کو مستعفی ہونا پڑا اور جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس تحریک میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے فعال کردار ادا کیا اور اس کے ترقی پسند نعروں کی وجہ سے سندھ کی قوم پرست اور ترقی پسند سیاسی اور طبقاتی تنظیموں کے کارکنوں کی بڑی تعداد بھٹو کی پارٹی میں شامل ہوگئی۔ اس کا اثر سندھ ہاری کمیٹی پر بھی پڑا اور اس کے فعال کارکنوں کی ایک بڑی تعداد پیپلز پارٹی میں سرگرم ہوگئی۔ حیدر بخش جتوئی جو ایک روشن خیال، محنت کش طبقوں کے حامی قوم پرست شخصیت تھے۔ 1970ء میں انتقال کر گئے۔ اس طرح سندھ ہاری کمیٹی میں کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کے مابین پل کا فریضہ انجام دینے والی شخصیت کے انتقال سے باقی ماندہ ہاری کمیٹی دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ سندھ کے کمیونسٹ، ایوب خان اور بعد ازاں یحییٰ خان کے مارشل لاء کی مخالفت میں سرگرم کردار انجام دینے کے باعث ایک قابل ذکر طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے تھے۔ ان کی سرگرمیوں اور جدوجہد کا بنیادی محور ون یونٹ کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی تھی۔ ایوب حکومت کے خاتمے، ون یونٹ کی تنسیخ اور جنرل یحییٰ خان کی طرف سے جمہوریت کی بحالی کے لیے ایک فرد ایک ووٹ کی بنیاد پر انتخابات کے اعلان کے بعد عملی طور پر سندھ کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کے ایجنڈے کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اس جدوجہد کے دوران انہوں نے سندھ کی محنت کش اور غریب عوام کی سماجی و معاشی ترقی کے مطالبات کو یکسر پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس

صورت حال کا فائدہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اٹھایا جس نے اس خلاء کو پر کرتے ہوئے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ چنانچہ سندھ ہاری کمیٹی نے ہاریوں کو طبقاتی مطالبات پر از سر نو منظم اور متحرک کرنے کے لیے مئی 1970ء میں ہاری کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا لیکن 21 مئی کو جناب حیدر بخش جتوئی کے انتقال کے باعث یہ کانفرنس ملتوی کردی گئی۔(29)

ہاری کمیٹی کے غیر متنازعہ رہنما حیدر بخش جتوئی کے بعد سندھ ہاری کمیٹی میں قاضی فیض محمد اور قوم پرستانہ نکتہ نظر کے حامل ہاری رہنماؤں کو بالادستی حاصل ہوگئی۔ کمیونسٹوں نے نئے حالات کے پیش نظر عوامی طبقاتی ایجنڈا پر کام کرنے کے لیے طلبہ مزدور کسان عوامی رابطہ کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ طالب علم رہنما جام ساقی کو ہاری کمیٹی کے رہنما اور حیدر بخش جتوئی کے متبادل کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس لیے سندھ ہاری ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے 22 جون کو سکرنڈ' نواب شاہ میں ہاری کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانفرنس میں سندھ بھر سے ہاری کارکنوں کے ساتھ ساتھ طلبہ' مزدور' خواتین' ادیب اور نیشنل عوامی پارٹی کے ترقی پسند کارکن شریک ہوئے۔ اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب کانفرنس تھی۔ لیکن ہاری کمیٹی کے جنرل سیکریٹری غلام حسین سومرو اور سندھ کے قوم پرست رہنماؤں بشمول جی ایم سید نے اس کانفرنس کی شدید مخالفت کی۔ جی ایم سید نے اس کانفرنس سے قوم پرست سیاسی کارکنوں کو الگ رکھنے کے لیے اسی روز سکرنڈ کے نزدیک مورو میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ قوم پرست دانشوروں نے اس کانفرنس کو کراچی میں بیٹھے کمیونسٹ دانشوروں جنہیں ہاری مسائل کا قطعی علم نہیں تھا کی سیاسی سرگرمی قرار دیا۔(30)

سندھ ہاری کمیٹی کے جنرل سیکریٹری غلام حسین سومرو نے رابطہ کمیٹی پر سندھ ہاری کمیٹی کو نظر انداز کر کے ہاری کانفرنس کا انعقاد کرنے پر کڑی نکتہ چینی کی اور رابطہ کمیٹی سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کیا۔ کانفرنس کے دوران غلام حسین سومرو نے تنظیمی کمیٹی بنانے اور جام ساقی کو اس کا سیکریٹری جنرل بنانے کی تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ جام ساقی تو ہاری کمیٹی کے رکن بھی نہیں ہیں اس پر کانفرنس میں شدید ہنگامہ ہوا جسے ختم کرنے کے لیے سندھ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر غلام محمد لغاری نے مداخلت کی اور ان کی تجویز پر غلام حسین سومرو' سید رشید احمد' جام ساقی' برکت علی آزاد اور غلام محمد لغاری پر مشتمل ایکشن کمیٹی بنانے کا اعلان کیا گیا۔(31)

تاہم بعدازاں رابطہ کمیٹی کے پریس ریلیز میں اس فیصلے کے برعکس جام ساقی کو سندھ ہاری کمیٹی کا جنرل سیکریٹری منتخب ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کانفرنس میں ہاریوں کے مطالبات کے ساتھ ساتھ ون یونٹ کے خاتمے، صوبائی خودمختاری، سندھی کو قومی زبان تسلیم کرنے، سندھ رجمنٹ کے قیام، سیاسی اور معاشی صورت حال، مزدوروں کے مسائل، لیگل فریم ورک آرڈر اور خارجہ پالیسی سے متعلق متعدد قراردادیں منظور کی گئیں۔ سکرنڈ کانفرنس جناب حیدر بخش جتوئی کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا پر نہ کرسکی بلکہ یہ سندھ ہاری کمیٹی کی تقسیم اور نتیجتاً اس کے غیر فعال ہونے کا باعث بنی۔ اس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ ایاز نے کہا کہ "کانفرنس میں کوئی بینر سندھی میں نہیں تھا۔ تقاریر اردو میں کی گئیں ہاری جیئے سندھ کے نعرے لگا رہے تھے جب کہ جیئے سندھ کا کوئی بینر ہال میں موجود نہیں تھا۔ جس سے ثقافتی فسطائیت کا اظہار ہوتا ہے۔"(32)

سکرنڈ ہاری کانفرنس کے بعد سندھ ہاری کمیٹی عملاً کئی دھڑوں میں منقسم ہوگئی جن کی سربراہی مختلف ترقی پسند اور قوم پرست سیاسی گروہ کرتے تھے۔ اس تقسیم در تقسیم سے سندھ کے ہاریوں کو منظم اور متحرک کرنے کا عمل ختم ہوگیا اور وہ بدستور وڈیروں اور حکمرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیے گئے۔

سندھ ہاری کمیٹی کی سرگرمیوں کا مذکورہ بالا جائزہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ یہ کمیٹی اپنے قیام سے لے کر انجام تک بیرونی عنصر کی مرہون منت رہی۔ اس کا آغاز روشن خیال کانگرس نواز سندھی دانشوروں نے کیا جب کہ سندھ کے دو کلکٹروں ایم مسعود اور تھام کنسن اور ڈپٹی کلکٹر حیدر بخش جتوئی کی حمایت سے یہ تحریک آگے بڑھی۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ مخالف اور ترقی پسند عناصر خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی اور کمیونسٹوں کی مدد سے ہاری کمیٹی فعال کردار انجام دے سکی۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد اس کی سرگرمی کا محور ہاری مسائل سے ہٹ کر سیاسی رخ اختیار کر گیا اور یہ صوبائی خودمختاری اور سندھ کی قوم پرست جدوجہد کا حصہ بن گئی۔ ایوب حکومت کے دور میں یہ سیاسی محاذوں میں انتہائی سرگرمی سے ملوث رہی اور بتدریج اس کا ہاریوں سے رابطہ کمزور پڑتا چلا گیا اور عملاً ایک سیاسی گروہ کی حیثیت اختیار کرگئی۔ ہاریوں کے طبقاتی مسائل پر اس کی سرگرمی تنظیم کے سربراہ کے اخباری بیانات اور پمفلٹوں کی حد تک محدود ہو کر رہ گئے۔ جناب حیدر بخش جتوئی کی وفات کے بعد سکرنڈ ہاری کانفرنس اس تنظیم کی تقسیم اور اس کی غیر فعال اور غیر مؤثر

ہونے کا باعث بنی اور اس کے فعال اور مخلص کارکن مختلف ترقی پسند اور قوم پرست تنظیموں میں شامل ہوگئے۔

## حوالہ جات


1. Ansar Zahid, History and Culture of Sind, (Karachi Royal Book Co., 1976) p.211
2. R.F. Burton, Sind and the Races that Inhibited the Valley of Indus, (Karachi Oxford University Press, 1973) p.197.
3. M. Jason, The Talpurs of Sind, The Indian Historical Quarterly, Volume 17, No.10, 1941.
4. Habib Ahmed Siddiqi, Education In Sind, Past and Present, (Jamshoro Institute of Sindhiology, 1987), p.143
5. E.H. Aiteken, Gazetteer of the Province of Sind, (Karachi 1907), p.415
6. Waheed-uz-Zaman, Towards Pakistan, (Lahore 1964), p.300
7. Hyder Baksh Jatoi, Hari Inqilab, (Hyderabad, 1951), p.57
8. M. Masood, Hari Committee Report, Note of Dissent, (Karachi Ansari Publishing House, 1949), pp 2-4
9. Kazi Faiz Mohammad, Allottee Hari Tehrik, (Hyderabad Sindhi Sahatgar, 1978), p.35
10. Sajan Bhutto, Sind Ka Hari Nizam aur Hari Jadojehad, (Karachi Research Forum) Volume 9, December 1989, p.14
11. Hyder Baksh Jatoi, Hari Inqilab, opcit, p. 52
12. Ibid, p. 62
13. M. Masood, Hari Committee Report, Note of Dissent, opcit, pp. 9-10
14. Pakistan Muslim League, Report of Agrarian Committee, (Karachi, Pakistan Muslim League, 1949), p. 6
15. Dawn, 01 February, 1949,
16. Ibid, 14 March, 1952,

17. The Herald (published in place of Dawn), Karachi, 01 April, 1950
18. Ghulam Hussain Soomro, Baba-e-Sindh Ji Sindh Lae Jadojehad, (Hyderabad 1973), pp. 21-22 and Dawn, 03 April, 1950
19. Sindh Assembly Debates, No.4, 03 April, 1950, pp. 27-32
20. Hyder Baksh Jatoi, Injustice to Sindh - II, (Hyderabad, Hari Publications, 1968) p..14
21. Dawn Karachi, 22 January, 1949
22. Dawn Karachi, 18 October, 1952
23. Dawn Karachi, 28 January, 1953
24. G.M. Sayyed, Chond Siasi Mazmoon Ain Taqreeroon, (Karachi Naeen Sindh Publications, 1975) p.132
25. Dawn Karachi, 05 January, 1956
26. Hyder Baksh Jatoi, One Unit and Democracy, (Karachi, Hari Publications, 1962), p. 6
27. Kazi Faiz Mohammad, Hari Committee Ain Allottee Tehrik, (Hyderabad, Sindh Sahatghar, 1984) pp. 61-78
28. Hyder Baksh Jatoi, Disposal of Guddu Barrage Lands, (Hyderabad, 1967) p.4 and Dr. Khalil Kazi, Hehra Haja Thian, (Hyderabad Awami Kitab Ghar, n.d.) p.24
29. Jam Saqi, Sakrand Hari Conference Main Bahal Kail Thahra, (Hyderabad, 1971), p. 3.
30. Interview of Author with Rasool Baksh Paleejo at Hyderabad in March 1996.
31. Dawn Karachi, 25 June 1970
32. Lail-o-Nehar, Weekly, Karachi (ed) Syed Sibte Hasan, 7-13 December 1970

# مزدور کسان پارٹی اور ہشت نگر تحریک

## اشفاق سلیم مرزا

مزدور کسان پارٹی نے اس زمانے میں جنم لیا جب ویت نام کی جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملک نو آبادیاتی نظام سے آزاد ہو رہے تھے۔ یہ سامراج کی پسپائی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں نوجوان انقلابی جوش و جذبے سے سرشار تھے۔ انہیں اکتوبر انقلاب، چین کی لانگ مارچ اور ویت نامیوں کی غیر متزلزل جدوجہد میں سامراج کے خلاف متحد ہونے کا ایک مضبوط حوالہ مل گیا تھا۔ ان کے روز و شب اور ان کی ہر حرکت انہی حوالوں کے سحر کی اسیر ہو ئیاں کا رومان، محبت اور شب بیداری اسی کے گرد مرتکز ہو کر رہ گئے۔ میں ایسے مناظر کا چشم دید گواہ ہوں۔ لوگوں نے اپنے گھر بار، آرام اور محبتیں تک اس راہ میں قربان کر دیں۔ کچھ تو ایسے سفر پر نکلے کہ پھر نہ لوٹے، کچھ ہمیشہ کے لیے کہیں کھو گئے اور کچھ مایوسیاں اپنے دامن میں سمیٹے دماغی توازن کھو بیٹھے۔ یہ دبستان ایسے گمنام سپاہیوں سے اٹا پڑا ہے لیکن یہ سب کچھ کار فضول نہ تھا۔ اس سارے عمل میں وہ انقلاب کی سفاکی اور تحریک کی روحانیت سے ہم کنار ہو رہے تھے۔ جیسا کہ ماؤ نے کہا تھا:

> ''انقلاب کوئی دعوت طعام نہیں، نہ ہی یہ مضمون نویسی، مصوری یا کشیدہ کاری ہے۔ یہ اتنا مہذب، اتنا با آرام، نرم خو، معتدل، رحم دل، شائستہ، با ضبط یا فیاض نہیں ہو سکتا۔ انقلاب ایک بغاوت ہے، ایک تشدد کا عمل ہے۔ جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔''

اس سارے عمل میں کئی مقامات تو ایسے آئے کہ شوریدگی نے معروضی حالات کی طرف سے آنکھ بالکل بند کر دی اور دنیا کے بیشتر ممالک میں انقلابی تحریکات ماسکو اور بیجنگ میں بیٹھے ہوئے

سرکاری پنڈتوں کے فرامین کی نذر ہوگئیں۔ تیسری دنیا کے رہنما اپنے معروضی حالات سے بے خبر، بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کے پیچھے چلتے رہے۔

پاکستان میں بھی بائیں بازو کی تحریک انہی حالات کے تحت انتشار کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے مختلف ٹکڑے ہوئے تھے کہ جو بظاہر ایک بڑی جماعت نیشنل عوامی پارٹی NAP میں نظریاتی دڑاڑیں پڑنے کی وجہ سے وجود میں آئے تھے۔

جھگڑا تو چین اور سوویت یونین کے درمیان تھا لیکن اس کا اثر تمام دنیا کی انقلابی تحریکوں پر پڑا۔ چین اور سوویت یونین کی گروہ بندی کا آغاز ۱۹۶۴ء میں ہی ہو چکا تھا اور ۱۹۶۵ء میں یہ اختلاف کھل کر سامنے آ گئے۔

۱۹۶۷ء کے اواخر میں مشرقی پاکستان نیپ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ بھاشانی نیپ کا ساتھ دینے والے بعد ازاں چین نواز کہلائے۔ جنہوں نے کچھ عرصہ بعد مزدور کسان پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کا روپ دھارا۔ یہ گروہ بندی دراصل زیر زمین کمیونسٹ پارٹیوں کے مابین تھی جو عوامی سطح پر باعمل اور کھلی جماعتوں کے روپ میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کے پیچھے ان جماعتوں کے مضبوط نظریہ دان مظفر احمد، نازش امروہوی، ایرک سپرین اور سی آر اسلم اپنی اپنی جماعت کی قیادت کر رہے تھے۔

پردے کے پیچھے جو سرگرمیاں جاری تھیں وہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو مغربی پاکستان میں کھل کر سامنے آ گئیں۔ اس سے قبل مولانا بھاشانی نے ان دھڑوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بہت کاوشیں کیں تھیں۔ کئی سفارتیں بھی بھیجی گئیں۔ مجھے یاد ہے اس سلسلے میں مشرقی پاکستان سے ہفتہ وار رسالے ''ہالیڈے'' کے ایڈیٹر انور زاہد نے بھی مغربی پاکستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میو ہسپتال کے قریب مائی لاڈو کی مسجد کے ساتھ غازی عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ کی حویلی میں ایک اجلاس ہوا۔ حویلی کے اندر تو اس دھڑے کا اجلاس ہوا جو بعد ازاں مزدور کسان پارٹی کہلایا اور باہر دوسرے دھڑے کا اجلاس ہوا جو نیشنل عوامی پارٹی ماسکو نواز کہلایا۔ اس سے پہلے والی رات بہت اہم تھی۔ غلام نبی کلو مرحوم، محمد اکرام مرحوم اور راقم محمود علی قصوری صاحب کے گھر یہ پتہ کرنے گئے کہ اجلاس مشترکہ ہوگا یا الگ الگ ہوگا۔ اس کے جواب میں صبح الگ الگ اجلاس ہوئے۔ محترم شمیم اشرف ملک مرحوم اور پروفیسر امین مغل

صاحب نے ہمیں آ کر بتایا کہ اجلاس اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ ہم نے یہ بات آ کر میجر اسحاق صاحب کو بتا دی۔

اس اجلاس کے بعد پنجاب اور کراچی کی پارٹی نے خود کو نیپ مزدور کسان کہنا شروع کر دیا جب کہ مزدور کسان کی سرحد شاخ نے نیپ کا نام استعمال نہیں کیا بلکہ یکم مئی ۱۹۶۸ء کو ایک نئی جماعت مزدور کسان پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کا جھنڈا بھی علیحدہ بنایا گیا جو سرخ رنگ کا تھا اور بیچ میں پانچ کونوں والا ایک ستارہ تھا۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ پہلے پنجاب کے ساتھیوں کا ایک طویل اجلاس چوہدری حفیظ مرحوم کے زرعی فارم گوجرانوالہ میں ہو چکا تھا۔ اس میں پنجاب کے اہم نمائندہ اراکین نے شمولیت کی تھی۔ اس اجلاس میں میجر اسحاق کے علاوہ سید سبط الحسن ضیغم، غلام نبی کلو، محمد اکرام، دوست محمد بھچر، لطیف چودھری، رفیق چودھری، چودھری شریف، نامور صحافی الیاس صاحب، یٰسین صاحب اور راولپنڈی سے دیگر دوست شامل تھے جن میں بہت سے اہم امور کے علاوہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل بھی طے کیا گیا۔

اس کے بعد کونسل کا ایک اہم اجلاس ملتان میں بھی بلایا گیا۔ اس اجلاس میں جنوبی پنجاب سے لاتعداد مندوبین نے بھی شرکت کی۔ بعد ازاں کبیر والا، خانیوال، چیچہ وطنی، بہاول نگر، لودھراں، رحیم یار خان، ڈی جی خاں اور بہاولپور میں بھی مزدور کسان پارٹی شاخیں کھولی گئیں۔ ۱۶ مئی ۱۹۷۰ء کو گوجرانوالہ کے اجلاس میں پارٹی منشور کے خدوخال وضع کیے گئے جس کو پارٹی کے صدر نے بعد ازاں تحریری شکل دی۔ اس کے بنیادی نقاط کا خلاصہ کچھ یوں تھا:

## منشور

مزدور کسان پارٹی پاکستان کو برسر اقتدار جماعتوں کے حوالے سے ''نیم نج'' کا قلعہ سمجھتی تھی۔ یہ اصطلاح میجر اسحاق محمد صاحب نے وضع کی تھی۔ اس کی وضاحت پارٹی کے منشور میں کچھ اس طرح کی گئی تھی۔

نیم نج = نیم + ن (نو آبادیاتی + ج (جاگیردارانہ)

نیم نو آبادیاتی، نیم جاگیردارانہ نظام کی آمریت۔ اقتدار اور دبدبہ پر مبنی اس نظام کی سیاست، معیشت اور ثقافت پر جن طبقوں اور عناصر (سامراجی گماشتے، سرمایہ دار، جاگیردار) کا قبضہ ہے یہ

نظام انہی کے گٹھ جوڑ اور ملی بھگت کا مظہر ہے۔

مزدور کسان پارٹی، بین الاقوامی سطح پر سامراج اور سوشلزم کو بنیادی تضاد سمجھتی تھی۔ مغربی ممالک کے ساتھ امریکہ کو سامراجیوں کا سرغنہ اور دنیا بھر کے عوام خاص کر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کا خونخوار ترین دشمن سمجھتی تھی۔

مزدور کسان پارٹی کے نزدیک بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے ممالک سامراجی طاقتوں کے شکنجے میں نیم محکومی کی حالت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو سامراجی پیداوار کی براہ راست منڈیاں ہیں اور حکومت کی باگ ڈور سامراجی پٹھوؤں کے ہاتھوں میں ہے۔ ممالک جن میں پاکستان بھی شامل تھا نے سامرجیوں کے ساتھ فوجی اور اقتصادی معاہدے کر لیے ہیں۔ اس لیے یہ ممالک نیم نوآبادیاتی نظام میں نیم محکوم حالت میں جکڑے رہے۔

مزدور کسان پارٹی روسی ترمیم پسندوں کو مغربی سامراج کا آلہ کار سمجھتی تھی اور ان کے نزدیک روس کی کمیونسٹ پارٹی انقلاب کی امین نہیں۔

مزدور کسان پارٹی کے نزدیک تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً پاکستان کے لیے انقلاب کی راہ مسلح جدوجہد تھی اور چینی انقلاب مشعل راہ۔ پارلیمانی جمہوریت کی راہ پاکستان جیسے ممالک کے لیے غیر موزوں قرار پائی۔

## پارٹی کی نوعیت

منشور میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ مزدور کسان پارٹی پاکستان کے صنعتی مزدوروں، کھیت مزدوروں، گھریلو ملازموں، قلیوں، ڈرائیوروں، چرواہوں، لکڑہاروں، کمیوں، غریب کسانوں، دستکاروں، درمیانہ درجہ کے کسانوں، شہر میں بسنے والے غریبوں، چھوٹے دکانداروں، چھوٹے درجہ ملازموں، استادوں، پروفیسروں اور درمیانہ طبقے کے دوسرے محب وطن افراد، انقلابی دانشوروں اور انقلابی نوجوانوں کی پارٹی ہے۔ یہ پارٹی ملک کی ۹۰ فی صد آبادی کو منظم کر رہی ہے تاکہ ملک میں عوامی جمہوریت کا نظام قائم کیا جائے۔ اس عوامی جمہوری نظام کو ملا کر بالآخر سوشلزم کا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔

## رہنما اصول

منشور اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس پارٹی کے پاس ایک فوری اور مستقبل کا پروگرام ہے یعنی موجودہ دور کے لیے عوامی جمہوریت اور مستقبل کے لیے سوشلزم۔ یہ ایک نامیاتی کل کے دو جزو ہیں جن کی رہنمائی سوشلزم کا جامع نظریاتی نظام کرتا ہے۔ یہ پرولتاری نظریئے کا مکمل نظام ہے اور ساتھ ہی ایک نیا معاشرتی نظام بھی ہے جو بنی نوع انسان کی تاریخ میں انتہائی مکمل، ترقی پسند انقلابی اور معقول نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ جاگیرداری کا نظریاتی اور معاشرتی نظام صرف عجائب گھر کی زینت بن گیا ہے۔ ساتھ ساتھ سرمایہ داری کا نظریاتی اور معاشی نظام بھی دنیا کے ایک بڑے حصے میں معدوم ہو رہا ہے۔ پاکستان میں سائنسی سوشلزم کی ترویج نے عوام کے لیے فکر کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور قومی جمہوری انقلاب کی شکل بھی بدل دی ہے۔ جس وجہ سے پرولتاری نظریئے کی رہنمائی کے بغیر پاکستان کے جمہوری انقلاب کی کامیابی قطعی ممکن نہیں ہے۔ چہ وہ انقلاب کے دوسرے مرحلے سوشلزم تک پہنچ سکے۔

## انقلاب کی قوت

منشور میں کہا گیا کہ پرولتاری نظریئے سے لیس مزدور کسان پارٹی اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے کسانوں کی عظیم قوت پر انحصار کرتی ہے۔ پاکستان کا انقلاب دراصل کسان انقلاب ہے۔ عوامی جمہوریت کی سیاست کا مطلب درحقیقت کسانوں کو اختیار دینا ہے۔ عوامی ثقافت کا مطلب درحقیقت کسانوں کے ثقافتی معیار کو بلند کرنا ہے۔ پاکستان کی اسی (۸۰) فی صد آبادی کسانوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا کسانوں کا مسئلہ عوامی جمہوری انقلاب کا بنیادی مسئلہ بن گیا ہے اور کسانوں کی قوت اس انقلاب کی بنیادی قوت ہے۔ پاکستان کی آبادی میں کسانوں کے بعد مزدور دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ جدید صنعتی مزدور طبقے کے بغیر انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ پاکستان کے انقلاب کا رہنما اور انتہائی انقلابی طبقہ ہے۔

## بورژوا سیاست

مزدور کسان پارٹی کا منشور اس وقت کے مروجہ سیاسی نظاموں کو یک قلم مسترد کرتا ہوا بورژروا

پارلیمانی جمہوریت کو بھی رد کرتا ہے۔کیوں کہ ایسے تمام نظام ہائے سیاست پر سرمایہ داروں، جاگیرداروں یا ان کے نمائندوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ان کی معیشتیں عالمی سامراجی منڈی کے تابع ہیں۔دوسرا یہ کہ منشور اسلامی جمہوریت کے لیے کسی گنجائش کا قائل نہیں ہے۔اسلامی سوشلزم الفاظ کے گورکھ دھندے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔اس منشور کے نزدیک یہ سب بوژروا آمریت کے مختلف روپ ہیں۔ایسا مختلف ممالک کی مثالوں سے سے واضح کیا گیا ہے۔ناصر اور سوئیکارنو کی مختلف ناکامیوں کی وجہ ان کا دائیں بائیں دونوں طرف دیکھنا تھالیکن ان تمام ناکامیوں کے بعد بھی منشور یہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری بلاشبہ دم توڑ رہی ہے اور سوشلزم کی نشو ونما ہو رہی ہے اور سوشلزم آگے بڑھ رہا ہے۔

## عوامی جمہوریت

مزدور کسان پارٹی چاہتی ہے کہ عوامی جمہوریت کے جھنڈے تلے پاکستان ایک جمہوری ری پبلک بنے جس کا ڈھانچہ پرولتاریہ، کسان، دانشور اور ادنیٰ بوژروا طبقے کے لوگ بنائیں گے جس کی رہنما قوت پرولتاریہ ہوگی یہ طبقات سامراج دشمن، گماشتہ سرمایہ دار دشمن اور جاگیردار دشمن ہوں گے اور عوام کی مشترکہ آمریت کے تحت حکومت کریں گے۔

اس عوامی جمہوری نظام میں بلالحاظ صنف، عقیدہ، جائیداد اور تعلیم وغیرہ ہمہ گیر اور مساوی حق رائے دہی کا نظام قائم کیا جائے گا۔

اس میں بڑے بنک، بڑے صنعتی ادارے (ملکی اور غیر ملکی) ری پبلک کی ملکیت ہوں گے۔ہر وہ ادارہ جو نوعیت کے لحاظ سے جاگیردارانہ ہو یا نجی انتظامیہ کے حوالے سے بہت بڑا ہو، اسے حکومت ہی چلائے گی۔پرولتاریہ کی قیادت میں نئی جمہوری ری پبلک کی معیشت سوشلسٹ نوعیت کی ہوگی اور وہ پوری قومی معیشت میں قیادتی قوت کی تشکیل کرے گی۔یہ نظام سرمایہ دارانہ پیدا وار کی ایسی نشو ونما کو ممنوع قرار نہیں دے گا جو عوام کی معاش پر مسلط نہیں ہوتی۔بڑی نجی زمین داریاں ختم کرنے کے بعد زمینیں ان کسانوں میں تقسیم کی جائیں گی جن کے پاس زمین نہیں ہے یا کم زمین ہے۔دیہاتی علاقوں میں جاگیردارانہ تعلقات کو ختم کرنے کے بعد زمین کو کسانوں کی نجی ملکیت میں دے گی۔اس مرحلے پر عموماً سوشلسٹ زراعت قائم نہیں کی جائے گی۔لیکن مختلف قسم

کی امداد باہمی کی معیشت قائم کی جائے گی جس میں سوشلسٹ عناصر ہی شامل ہوں گے۔ پاکستانی معیشت کو سرمائے پر پابندی لگانے اور زمین کی مساوی ملکیت کی راہ اختیار کرنی چاہیے اور یہ کبھی بھی چند افراد کی نجی ملکیت نہیں ہونی چاہیے۔ پاکستان میں یورپی امریکی سرمایہ دارانہ معاشرہ ہرگز قائم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی پرانے جاگیردارانہ معاشرے کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ جو ایسی جرأت کرے گا کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ یہ ہے عوامی جمہوریت کی معیشت، سیاست کے خدوخال کہ جس میں عوامی جمہوریت کی معیشت کا مجتمع اظہار ہے۔ جہاں تک نئی ثقافت کا تعلق ہے۔ (الف) یہ نظریاتی ہیت کے لحاظ سے نئی سیاست و نئی معیشت کی عکاسی کرتی ہے اور ان کی خدمت انجام دیتی ہے۔ نئی سیاسی، نئی معاشی اور نئی ثقافتی قوتیں سب پاکستان کی انقلابی قوتیں ہیں جو پرانی ثقافت کی مخالف تھیں۔ نئی ثقافت سامراجی غلبے کی مخالفت کرتی ہے اور پاکستانی قوم کے وقار اور خودمختاری کے حق میں ہے۔ اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے کی خاطر پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے غیرملکی ترقی پسند ثقافت سے بڑی حد تک اخذ کرے۔ نہ صرف آج کی سوشلسٹ اور نئی جمہوری ثقافتوں سے بلکہ غیرممالک کی قدیم ثقافتوں سے بھی ان کے دور کی روشن خیالی کی ثقافت سے بھی استفادہ کرے۔ ہمارا اپنا قدیم ثقافتی ورثہ شاندار ہے۔ اپنی قدیم ثقافت کی نشوونما کا مطالعہ کرنا اور اس کے جمہوری نچوڑ کو اخذ کرنا ہماری نئی قومی ثقافت کو ترقی دینے اور ہماری قومی خوداعتمادی میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری شرط ہے۔

یہ نئی ثقافت جمہوری اور عوامی ہے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں کے انبوہ کثیر کی خدمت کرنی چاہیے۔ انقلابی ثقافت عوام الناس کے لیے انقلاب کا ایک طاقتور ہتھیار ہے۔ یہ انقلاب آنے سے قبل انقلابی نظریاتی زمین ہموار کرتی ہے اور انقلابی نظریئے کے بغیر کوئی انقلابی تحریک نہیں چل سکتی۔

## عوامی جمہوریت اور سوشلزم

یہ بات واضح ہے کہ عوامی جمہوریت یعنی متعدد انقلابی طبقات کی مشترکہ آمریت کے تحت ری پبلک نہ تو بوژروا جمہوریت ہے اور نہ ہی سوشلزم یعنی پرولتاری آمریت کے تحت ری پبلک۔ اکثر لوگ عوامی جمہوریت اور سوشلزم کو گڈمڈ کردیتے ہیں۔ ان دو انقلابی مرحلوں کو غلط ملط کردیتے ہیں۔ ''عوامی جمہوریت'' سوشلست انقلاب کا پہلا مرحلہ ہے جس میں پاکستان کو نیم نوآبادیاتی،

نیم جاگیردارانہ معیشت، سیاست اور ثقافت سے نجات دلائی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں پاکستانی پرولتاریہ کی قیادت میں پاکستان کے تمام انقلابی طبقوں کی مشترکہ آمریت کے تحت ایک نئے جمہوری معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

پاکستان میں اس وقت انقلاب کا فرض سامراج، گماشتہ، سرمایہ داری اور جاگیرداری سے جان چھڑانا ہے۔ سوشلزم اس وقت تک خارج از بحث ہے۔ پہلا قدم عوامی جمہوریت جب کہ دوسرا قدم سوشلزم ہے۔

## متحدہ محاذ

مزدور کسان پارٹی پاکستان میں سامراجی گماشتہ سرمایہ داری اور جاگیردار سیاسی معیشت اور ثقافت کا تختہ الٹنے اور عوامی جمہوری سیاست، معیشت اور ثقافت کے قیام کے لیے نہ صرف انقلابی طبقات یعنی مزدوروں، کسانوں، انقلابی دانشوروں اور ادنیٰ متوسط طبقے کے ساتھ اتحاد کرے گی بلکہ درمیانے طبقے کے ترقی پسند لوگوں کے ساتھ بھی اتحاد قائم کرے گی اور اس کے ساتھ دنیا بھر کی عوامی جمہوریتوں اور عوام کے ساتھ سامراج کے خلاف جدوجہد میں شریک رہے گی۔ مزدور کسان پارٹی ان کے ساتھ یکجہتی کا عزم کرتی ہے۔ پارٹی نظم وضبط اور تنظیم کے حوالے سے مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرے گی:

۱۔ فرد تنظیم کے تابع ہے۔
۲۔ اقلیت اکثریت کے تابع ہے۔
۳۔ ادنیٰ مرتبہ اعلیٰ مرتبہ کے تابع ہے۔
۴۔ ساری رکنیت مرکزی کونسل کے تابع ہے۔

جوکوئی بھی نظم وضبط کی ان دفعات کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ پارٹی کے اتحاد کو توڑتا ہے۔

## میدان عمل میں ہشت نگر اور کوہ نور ریان

مزدور کسان پارٹی کی عملی سیاست کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں ۱۹۷۰ء کے اوائل میں کسانوں کی ہشت نگر تحریک اور کوہ نور ریان (راوی ریان) ملز کے قبضے کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ کیوں کہ یہ دونوں

حوالے ایسے ہیں جس کی وجہ سے مزدور کسان پارٹی، کسان اور مزدور محاذ پر اُبھر کر سامنے آئی اور ان دنوں یہ نعرہ بہت مقبول ہوا۔

''ہمارا نگر تمہارا نگر۔ ہشت نگر ہشت نگر''

## ہشت نگر تحریک

ہشت نگر عرصہ دراز سے قائم ہے اور قدیم سفر ناموں اور صحیفوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ دریائے سوات کے زیریں علاقے میں آٹھ شہر آباد تھے ان سے یہ نام منسوب ہے۔ عام طور پر آٹھ شہروں سے مراد تنگئی، شیر پاؤ، عمر زئی، ترنگ زئی، عثمان زئی، راجور، چارسدہ اور پڑانگ مراد لی جاتی ہے۔ الیگزینڈر کننگھم کا کہنا ہے کہ ہشت نگر پرانے نام بستی نگر کا بدلا ہوا نام ہے اور یہ شہر چکلاوتی (چارسدہ) یعنی کنول کے پھولوں کی سرزمین کا دارالخلافہ تھا۔ لیکن خیال یہ ہے کہ مسلمانوں نے بستی نگر کو فارسی کے رنگ میں رنگ کر اسے ہشت نگر کہنا شروع کر دیا۔

جب مزدور کسان پارٹی نے وہاں کسان تحریک کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا اس وقت وہاں طبقاتی تقسیم کچھ اس طرح تھی:

شمالی ہشت نگر

مالک طبقہ ۵ فی صد

غیر مالک طبقہ ۹۵ فی صد

مالک طبقہ میں پھر زمین کی تقسیم کچھ یوں تھی:

بڑا مالک ۲۵ فی صد (ہزاروں ایکڑ کے مالک)

درمیانہ مالک ۳۰ فی صد (۵۰/ ایکڑ سے ۱۵۰/ ایکڑ کے مالک)

چھوٹا مالک ۴۵ فی صد (ایک ایکڑ سے ۵۰/ ایکڑ کے مالک)

غیر مالک طبقہ

مال دار مزارع ۱۰ فی صد

درمیانہ مزارع ۴۰ فی صد

غریب مزارع ۵۰ فی صد

(تحقیق شیر علی باچہ سرکلر نمبر ۵۴)

ہشت نگر تحریک اور کسانوں کا خانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا صوبہ سرحد میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی اردگرد کے علاقوں میں کسانوں نے ظلم کے خلاف سر اٹھایا تھا۔ ان میں پاکستان بننے سے پہلے ۱۹۳۷ء میں غلہ ڈھیر کسان تحریک اور ۱۹۳۹ء میں مفتی آباد کی کسان تحریک اپنی جدوجہد کے حوالے سے کافی شہرت پا چکی تھی۔ اس کے بعد خزانہ ڈھیری میں اور نواب زدگان ہوتی کے خلاف جو کسان جدوجہد شروع ہوئی وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسانوں کی اس تحریک کے اسباب کیا تھے۔

## تحریک کے اسباب

۱۔ خوانین کسانوں سے ہر طرح کی بیگار لیتے تھے۔ بغیر معاوضے کے جبراً اپنے کھیتوں میں کام کرواتے، معاوضہ یا فصل کا حصہ تو کجا وہ بیگار والے دن ان کو کھانا بھی نہیں دیتے تھے۔ بیگار صرف مرد کسانوں سے ہی نہیں لی جاتی تھی بلکہ بچے اور عورتیں بھی بلاناغہ خوانین کے گھر کام کرتے تھے اس میں جھاڑو دینے کے علاوہ دیگر گھریلو کام بھی ان کے ذمہ ہوتے تھے جس کی وجہ سے دوسرے سماجی مسائل بھی پیدا ہو جاتے تھے۔

۲۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر خان فی شادی دوسو روپے کے حساب سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔ بصورت دیگر خان رخصتی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ خوانین اپنی شادیوں کے موقع پر مرغیاں، گھی، چاول اور لکڑیاں کسانوں سے حاصل کرتے تھے۔

۳۔ خوانین زبردستی بے دخلیاں کرتے۔ حکم عدولی کی صورت میں کھڑی فصلیں تباہ کر دیتے تھے۔

۴۔ خوانین کسانوں سے بٹائی یا زر اجارہ وصول کرتے لیکن رسید نہ دیتے تھے۔ کسی بھی چیز کی وصولی کا کوئی دستاویزاتی ثبوت نہ ہوتا۔

۵۔ خوانین عدالتی فیصلے بھی خود کرتے تھے اور من مانی کرتے ہوئے کسانوں پر ظلم کرتے تھے۔ بعض اوقات خوانین کسانوں کو مردے دفنانے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کو اکھٹا ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے اور مسجدوں کو بھی تالے لگا دیتے تھے۔

شیر علی باچہ کے اس وقت کے جائزے کے مطابق رستم، بونیر، دیر، مالاکنڈ، چترال اور ہزارہ

کے علاقوں میں خوانین کے مظالم کی داستانیں بکھری پڑی تھیں۔ خوانین کے ان مظالم کے خلاف کسانوں نے مل کر جدوجہد شروع کی۔ انہوں نے مزید ظلم سہنے سے انکار کر دیا اور مزدور کسان پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ہشت نگر تحریک انہی مظالم، جبر وتشدد، خوانین کے تکبر وغرور اور بداعمالیوں کی وجہ سے شروع ہوئی۔ خوانین کسانوں کی آواز کو دبانے کے لیے مزارعین کے گھروں اور کھلیانوں کو نذر آتش کر دیتے تھے۔ ان کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیتے اور ان کو گولیوں کا نشانہ بناتے تھے۔

اگر اس وقت کے مزدور کسان پارٹی کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو وہ زیادہ تر خوانین اور جاگیر داروں کے ظلم کی داستانیں رقم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس بات کی تفصیلات بہت کم نظر آتی ہیں کہ جب کسانوں نے چند مخصوص علاقوں میں مسلح جدوجہد شروع کی تو اس کا طریقہ کار کیا تھا؟

## طریقہ کار

ابتداء میں یہ ایک خودرو تحریک تھی۔ اس کا اعتراف کئی بار کیا گیا ہے۔ کسان نظریئے سے نابلد تھے اور ان میں تنظیم کا فقدان تھا۔ پہلے پہل لشکری طرز کی لڑائی لڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے لیے کوئی خاص حکمت عملی نہ تھی۔ بعض تصادم ایسے تھے کہ خان اپنے ڈیرے چھوڑ کر چلے گئے۔

نظریاتی سطح پر خانوں اور مزارعین کے مابین عملی سطح پر تضاد سمجھنے کے علاوہ کُلی طور پر اس وقت کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کے مطابق مزارعین کو اپنے مفادات کے درمیان تضادات کا شعور پوری طرح حاصل نہ تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ خودرو عناصر کی موجودگی اور باشعور کسان انقلابی کارکنوں کی کمی تھی۔ اس بات کا بھی فقدان تھا کہ دوسرے کسانوں اور مزارعین کی بعض زمینوں پر قبضے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کو کیوں کر حل کیا جائے۔

اب ہم ان مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔

## مسائل کا تجزیہ

جو مزارعین اور بے زمین کسان اس جدوجہد میں پیش پیش تھے وہ طبقاتی طور پر پسے ہوئے تھے اور

وہ اس سطح پر مسلح نہ تھے جیسی طاقت خوانین کے پاس تھی اور نہ ہی ان کی پشت پناہی پر ریاست کی طاقت تھی۔ مزدو کسان پارٹی کا خیال تھا کہ اس وقت صوبہ سرحد میں جمعیت علمائے اسلام اور نیپ کی حکومت جس کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود اور گورنر ارباب سکندر خاں خلیل تھے اس تحریک کو کچلنے میں خوانین کا پورا پورا ساتھ دے رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے نیپ جس نے ماضی میں خدائی خدمت گار کا کردار ادا کیا تھا اور جس کے رہنما سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں فعال رہے تھے وہ کیوں کر اس حکمت عملی کو اپنانے پر مجبور ہوئے؟ اور دوسرے یہ بات سب جانتے ہیں کہ مزدور کسان پارٹی کے سب سرکردہ رہنما نیشنل عوامی پارٹی میں ہی شامل تھے اور انہوں نے نیپ سے علیحدہ ہو کر مزدور کسان پارٹی بنائی تھی۔

نیپ کے اس کردار کو کہ وہ کسانوں اور خوانین کے مابین جنگ میں خوانین کا ساتھ دے رہی ہے مزدور کسان ادب میں تنقید کا سخت نشانہ بنایا گیا۔ حتیٰ کہ عبدالغفار خاں اور ولی خاں کی بھی خوب خبر لی گئی۔

ولی خاں کے بارے میں یہ کہا گیا کہ انہوں نے خود ۱۹۷۲ء میں زلمے پختون نامی تنظیم کو دوبارہ زندہ کیا حالانکہ کئی سال پہلے یہ تنظیم خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی۔ انہوں نے یہ بیان دیا تھا کہ بندوق کی نوبت آئی تو زلمے پختون کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکے گا۔ لیکن بعد میں جب انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ کوئی غیر سیاسی فعل کر چکے ہیں تو وہ اپنے پہلے موقف سے دستبردار ہو گئے اور کہا کہ زلمے پختون تو جلسوں میں جھاڑو دینے والی اور دریاں بچھانے والی جماعت ہے۔ سرحد میں گوریلے تو میجر اسحاق بھرتی کر رہے ہیں۔ (پارٹی سرکلر ۲۱)

لیکن جب ۱۸ مارچ ۱۹۷۲ء میں حیات محمد خاں شیر پاؤ نے افضل بنگش اور دیگر ساتھیوں کے رہائی کے احکامات جاری کئے تو ولی خاں صاحب نے یہ الزام عائد کیا کہ پیپلز پارٹی، مزدور کسان پارٹی کو استعمال کر رہی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ پہلے پہل مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں کے بیانات میں نیپ کے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ برسر اقتدار جماعت پیپلز پارٹی پر بھی سخت تنقید ہوتی تھی لیکن بعد ازاں مزدور کسان پارٹی کے رہنما میجر اسحاق محمد اور افضل بنگش کی لاہور کے گورنر ہاؤس میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے بعد ان کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ وگرنہ اس سے پہلے نیشنل عوامی

پارٹی اور پیپلز پارٹی کو یکساں طور پر تنقید کا ہدف بنایا جاتا تھا۔ جیسے ایک پیراگراف میں کہا گیا ہے:

''نیپ نے سوشلزم اور سیکولرازم کی شقیں اپنے منشور سے یکسر غائب کر دی ہیں اور انجمن تحفظ زمینداراں کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ بھٹو پارٹی نے ملی جلی معیشت کو سوشلزم کا نعم البدل قرار دیا ہے۔ صوبہ سرحد میں بھٹو پارٹی اور قیوم لیگ نے گٹھ جوڑ کر لیا ہے جب کہ دوسری طرف نیپ اور کنونشن لیگ نے ساز باز کر رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ان سیاسی پارٹیوں کی عوام دشمنی کھل کر سامنے آ گئی ہے۔'' (سرکلر نمبر ۲۲)

ان کے نزدیک بھٹو، ولی مفاہمت امریکی سامراج اور روسی سوشل سامراج کی خوشنودی اور برصغیر میں ان کے مفادات کے تحفظ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی اور لندن پلان کی تکمیل کی طرف پہلا قدم تھا۔

اسی زمانے میں شملہ مذاکرات کے بعض اہم پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے یہ لکھا گیا:

''مسٹر بھٹو عوام میں بے پناہ مقبولیت کی بنا پر اقتدار میں آئے اور اب امریکیوں نے ان کو اپنا گھوڑا بنالیا ہے۔ ان کی مثال سنگمن ری اور گلوڈن ڈیم جیسی ہے۔ سنگمن ری بھی جاپان دشمنی کی وجہ سے کوریائی عوام میں بہت مقبول تھے۔ مزدور کسان پارٹی کا خیال تھا کہ امریکی بھارتی اور روسی مثلث تاشقند کی طرح شملہ پر بھی منطبق ہوتی ہے۔''

ایک انٹرویو کے دوران جب میجر اسحاق صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ سرحد میں پیپلز پارٹی کے رہنما آپ کی حمایت کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ چونکہ سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی اپوزیشن میں ہے اور وہاں نیپ کی حکومتیں جاگیرداروں کی حمایت کر رہی ہیں اس لیے پیپلز پارٹی کے لیے زندہ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ محنت کشوں کی حمایت کرے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ پنجاب اور سندھ میں نیپ بھی یہی کردار ادا کرے۔ اس دوران ایک عجیب صورتِ حال یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ جب بائیں بازو کی کوئی جماعت جدوجہد کے سخت ترین دور سے گزر رہی ہوتی ہے تو اسے استحصالی طبقوں کے خلاف متحدہ محاذ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دشمن کو تنہا کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس مزدور کسان پارٹی نے بائیں بازو کی دیگر جماعتوں پر تابڑ توڑ

حملے کئے۔ان کے ان حملوں کی زد میں نہ صرف نیپ آئی بلکہ ''سوشلسٹ پارٹی'' کے سرکردہ رہنماؤں کے بارے میں بھی یہ کہا گیا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جن کے چہرے موقعہ پرستی کی دھول سے اَٹے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ ''سوشلسٹ پارٹی'' محنت کشوں نہیں بلکہ محنت کشوں کی پارٹی ہے۔ہشت نگرتحریک کے تین بڑے مقاصد تھے:

I- دیہی علاقوں میں کسانوں کومنظم کرکے ان کے اندر تنظیمی سطح پر دیہی سیاسی اقتدار کے شعور کو اجاگر کرنا اوران کوخوانین کی سماجی، سیاسی اور معاشی غلامی سے نجات دلوانا۔

II- کسانوں کو بنیادی انسانی حقوق دلانا۔ آپس کے جھگڑے ختم کرانا اور دیہات میں عوامی جمہوری اقتدار کے خوداختیاری ادارے قائم کرنا مثلاً عوامی عدالتیں وغیرہ۔

III- بے دخلیاں اورجرمانے ختم کروانا، اجاروں اور بٹائی کی شرح میں تخفیف کرنا۔کھیت، مزدوروں کی مکانوں سے بے دخلی روکنا، ان کی اجرتیں بڑھوانا، ان کی زندگی بہتر بنانا، خود کاشت زمینیں مزدوروں میں تقسیم کرنا، چھوٹے مالکوں کو ساتھ ملانا اور چھوٹے مالکوں اور کسانوں کے درمیان تضادات کودوستانہ طور پر حل کرنا۔ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کئی ایک اصول وضع کئے گئے مثلاً:

۱۔ کسان ریاستی اداروں کے پاس جانے کی بجائے اپنے مابین جھگڑے خود حل کریں۔
۲۔ ایک کسان دوسرے کسان کی زمین اجارہ یا بٹائی پرنہیں لے گا تاکہ بے دخلی کوروکا جاسکے۔
۳۔ بیگار، جرمانے، نذرانے اورجاگیرداری رسومات کا اجتماعی خاتمہ۔
۴۔ ایک کسان سب کے لیے اورسب کسان ایک کے لیے۔دیہات دوحصوں میں بٹ گئے۔

ایک کسان اوردوسرا غیرکسان یعنی مزدورکسان پارٹی کارکن اور وہ جو تحریک میں شامل نہ تھا۔ لیکن کوئی بھی تحریک اندرونی تضادات سے ماوراءنہیں ہوتی۔اس منظرنامے کو اگر سامنے رکھیں تو ایک طرف بڑے زمیندار یعنی خوانین تھے جو مزارعین اور کھیت مزدوروں کا براہ راست استحصال کرتے تھے جس کی مختلف اشکال کا تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔لیکن دوسری طرف چھوٹے مالک تھے جن کا جھکاؤ مزدورکسان پارٹی کی طرف نہیں تھا۔ مزارعین اورکھیت مزدور زیادہ تر کسان تحریک کا حصہ تھے۔لیکن جب خوانین کی عدم موجودگی میں بعض مزارعین نے مالک کسانوں کا درجہ حاصل کرلیا تو ان کا کھیت مزدوروں کے ساتھ

براہ راست تضاد شروع ہو گیا۔

مثلاً کھیت مزدوروں کی ایک یادداشت میں یہ کہا گیا۔ اگر ان کی جدوجہد کے نتیجے میں ۵ فی صد خوانین ختم ہو جائیں۔ بے دخلی بند ہو جائے تو پھر ۳۰ فی صد کسان یا مزارعین ایک قسم کے خان بن جائیں گے اور انہیں ان کے خلاف دوبارہ جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ سفر طویل اور مشکل ہے۔ لہٰذا کھیت مزدوروں نے پارٹی سے مطالبہ کیا کہ بے دخلی بند ہونے سے پہلے انہیں زمین میں حصہ دلایا جائے۔

ایک زمانے میں یہ تضاد اس قدر شدید ہوا کہ کسانوں نے کھیت مزدوروں پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور کچھ کھیت مزدوروں کو جو زمین دی گئی تھی وہ واپس لے لی اور کہا کہ وہ خوانین کے ساتھ مل گئے ہیں۔

کسان تحریک سے پہلے خوانین اور مزارعین دونوں کھیت مزدور سے بیگار لیتے تھے۔ بعض جگہ مزارعین نے کھیت مزدور پر چارہ یا گھاس کاٹنے اور ایندھن لینے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔

یہ ایک ایسا تضاد تھا جس کا تحریک کے نشوونما پانے کے ساتھ ساتھ کوئی مؤثر حل نہیں ڈھونڈا گیا۔ کئی کارکنوں کی شہادت اور قربانیوں کے بعد اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ یہ تحریک بھی مدھم پڑتی گئی۔ بہر حال یہ ضرور ہوا کہ اس تحریک کی موجودگی میں پیپلز پارٹی کے لیے جگہ بن گئی اور جہاں جہاں کسانوں کی تحریک زوروں پر تھی وہاں پیپلز پارٹی نے قدم جمانے شروع کر دیئے۔ پیپلز پارٹی کے دو شعلہ بیان مقرروں طارق عزیز اور معراج محمد خاں نے یہ فصل مالا کنڈ اور مردان کے علاقے میں اچھی طرح کاٹی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ یہ اس مضمون کے انتقاد میں پیش کیا جائے گا۔

## کوہ نور ریان (راوی ریان) پر قبضہ

کوہ نور ریان مصنوعی ریشم دھاگہ تیار کرنے کا ایک کارخانہ ہے جسے بعد ازاں راوی ریان کا نام دیا گیا۔ یہ کارخانہ سہگل خاندان کی ملکیت تھا۔ اس وقت اس کی قیمت ۲۵ کروڑ روپیہ تھی اور ۱۹۷۱ء میں اس کی پیداوار آٹھ ٹن یومیہ تھی۔ اس وقت اس کے حصص کی قیمت دس روپے سے گر کر تین روپے ہو گئی تھی۔ کارخانہ اس وقت سخت بد انتظامی کا شکار تھا۔

کوہ نور ریان کے ایک ہینڈ آؤٹ کے مطابق ۲۳ فروری ۱۹۷۲ء کو کارخانے کا انتظام مزدوروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے کارخانے کی اعلیٰ انتظامیہ کے ۲۹ افسروں کو حکومت کے نامزد مینجنگ ڈائریکٹر سمیت (قومیائے جانے کے بعد) کارخانے کی حدود سے باہر نکال دیا اور کارخانے کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

اس کارخانے کی ٹریڈ یونین چونکہ مزدور کسان پارٹی سے وابستہ تھی اس لیے سمجھا یہ جاتا تھا کہ اس قبضے کے پیچھے مزدور کسان پارٹی کا منصوبہ کام کر رہا ہے۔ مزدور کسان پارٹی کے ۲۱ویں سرکلر میں اس کاروائی کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ کارخانے کے افسر اجارہ دار سرمایہ داروں کے پٹھو تھے۔ مزدوروں کے قبضہ کے بعد یہ کارخانہ انتہائی کامیابی کے ساتھ چلے گا۔ مزدوروں نے کامیابی کے ساتھ کارخانہ چلا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ پیشہ ور ماہرین کے علاوہ مزدور اپنے تئیں بھی ماہرانہ طور پر کارخانہ چلا سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ عوامی حکومت کے بنیادی صنعتوں کو تحویل میں لیے جانے والے پروگرام کو اجارہ دار سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی ملی بھگت سے ناکام نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ درج ذیل مثبت نتائج سامنے آئے ہیں:

۱۔ مزدوروں کے قبضے کے بعد دھاگے کی روزانہ پیداوار آٹھ ٹن سے بڑھ کر ۱۰.۷ ٹن ہوگئی۔

۲۔ جن انتیس افسروں کو نکال کر لاکھوں روپے کی ماہانہ بچت کی گئی، وہ کل کارکنوں کی تعداد کا صرف ۱.۵ فی صد تھے جب کہ کل تنخواہوں کا ۵۰ فی صد ہضم کر جاتے تھے۔

مزدور کسان پارٹی نے اس قدم کو خوش آئند کہا اور اس بات کی پذیرائی کی کہ اب مزدور خود ہی پالیسیاں بناتے ہیں اور خود ہی فیصلے کرتے ہیں۔ انہوں نے کارخانے کے نظام کو چلا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ سوشلزم کا نظام سرمایہ دارانہ نظام سے برتر ہے۔ انہوں نے دانشوروں سے کہا کہ آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ لوک راج کی پو پھوٹ رہی ہے۔ اس کا نظارہ کرنے کے لیے ملوں اور کھیتوں میں جا کر تاریخ کے خالقوں کی امداد حاصل کرو۔ ان کی امداد کے بغیر انقلاب کی تعلیم نہیں مل سکتی اور نہ ان کی مدد کے بغیر تمہاری بصیرت کی آنکھ روشن ہو سکتی ہے کہ تم لوگ راج کے سویرے کی جھلک دیکھ سکو۔ بہت جلد تمہاری سمجھ میں آ جائے گا کہ عوام اور صرف عوام ہی عالمی تاریخ تخلیق کرنے میں قوت محرکہ ہوتے ہیں۔

اس دوران سلطان فونڈری بادامی باغ پر بھی مزدوروں کے قبضے کو سراہا گیا۔ اسے مزدور تحریک

میں ایک اور باب کے اضافے کا نام دیا گیا۔ بعد ازاں یہی الفاظ افسر ٹیکسٹائل ملز کے لیے بھی دوہرائے گئے۔ لیکن چوں کہ ملوں کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مزدوروں کی طرف سے یہ منفرد واقعہ تھا اور چند ایک چھوٹی ملیں بھی اس کی راہ پر چل نکلیں تو ایک طویل عرصہ کے لیے اس طرح کی مثال کا قائم رہنا حکومت کی عفریت کے سامنے ممکن نہ ہو سکا۔ ہمارے دوست پروفیسر ظفر علی خان جو اس تحریک کا قریب اور باریک بینی سے مطالعہ کر رہے تھے کا کہنا ہے کہ جب سوشل سائنٹسٹ ڈاکٹر منیر احمد نے امریکہ میں جا کر اس انوکھے تجربے کی مداح سرائی کی تو امریکی حکومت کے بھی کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بھی امریکی سفیر کو اس کارخانے کا دورہ کرنے کے لیے کہا۔ وہ اس لیے بھی کہ پرانے مالکوں نے اپنے ہی بنک یعنی یونائیٹڈ بنک سے جو قرضہ لیا ہوا تھا اس کی امداد اس سلسلے میں امریکن بنکوں نے بھی کی تھی۔ امریکی اپنے سرمائے کے تحفظ کی ضمانت کے بارے میں فکرمند تھے۔ بہرحال حکومت نے اپنی کاروائی کرنے کے بعد سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور اس دوران کارخانے میں کام بھی بند ہو گیا۔ آہستہ آہستہ انضباطی کاروائیوں کی وجہ سے اس کارخانے میں ابھرنے والی تحریک ماند پڑ گئی۔ پھر بعد ازاں کوئی تیرہ سال مقدمہ لڑنے کے بعد مزدوروں کے حق میں فیصلہ ہوا اور انہیں عدالتی کاروائیوں سے فرصت ملی۔

مزدور کسان پارٹی نے ایک ایسے دور میں جنم لیا تھا جب دنیا بھر میں انقلابی ابھار کے لیے زمین زرخیز تھی۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک میں انقلابی کامیابیاں ایک نئے دور کی نوید لے کر سامنے آ رہی تھیں۔ ماؤزے تنگ، فیڈرل کاسترو، ہوچی منہ، ایمل کارکبرال، ڈاکٹر نینو اور چواین لائی ایسی شخصیتوں کے طور پر سامنے آ رہے تھے جن کی راہ پر چلنا ہر انقلابی خیالات رکھنے والے شخص کے لیے باعث فخر تھا۔ ان سے متعلق ادب اور متعلقہ ممالک میں انقلاب برپا ہونے کے داستان ہر کسی کے دل کو بھا رہی تھی۔

اس دور میں ہونے والی تبدیلیوں کے روپ میں ڈھل کر نوجوانوں کی بڑی کھیپ میدان عمل میں کود پڑی۔ ان کا صرف ایک ہی مطمع نظر تھا کہ وہ کیسے اس دھرتی کا روپ سنوار سکتے ہیں؟ جو اکیس سال تک ایک فرسودہ اور سڑاند مارتے ہوئے نظام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے دن بدن زوال پذیر ہو رہی ہے۔

زیادہ بامعنی الفاظ میں یہ کہا جا سکتا کہ یہ ارتیابیت (Nihilism) اور نراجیت

(Anarchism) کا دور تھا۔نو جوان نسل تمام مروجہ سیاسی ، ثقافتی ،ادبی اور فنی رجحانات کے خلاف صف آراء تھی ۔ایک حصہ تو ماضی کی شاندار روایات پر سوار ہوکر آگے بڑھنا چاہتا تھا اور ایک بڑا حصہ ایک بنیادی تبدیلی کا خواہاں تھا۔سبھی لوگ پرانی روایات سے بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔

اسی رو میں بہتے ہوئے بہت سے نوجوان نیشنل عوامی پارٹی(NAP) کی طرف مائل ہوئے۔ سوشلسٹ نظریات کو اپناتے ہوئے وہ پاکستان کے معاشی اور سماجی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ان کے سامنے کئی ماڈل تھے۔

مزدور کسان پارٹی نے چینی ماڈل کو اپنایا اور ماؤزے تنگ کے خیالات کو اپنا رہنما بنایا۔لیکن بہت سی اچھی باتوں کے علاوہ اس پارٹی میں بہت سی کمزوریاں اور خامیاں بھی تھیں جو میرے تجزیئے کے مطابق کچھ یوں تھیں۔

میں اپنی کئی اور تحریروں میں بھی یہ بات کہہ چکا ہوں کہ پاکستان کے زیادہ تر سوشلسٹ رہنما مارکسزم سے نابلد تھے۔انہوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ نہ کیا تھا۔چند ایک گنی چنی تحریروں کے علاوہ انہوں نے جدلیات کی اصل پہچاننے کی کوشش نہ کی۔میں سمجھتا ہوں کہ مارکسی جدلیاتی مادیت کو سمجھنے کے لیے ہیگل(Hegel) کی جدلیات اور اس کی کتابScience of Logic کا مطالعہ ضروری تھا۔اس کے علاوہ فیور باخ(Feurbach) کی (Essence of Christanity) کو بھی سمجھنے کی ضرورت تھی کیوں کہ مادیت کے ارتقائی مراحل کی وہ ایک اہم کڑی ہے۔اسی لیے تو لینن نے اپنے ۳۸ ویں(Volume) جلد میں یہ کہا تھا کہ’’مارکس کے ہم عصر مارکس کو اس لیے نہ سمجھ سکے کہ انہوں نے ہیگل کی منطق نہیں پڑھی تھی۔‘‘چند اصطلاحیں تھیں جو نوجوانوں تک منتقل کر دی گئیں تھیں اور وہ سیاسی نعرہ بازی کا کام دیتی رہیں۔اسی بنا پر ایک تجزیہ (جو کسی بھی لحاظ سے معروضی نہ تھا) رجائیت کی سرشاری کی نذر ہو گیا۔پاکستان کے خطوں کے مختلف سماجی اور معاشی حالات ان کی نشوونما ان کے اندر طبقاتی اختلاف کی مختلف پرتوں کا جدلیاتی حوالے سے کبھی تجزیہ ہی نہیں کیا گیا۔ہر دور میں ایک نوید سنائی دی کہ انقلاب اب پاکستان کی دہلیز پر کھڑا ہے۔

مزدور کسان پارٹی کے منشور سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’پاکستان کی آزادی ، سامراجیوں ، گماشتے سرمایہ داروں ، جاگیرداروں

اور افسر شاہی کے گرہن میں مبتلا ہے۔ لیکن یقیناً اس گرہن کے اٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔ یقیناً وہ دن دور نہیں جب آزادی کی شعائیں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پاک سرزمین کو منور کریں گی۔ آج پرولتاریہ اور عوام الناس کی تحریک نے ایک ایسی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے جو پہاڑوں کو ہموار کر سکتی ہے اور سمندروں کو پاٹ سکتی ہے اور برق رفتاری کے ساتھ اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔"

اسی طرح بات کرتے کرتے اس باب کے آخر میں لکھا ہے:

"لاریب! پاکستان کی آزادی کے گرہن کے اٹھنے کا وقت قریب ہے۔" (منشور مزدور کسان پارٹی صفحہ ۳۲ (۱۹۷۲))۔

آج اس منشور کو لکھے ہوئے ۳۷ سال گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان تبدیلیوں کا دور دور تک کہیں سراغ نہیں مل رہا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بائیں بازو کے رہنماؤں نے ابھی تک کارکنوں کو رجائیت کی سرشاری میں مبتلا رکھا ہوا ہے۔ لیکن اس وقت تو یہ کیفیت اپنے عروج پر تھی۔ دوسرے یہ مضمون صرف ایک ہی شخص کے ذہنی کاوش تھی اور کوئی دوسرا اس عمل میں شامل نہیں تھا۔ میرے خیال میں پارٹی کے پولٹ بیورو سے بھی اس کی منظوری نہیں لی گئی تھی۔

یہ ایک غیر جمہوری رویہ تھا جو پارٹی کی مختلف پرتوں میں دیکھنے میں آتا تھا۔ اختلافِ رائے کا حل جمہوری طریقوں سے نکالنے کی بجائے اسے دبانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ جب چین میں لن پیاؤ کا عروج تھا تو اس کا کتابچہ "عوامی جنگ کی فتح پائندہ باد" پارٹی کے کارکنوں کی تعلیم کا لازمی حصہ بنا دیا گیا۔ جب ماؤزے تنگ نے لن پیاؤ کو اپنا جانشین مقرر کیا تو ایک کامریڈ نے یہ سوال اٹھایا کہ ایک ایسی پارٹی جو چین میں انقلاب لائی ہے جہاں لانگ مارچ (Long March) کرنے والے بھی زندہ ہیں اور سنٹرل کمیٹی بھی اپنی جگہ کام کر رہی ہے وہاں جانشین مقرر کرنے کا عمل ایک قدامت پرستانہ (Despotic) قدم ہے جس پر اس کامریڈ کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیا گیا ہے کہ "کامریڈ ہمیں آپ کی کمٹ منٹ (Commitment) پر شک ہے۔ یہ بات پارٹی کے اندر غیر جمہوری رویوں کی نشاندہی کرتی

ہے۔

ایسے ہی غیر جمہوری روّیے پارٹی کے عہدوں کی تقسیم پر بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ گو باقی کمیونسٹ و سوشلسٹ پارٹیوں کی طرح مزدور کسان پارٹی بھی جمہوری مرکزیت (Democratic Centralism) پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کرتی تھی لیکن باقی کمیونسٹ و سوشلسٹ پارٹیوں کی طرح تو وہ بھی اس دعویٰ پر پوری نہیں اتری۔ کمیونسٹ پارٹی میں عام طور پر کسی کارکن کی اٹھان، لگن اور ایمان دیکھ کر اسے نامزد کر دیا جاتا جب کہ متعلقہ اراکین کا فیصلہ ان کی خاموش تائید کے طور پر سامنے آتا تھا۔ اگر کبھی کوئی اس سے اختلاف بھی کرتا تو دبی دبی زبان میں اِدھر اُدھر کوئی بات کر دیتا۔ پارٹی فورم میں ایسا اختلاف خال خال ہی دیکھنے میں آتا تھا۔

اسی رویے پر تنقید کرتے ہوئے ''مزدور کسان پارٹی میں نظریاتی اختلافات'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں لکھا گیا تھا:

> ''پارٹی سرکلر مزدور کسان پارٹی کی نظریاتی رہنمائی کرتے تھے اور یہ رہنمائی اس طرح کی جاتی تھی کہ مرکزی صدر کے ذریعے جنہوں نے کبھی کوئی دستاویز اور مضامین پارٹی منظوری سے شائع نہیں کئے تھے۔ ایم کے پی کی پرانی قیادت اپنی اپنی قائدانہ ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے ہمیشہ جمہوریت کا نعرہ لگاتی تھی کہ پالیسی نیچے سے اوپر آتی ہے۔ یہ انتہا پسند جمہوریت کا نعرہ تھا جس کی آڑ میں چوہدراہٹ غالب رہتی تھی۔''

ماؤزے تنگ نے کہا ہے ''انتہا پسند جمہوریت کا سرچشمہ ادنیٰ بوژروا طبقے کی نظم و ضبط سے انفرادیت پسندانہ بیزاری میں پایا جاتا ہے۔'' یہ رویہ جمہوریت سے متصادم تھا کیوں کہ جمہوری مرکزیت کو اپنانے کا مطلب کچھ بڑوں کی چوہدراہٹ کا خاتمہ تھا۔

پارٹی کے اندر اختلافات نظریاتی سطح پر حل کرنے کے بجائے یا اسے مثبت تنقید کے طور پر لینے کے بجائے ذاتی دشمنی قرار دیا جانے لگا۔ جب یہ ذرا شدت اختیار کرتے تو دونوں طرف سے نظریاتی اختلافات کو ایک طرف رکھ کر انتہا درجے کی کردار کشی کو اپنا لیا جاتا۔ بعض اوقات اپنی شائع شدہ تحریروں میں بھی اس کو نمایاں کیا جاتا اور پارٹی فورم کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی غیر اخلاقی زبان میں ایک دوسرے پر کرداری گندگیوں کا کیچڑ اچھالا جاتا۔ یہ گھٹیا قسم کا رویہ تھا جس سے پارٹی

کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل شروع گیا اور اس کے اندر کئی دھڑے مرکزیت سے ہٹ کر اپنے اپنے نظریاتی محل تعمیر کرنے لگے۔

ایک اور اہم نظریاتی مسئلہ جس کی طرف کتابچے ''مزدور کسان پارٹی میں نظریاتی اختلافات'' میں ذکر کیا گیا ہے قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک ہمہ گیر انقلابی سیاسی راہ عمل کے بغیر انقلابی پارٹی وجود میں نہیں آ سکتی۔ لیکن مزدور کسان پارٹی کے بزرگ معاشی جدو جہد (بالخصوص کسان معیشت پسندی) کے ذریعے ہی سب کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ معیشت پسندی یا خود روئیت کی سجدہ ریزی سے نہ تو انقلابی سیاست پروان چڑھتی ہے اور نہ ہی انقلابی پارٹی بنتی ہے بلکہ معاشی جدو جہد بوژروا سیاست اور ٹریڈ یونین پیدا ہوتی ہے اور ہوا بھی یہی کہ یہ محض کسان پارٹی بن کر رہ گئی۔ ایک اور اہم نظریاتی اور عملی مسئلہ جس کو میں زیر بحث لانا چاہتا ہوں وہ متحدہ محاذ سے متعلق ہے۔ اپنے عملی نظریاتی رجحانات میں مزدور کسان پارٹی نے سخت قسم کا بنیاد پرستانہ رویہ اپنایا ہوا تھا۔ ایک جامع اور وسیع تر جدوجہد کے لیے یہ ضروری تھا کہ مختلف دوست طبقات، باعمل انقلابیوں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے بارے میں مزدور کسان پارٹی کا رویہ دوستانہ رہتا اور ان سے مل کسی وسیع تر متحدہ محاذ کی صورت نکال لی جاتی۔ لیکن ایسا ارادتاً نہ کیا گیا اور اس قسم کے روئیوں کی بھی حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ بلکہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور نظریاتی پوتر تا کے راگ الاپتے رہے۔ جیسے کہ صحیح نظریات کی وحی صرف ان پر ہی نازل ہوئی ہے اور باقی سب مردود ہیں اور ناقابلِ معافی ہیں۔

ایک زمانے میں معراج محمد خان جب پی پی پی سے دلبرداشتہ تھے تو انہوں نے مزدور کسان پارٹی میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں راولپنڈی میں کئی ایک اجلاس ہوئے۔ لیکن کبھی ایک بہانے اور کبھی دوسرے بہانے ان کی وہ خواہش پوری نہ ہونے دی گئی۔ اس طرح ایک منجھا ہوا سیاسی رہنما پارٹی میں پذیرائی حاصل نہ کرسکا۔ اتفاق سے میں بھی ان مباحث اور اجلاسوں میں شریک تھا اور ایسے بہت سے اجلاس میرے ہی ایک عزیز کے گھر ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ بھٹو دور میں مرکز میں پی پی پی کی حکومت تھی اور دو صوبوں یعنی بلوچستان اور سرحد میں نیپ اور جے یو آئی کی مخلوط حکومتیں تھیں۔ پی پی پی کو ایسے اتحادیوں کی ضرورت تھی جو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومتوں کو کمزور کرنے اور گرانے میں مدد

دیں۔ اس سلسلے میں پی پی پی نے بہت زیرک نظری سے سرحد میں ہشت نگر کی تحریک کو سرحد حکومت کے خلاف استعمال کیا۔ چوں کہ مزدور کسان پارٹی اس تحریک کی پہچان ''ہمارا نگر تمہارا نگر ہشت نگر ہشت نگر'' بن گئی تھی جس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر بھی پاکستانی نژاد انقلابی اس طرف کھنچے چلے آئے۔ یوں صوبائی حکومت کے خلاف تحریک مؤثر طور پر سامنے آئی۔ اپنی تحریروں اور عمل میں مزدور کسان پارٹی نے سرحد حکومت نیپ اور جے یو آئی پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ اس کا فائدہ مرکز میں پی پی پی کی حکومت نے اٹھایا۔

ہشت نگر میں عوامی ابھار اور کسانوں کی خوانین کے خلاف بغاوت کے دوران ایک طرف نچلے درجے کے کسان کھیت مزدوروں اور دوسری طرف مالک کسانوں اور مزارعین کے درمیان جو تضادات ابھر کر سامنے آئے انہیں بھی مزدور کسان پارٹی پوری طرح حل نہ کر پائی۔ اس وجہ سے تحریک اور پارٹی دونوں اندر سے کمزور ہو گئے۔ اس زمانے میں امتیاز عالم اور شیر علی باچہ مرحوم نے اپنے کتابچے ''مزدور کسان پارٹی میں نظریاتی اختلافات'' میں جو تجزیہ پیش کیا اس کا مختصر خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

> ''جہاں تک سرحد کا تعلق ہے سرحد میں عوام الناس میں یہ کسان پارٹی کے نام سے جانی جاتی ہے اور صرف کسان جدو جہد کے علاقوں میں یہ کسانوں کی خوانین کے خلاف طبقاتی جدو جہد کی تنظیم رہی ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا بنیادی زور بے دخلیوں کی روک تھا اور دیگر کسان مطالبوں تک محدود رہا ہے۔ چوں کہ کسان جدو جہد کے ابتدائی دور میں امیر کسان اس کی قیادت پر حاوی تھا اس لیے یہ امیر کسانوں کی قیادت میں کسانوں کی تنظیم بن کر رہ گئی۔ سرحد کسان تحریک کے ابتدائی دور میں جب خوانین سے تضاد عروج پر تھا تو کھیت مزدور بھی بلا جھجک اس میں شامل رہے۔ لیکن جب کسان جدو جہد نے معاشی اور طبقاتی کامیابیاں حاصل کیں اور خوانین کا زور کم پڑ گیا تو امیر کسانوں اور کھیت مزدوروں نے اپنی علیحدہ طبقاتی تنظیمیں بنالیں تو اس طرح مزدور کسان پارٹی کا دائرہ اور تنگ ہو گیا۔''

۱۹۷۷ء کے آخری اجلاس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ مزدور کسان پارٹی پر کسان چھاپ گہری ہے اور پارٹی کسان معیشت پسندی کا شکار رہی ہے۔ پنجاب میں جاگیردارانہ علاقے کے اضلاع کی تمام کمیٹیوں اور تنظیمی کمیٹیوں نے اپنے توسیعی اجلاس میں جو رپوٹیں منظور کیں تھیں ان میں وضاحت کے ساتھ اس امر کا ذکر تھا کہ مزدور کسان پارٹی، کسان کمیٹی بن کر رہ گئی ہے اور ایک جمہوری وقومی کھلا وسیع سیاسی محاذ نہیں بن پائی۔

شیر علی باچہ کہتے ہیں کہ امیر کسانوں کو تنظیمی طور پر کھیت مزدوروں کے ساتھ نہیں باندھنا چاہیے تھا۔ اس طرح کھیت مزدوروں کو محکوم اور مجبور بنا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک غلط پالیسی ہے۔ کیونکہ دونوں کا مفاد آپس میں ٹکراتا ہے۔ امیر کسانوں کا مفاد الگ ہے اور کھیت مزدوروں کا مفاد الگ ہے۔ ہمارے بعض ساتھیوں نے اس فرق کو محسوس نہیں کیا۔ جیسا کہ بعد ازاں ثابت ہوا کہ مندرجہ بالا اندرونی خلفشار اور تضادات کی بنا پر مزدور کسان پارٹی کئی حصوں میں بٹ گئی۔ ہر دھڑا یا گروپ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جو لائحہ عمل اپنایا ہوا ہے وہی حرفِ آخر ہے۔ آج کئی ایک دائیں بازو کے گروپ اپنے نام کے ساتھ مزدور کسان پارٹی کا نام استعمال کر رہے ہیں۔

# اوکاڑہ ملٹری فارم۔ مزارعین کی جدوجہد

زمان خاں

جب سے دنیا میں جاگیرداری نظام وجود میں آیا ہے انسانی تاریخ کسانوں کی بغاوتوں سے بھری پڑی ہے۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان میں ایک نئی طرز کا جاگیرداری نظام رائج کیا، ایک تو انہوں نے زمین کی انفرادی، موروثی ملکیت کا تصور متعارف کروایا جس کے نتیجے میں ایک نئی قسم کا جاگیرداری نظام قائم ہوگیا۔ کسانوں اور مالکان میں ایک نیا رشتہ پیدا ہوا۔ جہاں ریاست نے اپنے وفادار پیر اور جاگیردار پیدا کیے وہاں انگریز نے ہندوستان میں ایک نئی قسم کی فوج بھی متعارف کروائی یعنی مغلوں سے مختلف، مستقل آرمی، اب اس نئی قسم کی فوج کی مستقل سپلائی لائن برقرار رکھنے کے لیے دفاع کے نام پر جاگیرداروں کو کچھ ذمہ داریاں دیں بلکہ اس نے فوج کو بھی جاگیردار بنادیا۔ عمران علی نے اس پہلو پر اپنی کتاب Garrison State میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فوج نے نہ صرف اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ڈیری فارم اور سٹڈ فارم بنائے بلکہ اپنی زمین کو کاشت کرنے کے لیے مزارعین کی خدمات بھی حاصل کیں اور ان کو پٹے پر زمینیں دیں۔

متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے کسان ونگ، آل انڈیا کسان سبھا کے تحت کسانوں نے اپنے حقوق کی جدوجہد کے لیے وقتاً فوقتاً بہت ساری تحریکیں چلائیں جن کا ذکر عبداللہ رسول کی کتاب History of All India Kissan Sabha میں تفصیل سے ملتا ہے۔ جس زمین پر آج پاکستان ہے یہاں کے کسانوں نے بھی بہت سارے مورچے لگائے۔ مگر متحرک، منظم اور باشعور کسانوں کی اکثریت کے ہندوستان ہجرت کر جانے کے بعد پاکستان کے خطے میں کسان اور ترقی پسند تحریک کو بہت دھچکا لگا۔

پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی کے بعد بھی ترقی پسند کارکنوں نے کسانوں میں سیاسی کام کرنا اوران کو منظم کرنا نہیں چھوڑا۔لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی میں ہر سیاسی پارٹی نے بلااستثنٰی اپنے منشور میں زرعی اصلاحات اور مزارعین کی بہتری کے بہت وعدے کیے۔مغربی پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی نے دیہاتوں میں مزارعین، کسانوں اور بے زمین کسانوں میں بہت کام کیا۔یہی وجہ تھی کہ پاکستان پیپلز پارٹی کوان کے منشور کا بہت سارا حصہ اپنانا پڑا۔۲۳مارچ ۱۹۷۰ءکو نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) کے کسان ونگ نے چوہدری فتح محمد کی قیادت میں پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی اور آخری کسان کانفرنس،ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد کی جس میں زیادہ تر شرکاء کا تعلق ماؤنواز گروپوں سے تھا۔فیض احمد فیض نے بھی خصوصی طور پر اس میں شرکت کی۔دراصل یہ پاکستان کی ترقی پسندوں کی آخری کانفرنس ثابت ہوئی جسے کسان کانفرنس کا نام دے دیا گیا تھا۔یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی (مزدور کسان) کے کارکن بھی اس میں شامل ہوئے، اس کے علاوہ چھوٹے، موٹے چین نواز گروپ جو اپنے آپ کو پارٹیاں کہلوانے میں فخر محسوس کرتے تھے انقلاب یا انتخاب۔انقلاب انقلاب کے نعرے لگا رہے تھے۔مغربی پاکستان میں بائیں بازو کی ٹوٹی پھوٹی تحریک کو بھاشانی کی وعلیکم سلام والی تقریر نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا بلکہ اس کو آپ نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کی موت کا پیغام بھی کہہ سکتے ہیں۔اس سے پیپلز پارٹی کا مغربی پاکستان میں راستہ ہموار ہوگیا اور ترقی پسندوں کی بہت بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی۔دراصل ماؤنواز بائیں بازو کی تنظیم پہلے ہی کئی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو چکی تھی جس میں سے ایک گروپ نے بعد میں مزدور کسان پارٹی قائم کی۔آپ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے کسانوں میں سیاسی کام کرنے کی سنجیدہ کوشش ضرور کی۔

مغربی پاکستان میں مزارعوں کے حقوق کے لیے کوئی قوانین نہ تھے۔مالکان زمین اپنی مرضی سے مزارعین کو بے دخل کر دیتے تھے اور بٹائی میں حصہ بھی متعین نہیں تھا۔مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد نئے پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے برسراقتدار آکر زرعی اصلاحات نافذ کیں جن سے مزارعوں کو یقیناً فائدہ پہنچا۔بھٹو نے نہ صرف مزاعین کو تحفظ فراہم کیا بلکہ پیداوار میں مزارعین کا حصہ پچاس فیصد مقرر کیا، اس کے علاوہ مالک کے ذمہ بیج اور کھاد کی فراہمی بھی

لگائی۔

حکومت پنجاب نے ۱۹۱۳ء میں مختلف اضلاع میں پھیلی ۲۶،۲۴۷را یکڑ زمین برٹش آرمی کو اس کی غذائی ضرورت کے لیے ۲۰ سالہ پٹہ پر دی تھی جس کی مدت ۱۹۳۳ء میں ختم ہوگئی۔اس میں سے ۱۲۹۸۹را یکڑ زمین ریونیو آفس اوکاڑہ کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت کی حکومتِ پنجاب نے وزارتِ دفاع کو میمو نمبر ۴۴۵ مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۱۳ء کو ۲۰ سال کے لیے پٹہ پر ڈیری فارمنگ اور فوجی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے فراہم کی تھی، مگر بعض انتظامی معاملات اور دوسری عالمی جنگ شروع ہو جانے کے باعث یہ زمین برٹش آرمی ہی کے پاس رہی۔قیامِ پاکستان کے بعد یہ اراضی پاکستان آرمی کو قانونی تقاضے پورے کیے بغیر ہی منتقل کر دی گئی اور تا حال فوج ہی کے قبضہ اور تصرف میں چلی آ رہی ہے۔

ضلع اوکاڑہ میں ملٹری فارمز کی تعداد چھ ہے جو اٹھارہ چکوک پر مشتمل ہیں۔۱۲۹۸را یکڑ زمین ۱۲۳۵ مزارعین کو بٹائی سسٹم کے تحت کاشتکاری کے لیے دی گئی اور وہ نسل در نسل کاشتکاری کر رہے ہیں۔اس طرح ضلع خانیوال کی تحصیل پیرووال میں ہزاروں ایکڑ زمین جو ے چکوک میں واقعہ ہے پاکستان بننے سے قبل ایک روپیہ فی ایکڑ سالانہ کے حساب سے برٹش کاٹن گروئنگ ایسوسی ایشن کو ۲۰ سال کے پٹہ پر دی گئی تھی، بعد میں یہ زمین پنجاب سیڈ کارپوریشن کو پٹہ پر دے دی گئی۔

پنجاب حکومت نے کئی باران زمینوں کا قبضہ واپس لینے کی کوشش کی لیکن فوج اور دیگر محکموں نے زمین واپس کرنے سے انکار کر دیا۔اس سلسلے میں گذشتہ کئی سالوں سے حکومت پنجاب اور آرمی کے درمیان نہ صرف دفتری خط و کتابت ہوئی بلکہ نوبت عدالتی کارروائی تک پہنچی۔مگر فوج نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ جاری رکھا ہوا ہے۔

پنجاب میں سرکاری زرعی فارم کی تفصیل کچھ یوں ہے:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ ڈیری فارم اوکاڑہ | ۱۲۰۱۳ | ۱۷۰۱۳ |
| ۲۔ ڈیری فارم لاہور | ۵۱۸۹ | ۶۶۸۶ |
| ۳۔ ڈیری فارم سرگودھا | ۱۰۲۵ | ۱۵۲۵ |
| ۴۔ ڈیری فارم ملتان | ۴۳۳ | ۱۰۵۰ |
| ۵۔ ریماونٹ ڈپو رینالہ خورد | ۷۱ | ۳۱۹۳ |

| | | |
|---|---|---|
| ۶۔ سیڈ فارم پاکپتن | ۱۸۳ | ۱۰۴۳۳ |
| ۷۔ کیٹل فارم کچا کھوہ خانیوال | ۲۸۰۰ | ۵۰۰۰ |
| ۹۔ کبیر والہ خانیوال | ۲۷۵۰ | ۲۷۵۰ |
| ۱۰۔ قادر آباد فارم ساہیوال | ۱۵۰ | ۳۵۰ |
| ۱۱۔ بہادر فام اوکاڑہ | ۱۱۷۸ | ۲۹۸۸ |
| ۱۲۔ ایل۔۹/۳۶ فارم ساہیوال | | ۱۵۰ |
| ۱۳۔ اقبال نگر فارم ساہیوال | ۹۸۸ | ۱۰۰۰ |
| ۱۴۔ کاٹن فارم ساہیوال | ۵۷ | ۶۵ |
| ۱۵۔ ایل۔۹/۹۲ فارم سیڈ | ۳۵۰ | ۷۰۰ |
| ۱۶۔ محمد نگر فارم عارف والا | ۵۷۵ | ۶۲۵ |
| ۱۷۔ کالا شاہ کاکو رائس ریسرچ فارم | ۳۴۵ | ۴۵۰ |
| ۱۸۔ فیصل آباد ریسرچ فارم | ۴۰۰ | ۴۰۰ |
| ۱۹۔ نیر گڑھ تجرباتی فارم اوکاڑہ | ۸۶۰ | ۸۷۵ |
| ۲۰۔ پیرووال سیڈ کارپوریشن فارم خانیوال | ۲۱ | ۵۵۰۴ |
| ۲۱۔ پیرووال جی فارم خانیوال | ۳۵۲ | ۱۵۸۱ |
| ۲۲۔ ریکلیمیشن فارم میاں چنوں خانیوال | ۵۰۰ | |
| ۲۳۔ یوسف والا فارم | ۱۵۰۰ | |
| ۲۴۔ شاہ جیونہ لائف اسٹاک فارم جھنگ | ۵۹۹ | |
| ۲۵۔ ریسرچ فارم ملتان | | |
| ۲۶۔ توسیع ریسرچ فارم ملتان | ۱۹۴ | |
| ۲۷۔ کاٹن ریسرچ فارم ملتان | | |
| ۲۸۔ ایگرونومسٹ ریسرچ فارم خانیوال | ۱۰۰ | |

جب اس صدی کے شروع میں اوکاڑہ ملٹری فارم پر فوج نے کرپشن ختم کرنے کے نام پر مزارعیت کو ٹھیکے داری میں بدلنے کی کوشش کی تو مزارعین نے اس کی بھرپور مزاحمت کی۔ یہ قدم

دراصل فوج کی طرف سے کئی نسلوں کے کاشت کاری کرنے والے مزارعین کو بے دخل کرنے کا یک حربہ تھا۔

مزارعین اور پولیس، ایف سی وغیرہ کے درمیان تصادم کے نتیجے میں چند مزارعین مارے بھی گئے۔ عورتوں، بچوں اور مزارعین کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے گئے اور انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اس کے علاوہ غریب مزارعین کے دیہاتوں اور گھروں کا محاصرہ کر کے ان کا پانی اور بجلی بند کردی گئی۔ اسی طرح نہری پانی بند کر کے فصلیں تباہ کردی گئیں۔

## مزارعین کا موقف

نہری نظام آنے سے قبل یہ علاقہ بنجر ہوا کرتا تھا جسے موجودہ مزارعین کے آباؤاجداد نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے قابلِ کاشت بنایا اور بٹائی نظام کے تحت کاشت کاری کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی چوتھی نسل یہ کام سرانجام دے رہی ہے۔ یہ نظام کسی حد تک منصفانہ تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں کاشتکار کو نفع اور نقصان میں سانجھے داری کا حق حاصل ہوتا ہے۔ مزارعین گذشتہ کئی دہائیوں سے ان زمینوں کے مالکانہ حقوق کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ مگر زمین ملنا تو درکنار جون ۲۰۰۰ء میں ملٹری حکام نے بٹائی سسٹم کو ٹھیکیداری نظام میں بدلنے کا یکطرفہ فیصلہ کرلیا حالانکہ زمین کی قانونی ملکیت ان کے پاس نہ تھی اور نہ ہی حکومتِ پنجاب نے لیز میں توسیع کی تھی۔ یہ صورتِ حال زمین پر ایک صدی سے آباد مزارعین کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے اور انہوں نے ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء سے اپنی احتجاجی تحریک کا باقاعدہ آغاز انجمن مزارعین پنجاب کی قیادت میں کیا اور اس روز تقریباً ایک ہزار مزارعین ڈپٹی کمشنر اوکاڑہ کے دفتر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور انہوں نے ٹھیکیداری نظام کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انتظامیہ نے مزارعین کی قیادت کو گرفتار کرلیا۔ جس پر سارے چکوک کے لوگ ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچے اور گھیراڈال لیا جس میں خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد بھی تھی۔ ایک طرف مزارعین بٹائی نظام کو جاری رکھنے کے لیے جدوجہد کررہے تھے تو دوسری طرف سول، ملٹری حکام نے مزارعین کو زبردستی ٹھیکیداری نظام قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اوچھے اور گھناؤنے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کردیئے جن میں ان کے نوجوان لڑکوں کا اغوا اور مزارعین کے دامادوں کو ان کی بیٹیوں کو طلاق دینے پر مجبور کرنا

شامل تھا۔

۹/اکتوبر ۲۰۰۰ء کو ملٹری فارم اوکاڑہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے مقامی پولیس سے مدد طلب کی اس کا موقف یہ تھا کہ مزارعین فارم کے زیرِ انتظام علاقے سے لکڑی نہیں اٹھانے دے رہے۔ مقامی پولیس نے اپنی مدد کے لیے فرنٹیئر کانسٹیبلری اور ایلیٹ فورس کو طلب کرلیا جس کی کسانوں نے مزاحمت کی اور ان پر پتھر برسائے۔ پولیس کا موقف یہ ہے کہ اس سے سرکاری املاک کو نقصان پہنچا۔ مزارعین کے خلاف مقدمات بنائے گئے اور ان کو گرفتار کرلیا گیا۔

جنوری ۲۰۰۲ء کو چک نمبر آر۔بی۔ا/۲۱ میں مزارعین، ان کی عورتوں، بچوں اور پیراملٹری فورسز کے مابین ایک تصادم ہوا۔ مزارعین پر گولی چلائی گئی اور آنسو گیس کے شیل پھینک گئے، جس کے نتیجے میں بہت سارے لوگ زخمی ہوئے اور ایک شخص کی موت بھی ہوگئی، اسی طرح ۲۴/اگست کو رینجرز کی فائرنگ سے دو کسان ہلاک اور بہت سارے کسان زخمی ہوگئے۔

۲۰۰۵ء میں جب اوکاڑہ کے مزارعین کو فوج نے دوبارہ بے دخل کرنے کی کوشش کی تو ان مزارعین نے مزاحمت کر کے پاکستان کی کسان تحریک میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا۔ اس میں سب سے اہم عنصر یہ تھا کہ گو اوکاڑہ ملٹری فارم کے مزارعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا مگر مزارعین نے سیاسی پختگی اور شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذہب کو کسی بھی حوالے سے کسان تحریک پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

## انتظامیہ کا موقف

فوج کے ذمہ داروں کا یہ موقف تھا کہ بٹائی نظام کے تحت نقصان ہو رہا تھا کیونکہ ان کے بعض عہدیدار بٹائی کی رقم میں خورد برد کے مرتکب ہوئے جس کی وجہ سے ادارے کو رقم نہیں ملی۔ فوج کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ ٹھیکیداری نظام کے ذریعے کیش رقم حاصل کر کے نہ صرف اس نقصان کو پورا کرنا چاہتی تھی بلکہ وہ علاقے کی ترقی کے لیے بھی کام کرنا چاہتی تھی۔ جنرل شوکت سلطان کا اس سلسلے میں کہنا تھا کہ فوج ملٹری فارمز کے علاقے میں اسکول، اسپتال اور پختہ سڑکیں بنانا چاہتی تھی تا کہ آبادی کو جدید سہولیات میسر ہوسکیں۔ وہ اس بات کی بھی یقین دہانی کرواتے تھے کہ مزارعین کو ان زمینوں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا اور وہ شروع میں مزارعین کے ساتھ تین سالہ معاہدہ کرنے

کے لیے تیار تھے۔

فارم انتظامیہ خاص طور پر فیلڈ لیول کے لوگوں کی کرپشن کا اعتراف کرتی ہے۔ پہلے سے چلے آ رہے بٹائی سسٹم کو نئے ٹھیکیداری نظام میں بدلنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے انتظامیہ کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ یہ فیصلہ جی ایچ کیو نے دونوں پارٹیوں کے بہترین مفاد میں کیا۔ اس سے نہ صرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ انتظامیہ اور مزارعین دونوں کو کئی بدعنوانیوں سے بچنے میں بھی مدد ملے گی۔

دوسری طرف مزارعین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وہ موجودہ حالات میں کسمپرسی، غربت اور ذلت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انتظامیہ کا اتنا عمل دخل تھا کہ مزارعین ان کی اجازت کے بغیر پکے گھر بھی نہیں بنا سکتے اور نہ ہی بجلی لگوا سکتے ہیں۔

مزارعین کو فارم انتظامیہ کی جانب سے مہیا کی جانے والی اشیاء کے گھٹیا ہونے کی بھی شکایت تھی۔ کم معیار کی کھاد، ملاوٹ شدہ کیڑے مار ادویات اور سب سے بڑھ کر ان کی سپلائی میں ہونے والی تاخیر کسانوں کے لیے مشکلات کا سبب بنتی۔

جب ملٹری فورسز کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو ردِعمل میں مزارعین کی ایک منظّم تحریک کا آغاز ہوگیا اور گذشتہ چند سالوں کے دوران یہ تنازعہ شدت اختیار کرتا چلا گیا، حکومت نے امن و امان بحال کرنے کے نام پر رینجرز اور پولیس کو علاقے میں تعینات کر دیا جس کی وجہ سے تصادم کی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اب تک آٹھ مرد اور ایک عورت سدا مائی جو خانیوال سے تھی قانون نافذ کرنے والوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہید ہو چکے ہیں اور بے شمار افراد زخمی ہوئے ہیں ان میں سے کئی ایک معذوری کی زندگی گذار رہے ہیں۔ سینکڑوں مزارعین گرفتار کیے گئے اور جھوٹے مقدمات بھگت رہے ہیں۔ صورتِ حال کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن مزارعین پنجاب کے عہدیداروں کے خلاف ۷۰۰ سے زیادہ مقدمات درج کیے گئے اور حد تو یہ ہے کہ ان میں سے کچھ پر دہشت گردی کے الزامات تک عائد کیے گئے ہیں۔

ہر عوامی تحریک کی طرح اوکاڑہ کے کسانوں نے جدوجہد کے دوران مزارعین کا لہو گرمانے کے لیے شاعری کا سہارا بھی لیا۔ انجمن پنجاب مزارعین کی وائس چیئر پرسن روبینہ البرٹ نے جو نظم لکھی ہے وہ پیشِ خدمت ہے۔

سیاں نی اساں بڑیاں دلیر ساں
پھڑ کے ڈنڈے اساں بڑیاں شیر ساں
چلی سی گولی جدو ہوگئی بے چین سی
رینجرز والیا تینوں رب دی مار وے
گولی کیوں چلائی ساڈے ویر بیار وے
فیر جدوں کیتا زخماں لاچار وے
رینجر والیا تینوں ترس نہیں آندا
پھڑ لیا ویر ساڈا رستے وچ جاوندا
کتا گرداور کول کھلو کے کٹاوندا
رینجر والیو چھڈ باڈر کیوں آئے وے
اسی کی گوایا گھیرے کیوں پائے وے
منگنے آں حق تینوں ترس نہیں آئے وے
جنرل وے مہندی سدا شاہی نہیں رہندی وے
غریب عوام تیرے ترلے واپاوندی
اِک نہیں منی سدا بادشاہی نہیں رہندی وے
جنرل وے مہندی ساڈے کولکی لیونا
سانوں توں کٹوایا اساں دیاں تے بھیناں وے
سیاں نے بھیناں ساڈا وس نہیں چلے وے
واٹ دور یڈی ساڈا ویریاں ملے نیں
کفن دے ٹوٹے ہن بنھ لیے پلے وے
مشرف وے ظالماں تنوں خبر نہ کائی وے
رینجر تے تیری چھڈ باڈر دے آئی اے
رینجر والیا توں رب توں نہیں سنگ دا
ماردتا ویر ساڈا حق سی منگدا

کتا گرداور سپ بن کے دنگدا

اس کے علاوہ تحریک کے شاعر الفت دلدار کی نظم بھی سنیں۔

ساڈے تے ظلم دیاں حداں مک گیاں نیں
رینجر پولیس ہتھوں راہواں رک گیاں نیں
اکھاں دے سامنے لال کھوائے نیں
دھرتی ماں بچیاں نے مل تیرے پائے نیں
پنج پشتیاں جو تیرے وچ لکھ گیاں نیں
جیل وچ، تھانیاں وچ جیل حراستاں
گھراں وچ دکھاں دیاں جنجاں ڈھک گیا نیں
ساڈے تے ظلم دیاں حداں مک گیاں نیں

پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ زرعی معاشرے سے وابستہ باشعور لوگ منظم ہو کر اپنے حقوق کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس تحریک میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ شریک رہیں اور کئی مرحلوں پر انہوں نے جدید ہتھیاروں سے لیس رینجرز کو کپڑے دھونے والے ڈنڈوں کی مدد سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مسیحی اور مسلم نے بغیر کسی امتیاز کے مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس علاقے میں چالیس فیصد کرسچن اور ساٹھ فیصد مسلم لوگ آباد ہیں اور ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔

انجمن مزارعین کی نائب صدر محترمہ روبینہ البرٹ کے بقول:

'جب لاہور سے لوگ ہمارے پاس آتے تھے تو بڑی مشکل سے پہنچتے تھے، ان کو کوئی راہ میسر نہیں ہوتا تھا کہ کہاں سے جائیں، ہر جگہ ناکے لگے ہوتے تھے۔ مزارعین میں وہ قوت ہوتی تھی کہ ناکے توڑ کر اپنے اکٹھ میں پہنچتے تھے، جب چار چک میں گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور سلیمان شہید ہوا، میرا تعلق ۴۵ سے ہے اور مارے چارٹرالے روانہ ہوئے ہمیں فون آیا کہ انہوں نے تیرہ چک میں گھیرا ڈالا ہوا ہے اور ۴۵

ترانا کے روڈ سے تیرہ چک میں پہنچا اور سب سے پہلی فائرنگ رینجرز والوں نے مجھ پر کی تھی، آنسو گیس کے اثرات سے بچنے کے لیے ہم لوگ اپنے پاس نمک اور پانی رکھتے تھے اور وہ دوپٹے اور تولیہ گیلے کر کے رکھتے تھے جن کے پاس یہ انتظام نہیں ہوتا تھا وہ بے چارے بے ہوش ہو جاتے تھے۔'

انجمن مزارعین اور انتظامیہ کے درمیان مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی دفعہ مذاکرات بھی ہوئے ہیں۔

'آخر میں مذاکرات کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں کہ ۲۰۰۰ء جون میں میجر قمر زمان چٹھہ سے ہمارے مذاکرات ہوئے تھے وہ ہمیں مجبور کرتے رہے کہ ہم ٹھیکیداری نظام پر آجائیں لیکن ہم ڈٹے رہے کہ ہم نے ٹھیکہ نہیں دینا۔ ان کا کہنا تھا کہ بہتر ہے کہ آپ پانچ روپیہ ہی ٹھیکہ دے دیں۔ وہ ہمیں ٹھیکیدار بنانا چاہتے تھے، ہماری خواتین نے کہا تھا کہ کرنل سلیم تمہیں ایک روپیہ بھی ٹھیکہ نہیں دیں گے۔ ۲۰۰۱ء جنرل حسین مہدی کے ساتھ لاہور میں مذاکرات ہوئے تھے اور ۲۰۰۳۔۲۰۰۰ء تک ریونیو بورڈ، پھر گورنر خالد مقبول سے مذاکرات ہوئے تھے۔ ان کو بھی یہی جواب دیا تھا۔ اتنا مجبور نہ کرو ہم نے پاکستان میں رہ کر مرنا ہے۔ پاکستان کو کتنے سال ہو گئے ہیں آزاد ہوئے صرف ہمیں ہی آزادی نصیب نہیں ہے۔

مزاحمت کے دوران کسان عورتوں نے کہا، 'تھاپا' گاؤں میں لوگ جس سے کپڑے دھوتے ہیں، ہم نے اس سے رینجر کو دھویا ہے تب ہماری خلاصی ہوئی تھی، گولیوں سے ہمارے بھائی شہید ہوئے تھے۔ جو باقی بچے ہیں وہ 'تھاپے' کی مدد سے بچے ہیں، ورنہ جو رہ گئے وہ بھی شہید ہوتے۔'

اس تحریک کی سب سے اہم باتیں مندرجہ ذیل ہیں:

- مزارعین کی مزاحمت سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

- پاکستان کے تمام باشعور عناصر (تنظیموں اور افراد) نے اوکاڑہ ملٹری فارم کے مزارعین کو ہر قسم کی بروقت اخلاقی امداد فراہم کر کے فوج اور انتظامیہ کو مزارعوں کو بے دخل نہ کرنے دیا۔ بلکہ اس میں بین الاقوامی حمایت کا بھی عمل دخل تھا۔
- مزارعین نے مشترکہ جدوجہد سے نہ صرف حکومت کو انہیں بے دخل نہیں کرنے دیا بلکہ ٹھیکیداری نظام بھی رائج نہیں ہونے دیا۔
- کسان عورتوں نے اتنی بڑی سطح پر کسی بھی جدوجہد میں اتنا متحرک کردار پہلے کبھی ادا نہ کیا تھا۔
- مسیحی اور مسلمانوں نے مذہب سے بالاتر ہو کر اپنے حقوق کے لیے مشترکہ جدوجہد کی۔

اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں تو ہمیں خود احتسابی عمل میں یہ بات واضح نظر آئے گی کہ بعض عناصر نے 'مالکی یا موت' جیسے انتہاپسند نعرے دے کر مزارعوں کی تحریک کو ایک غلط رنگ اور انداز دینے کی کوشش بھی کی مگر شکر ہے کہ نوبت بہت بڑے پیمانے پر خون خرابے کی صورت تک نہ پہنچی۔

یہ تحریک اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ فوج اپنی مرضی کا ٹھیکیداری نظام رائج کر کے اوکاڑہ ملٹری فارم کے مزارعوں کو بے دخل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور آج بھی صورتِ حال جوں کی توں ہے۔ یعنی مزارعین نہ تو فوج کو بٹائی دیتے ہیں اور نہ فوج ان کو بے دخل کر سکی ہے مگر پاکستان کی سول سوسائٹی کی جانب سے اخلاقی امداد ایک مسلسل عمل کی صورت اختیار نہ کر سکی۔

اس تحریک کا سب سے مثبت اور قابلِ فخر پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلمان اور مسیحی مزارعین نے مل کر جدوجہد کی۔ اس کے علاوہ عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا اور بلکہ عورتوں نے اپنے مخصوص کپڑے کے لکڑی کے ہتھیار 'تھاپی' کے استعمال سے مسلح پولیس کا مقابلہ کیا اور خوف کم کیا۔ پاکستان اور غیر ملکی سول سوسائٹی کی بروقت مداخلت اور یکجہتی مثبت اور مؤثر اقدام ثابت ہوا۔

مالکی یا موت جیسے انتہاپسند نعروں سے بچنا یقیناً بہت ضروری ہے۔ فوج تحریک کو مختلف حربوں سے کچھ حد تک تقسیم اور کمزور کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ تحریک اپنے علاقوں کے مقامی سیاست دانوں اور منتخب عوامی نمائندوں کی حمایت حاصل نہ کر سکی۔ پنجاب میں کسان تحریک کا بنیادی رخ صنعت کے پھیلاؤ خاص کر شوگر ملیں لگنے کے بعد گنے کی قیمت اور کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کی طرف ہو گیا۔ پاکستان میں بدقسمتی سے کسی بھی خطے میں جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی کوئی منظم تحریک نہ چل سکی۔ میں اس کی وجوہات میں نہیں جاتا (ہشت نگر کی کسانوں کی جدوجہد بھی

جاگیردار کے خلاف نہ تھی)۔ ابھی چند ہفتے پہلے خانیوال میں مزارعین نے لانگ مارچ شروع کیا جس کے جواب میں پولیس نے ان کے بہت سارے کارکن گرفتار کر لیے اور ان کا راستہ روکنے کے لیے طاقت کا استعمال بھی کیا۔ سیاسی قیادت اور وزیراعلیٰ پنجاب کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں سارے کارکن رہا کر دیئے گئے ہیں اور سرکار نے مزارعین کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ کیا ہے دوسری طرف انجمن مزارعین نے مالکی اور موت کی جگہ 'جھیڑ او اوے او ہی کھاوے' کا نعرہ بلند کیا ہے۔

# فریادِ بلوچستان، شمس گردی اور مگسی ایجی ٹیشن

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

''آج ساری دنیا شاہراہ ترقی پر گامزن ہے، مگر بلوچستان کچھ ایسا سویا ہوا ہے کہ جاگنا محشر کو معلوم ہوتا ہے بلوچستانیوں سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ خدا کے لیے ساری دنیا کو ہنسنے کا موقع نہ دیجیے، یہی وقت ہے اگر اسلاف کا خون آپ میں موجود ہے اٹھیے اور اس طرح اٹھیے جس طرح آپ کے اسلاف اٹھا کرتے تھے، سیاسی غلامی کی زنجیریں، ایک نعرہ حریت لگا کر توڑ ڈالیے اور قوموں کے لیے مشعل راہ بن جائیے، باہمی حسد و رقابت اور ان لغویات کی بیخ کنی کیجیے اور صرف اس آتش رقابت سے اپنے سینوں کو منور کیجیے کہ جنگ آزادی میں تم سے زیادہ کوئی بہادر نہ نکلے اور تم سے پہلے کوئی جام شہادت نوش نہ کرے۔ خدا کے لیے بزدلانہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کو مٹائیے اور دیکھیے تاریخ کیا کہتی ہے؟ مادرِ وطن کی قربانیوں سے سبق سیکھیے۔''(۱)

درج بالا بیان 2011 کا نہیں بلکہ 1929 کا ہے، جب ایک غیور بلوچ قبیلے مگسی، جسے غلط العام طور پر مگسی کہہ کر پکارا جاتا ہے، کے ایک فرزند یوسف عزیز نے اپنے معروف سیاسی مقالے ''فریادِ بلوچستان'' کا حصہ بنایا تھا۔ یہ مقالہ لاہور کے ایک اخبار 'مساوات' (یہ بھی موجودہ 'مساوات' نہیں تھا) میں 17 نومبر 1921 کو شائع ہوا تھا۔ اس مقالے کی اشاعت کے بعد اس کے مصنف کے ساتھ کیا سلوک ہوا، اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ سرِ دست، اس شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا ہے:

آج سے تین برس پہلے 2008 میں، جب میں ان کی 100 ویں سالگرہ کے موقع پر، اپنے دل میں ایک تنہا، خاموش شمع روشن کر رہی تھی تو میرے دل میں یہ تمنا جاگی تھی کہ ایک دن میں اپنے قبیلے کے اس نوجوان شہید کے نقشِ قدم تلاش کرتی اس کا مکمل چہرہ دنیا کے سامنے لاؤں گی۔ آج میں ان کی شخصیت کے ایک دو رُخ سامنے لا رہی ہوں۔

تاریخ اور عوام کے تناظر میں میری یہ گفتگو بلوچستان کی ایک اہم تحریک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ تحریک بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اُبھری اور چوتھی دہائی کے اوائل میں ایک بڑے ایجی ٹیشن میں تبدیل ہوگئی۔ یوسف عزیز اس تحریک کے رُوحِ رواں تھے، جو اپنی تعلیمی خدمات، عوامی شاعری اور بلوچستان کے پہلے افسانہ نگار ہونے کی شہرت کے ساتھ ساتھ ایک نمایاں سیاسی اور انقلابی رہنما کے طور پر سامنے آئے اور عین عالمِ جوانی میں 'جاں سے گزر گئے'۔

## جلاوطنی

یوسف عزیز نواب قیصر خان کے ہاں 1908 میں بلوچستان کے علاقہ جھل مگسی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے علاقے کی پسماندگی کے باوجود یوسف اور دوسرے دو بیٹوں کی جدید تعلیم کے لیے معقول انتظام کیا اور انہیں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم کے لیے اساتذہ مقرر کیے۔ بلوچستان کے لیے یہ ایک پُر آشوب زمانہ تھا۔ ابھی وہ صرف چودہ سال کے تھے جب 1922 میں یوسف کے والد نواب قیصر خان کو قلات کے وزیراعظم شمس شاہ کے غیض وغضب کا شکار ہو کر اپنی موروثی نوابی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ 1923 میں وہ ملتان جلا وطن کردیے گئے۔ یوسف بھی ان کے ساتھ جلاوطن ہوئے۔ 1927 میں جلاوطنی کے دوران ہی نواب قیصر خان کا انتقال ہوگیا اور وہ بہاء الدین زکریا کے پہلو میں دفن ہوئے۔ پنجاب کے ضلع گجرات سے تعلق رکھنے والے سرشمس شاہ نے مگسی قبیلہ کے تمام اختیارات پر بھی قبضہ کرلیا۔

نوابزادہ میر یوسف علی خان کو ملتان میں جلاوطنی کے دوران قومی سیاست کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ انڈیئین نیشنل کانگریس آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھی۔ بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا لاہور سے نکل کر ملتان، لائلپور، گجرات اور پنجاب و یوپی کے کئی شہروں تک پھیل چکی تھی۔

اس انقلابی جماعت پر سوویت یونین کے سوشلسٹ انقلاب کا خاصا اثر تھا۔ نو جوان یوسف بھی ان تبدیلیوں کا اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔

## فریادِ بلوچستان

والد کے انتقال اور جلاوطنی کے خاتمے پر، کچھ عرصہ بعد وہ لاہور چلے گئے۔ لاہور میں وہ اقبال کی شاعری اور ان کے سامراج دشمن افکار سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ 1929 کا لاہور تھا۔ ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے لاہور میں قرارداد منظور کررہی تھی تو دوسری جانب بھگت سنگھ اور ان کی انقلابی پارٹی جن کاروائیوں میں مصروف تھی، انہیں انگریز حکمران دہشت گردی کا نام دے رہے تھے۔ جلد ہی بھگت سنگھ گرفتار ہوگئے تو قائداعظم محمد علی جناح نے کامل ہند لیجسلیٹو اسمبلی میں بھگت سنگھ کے لیے آواز بلند کی۔ اقبال نے بھی انقلابیوں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے انہیں مجرم قرار نہ دیا جائے۔ اس آتشیں ماحول کو مولانا ظفر علی خان کی نظمیں اور بھڑکا رہی تھیں۔

یہ ماحول تھا، جب یوسف عزیز مگسی نے اپنا سیاسی مقالہ ''فریادِ ہندوستان'' کے عنوان سے قلم بند کیا، جو لاہور کے اخبار 'مساوات' میں 17 نومبر کو شائع ہوا۔ یہ وہی مقالہ تھا جس کا حوالہ میں نے اپنے مضمون کے آغاز میں دیا ہے۔ گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ:

> ''میر یوسف علی خان کے اس مضمون کا چھپ کر بلوچستان پہنچنا تھا کہ ایوان حکومت میں ہل چل مچ گئی۔ شمس شاہ وزیراعظم بھاگے بھاگے بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ سے ملے اور اسی دن میر یوسف علی خان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کروائے۔ چنانچہ اسی مضمون کے سلسلہ میں میر یوسف علی خان پر ''ریاستِ قلات میں بغاوت پھیلانے'' کا جرم لگا کر جون 1930 میں اسے گرفتار کرلیا گیا اور مقدمہ چلانے کی غرض سے اسے مستنگ کے جیل خانہ میں رکھا گیا۔ 17 جولائی 1930 کو قلات کے مقام پر سردار محمد خان شاہوانی، سردار سمندر خان محمد شئی، سردار بہرام خان لہڑی، سردار رسول بخش زرکزئی اور سردار رسول بخش مینگل پر مشتمل ایک

خاص جرگہ نے محمد یوسف علی خان کے مقدمہ کی سماعت کی۔"(۲)

جرگہ کوئی قانونی یا عدالتی نظام نہیں ہوتا بلکہ یہ قانون کی حکمرانی کو ایک تماشہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ یہی اس جرگہ کے ارکان نے بھی یہی کیا۔ بقول گل خان نصیر:

"اس نے رسمی طور پر بعض باتوں کا ذکر کرتے ہوئے رائے دی کہ" میر یوسف علی خان کا مضمون نادرست اور غلط ہے اور اس قسم کے مضمون کا اخبار میں چھپوانا ریاست قلات کے لوگوں میں سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ جرگہ نے میر یوسف علی خان پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اس مضمون کے علاوہ میر یوسف علی خان دیگر طور سے بھی ریاست قلات کے انتظام میں خلل اندازی اور بدامنی پھیلانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کو باپ کی میراث سے کثیر روپیہ مل گیا تھا اور اس نے کانگریسی خیالات اور بلوچستان کے بعض بدخیال اشخاص کی سازش سے متاثر ہوکر اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔"

جرگہ نے ان وجوہات کی بنا پر میر یوسف علی خان کو سردار رسول بخش زرکزئی کی زیرنگرانی جو اس کا ماموں تھا۔ ایک سال بمقام گٹ زہری نظر بندی، بارہ ہزار نو سو روپے جرمانہ اور دس ہزار ضمانت نیک چلنی داخل کرنے کی سزادی۔(۳)

عزیز احمد بگٹی کی روایت کے مطابق:

"مگسی صاحب جن دنوں اس مقدمے کے سلسلے میں مستونگ جیل میں تھے، تو میر عبدالعزیز کُرد کے ساتھیوں نے ان سے خفیہ رابطہ قائم کیا۔ یہ لوگ "انجمن اتحاد بلوچاں" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کر چکے تھے۔ مگسی صاحب کے پاس لٹریچر کی آمدورفت شروع ہوئی۔ خیالات کا تبادلہ ہونے لگا وہ نہ صرف فکری طور پہ ترقی کر گئے بلکہ اس رابطے نے مگسی صاحب کے لیے وہ حالات اور اسباب بھی پیدا کر لیے کہ وہ عملی سیاست میں قدم رکھیں۔"(۴)

## انجمن اتحاد بلوچ و بلوچستان

رہائی کے فوراً بعد یوسف عزیز نے میر عبدالعزیز کُرد سے رابطہ کیا۔ ان دونوں کے اشتراک سے "انجمن اتحاد بلوچ و بلوچستان" وجود میں آئی۔ یوسف عزیز اس کے صدر اور عبدالعزیز کُرد جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نوابزادہ عبدالرحمان خان بگٹی اس کے نائب صدر مقرر کیے گئے۔ اجلاس میں بلوچستان کے سماجی و سیاسی حالات پر بھرپور بحث ہوئی جس کے نتیجے میں مندرجہ ذیل قرار دادوں کی منظوری دی گئی۔

۱۔ بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ

۲۔ روایتی بلوچ سرزمین کا ازسر اتحاد

۳۔ ایک آزاد، خودمختار اور متحدہ بلوچستان

اس اجلاس میں انجمن اتحاد بلوچستاں نے مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں منتخب پارلیمنٹ قائم کی جائے۔ خان کی بادشاہت کے تحت ایک ذمہ دار آئینی کابینہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ دیگر مطالبوں میں تعلیم کا پھیلاؤ اور غیر استحصالی نظریات پر مبنی اسلامی معاشرے کا قیام شامل تھے۔ یہ ایک بڑا سیاسی آغاز تھا۔ بلوچستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک باضابطہ اور منظم سیاسی جماعت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ 'فریادِ بلوچستان' کا ایک مثبت اور عملی جواب تھا۔

## شمس گردی

انجمن اتحاد بلوچاں نے اپنے قدم مزید آگے بڑھائے اور میر یوسف عزیز کی قیادت میں ایک ایسی سیاسی کارروائی میں حصہ لیا جو اس سے قبل بلوچستان کے لیے قطعاً نئی تھی۔ یہ کتابچہ شمس گردی کی اشاعت تھی۔ فریادِ بلوچستان کے بعد یہ دوسری سیاسی دستاویز تھی جسے یوسف عزیز اور عبدالعزیز کُرد نے مل کر لکھا تھا اس کے دیباچے میں یوسف عزیز مگسی نے لکھا:

> "یہ ایک قوم کی داستانِ بربادی ہے اور اس کا احساس بیداری ہے۔ بیسویں صدی کے ایک فرعون (شمس شاہ) کے لیے عصائے موسوی ہے۔ برادرانِ وطن کی بے حسی اور تن آسانی کے لیے ایک تازیانہ بیداری ہے اور فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدو پر کاربند ہے۔"

اس کی تمہید میں عزیز گرد ''ملک کی بدقسمتی سے میر شمس شاہ، حد سے زیادہ خوشامد پسند ہیں۔ ذاتی جاہ وجلال اور شخصی نام ونمود کے بہت بری طرح سے بھوکے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ ضرورت سے زیادہ درشت مزاج واقع ہوئے ہیں۔ عمر شریف 70 سال سے زیادہ ہوگئی ہے لیکن طبیعت میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ قبل کے اندر رعایا کسی اور بنی نوع انسان کے واسطے ہمدردی کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ شب و روز جابرانہ طریق پر خشمگین زندگی بسر کرنے کے ایسے عادی ہوئے ہیں کہ غریب اہلِ مقدمات اور سائلوں کے ساتھ بھی کمال رعونت آمیز اور نازیبا طریق سے کلام کیا جاتا ہے۔''(۵)

شمس گردی'' شمس شاہ کے خلاف ایک عوامی چارج شیٹ تھی جس میں اس کے مختلف جرائم ،کرپشن، کسانوں پر مظالم، حقوقِ ملازمت میں رعایا کشی، نظام عدالت میں ابتری، تعلیم کے فقدان خزانے کی بربادی۔۔۔۔ کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔ ضروری ہے کہ ان میں سے چند ایک سیل کا یہاں ذکر کیا جائے۔

کسانوں پر ہونے والے مظالم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کتابچے کے مصنفین نے لکھا کہ :

''جس دن مدعو شدہ انگریز حاکم نے مقررہ مقام پر تشریف لانا ہوتا۔ اس دن بیس، پچیس میل تک سڑکوں پر حفاظتی آدمی بہ لحاظ خوشامد کھڑے کیے جاتے جو تمام بیگاری ہوتے تھے۔ ان غریبوں کو صبح سے شام تک بھوکا اور پیاسا رکھ کر سڑکوں پر خوار خراب کیا جاتا۔ اکثر سرکاری عمارت کی تعمیر میں اجرتی مزدوروں کے دوش بدوش بیگاری کسانوں کو بھی بھوکا اور پیاسا رہ کر مفت اور بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا تھا۔

''کچھی ضلع کے طول وعرض میں جہاں تک سڑکیں بنی تھیں ان کو شروع میں بھی بیگار پر مفت تعمیر کرایا گیا تھا اور تب سے ہمیشہ کے لیے یہ عام دستور ہو گیا تھا کہ جب بھی ضرورت پڑتی، ان سڑکوں کی درستی اور مرمت ان کسانوں سے جبراً کروائی جاتی ہیں جن کے علاقے میں سے یہ سڑک

گزرتی تھی۔

''تمام ایسے کاریزات پر بھی برابر مالیہ وصول ہوتا تھا جو منہدم ہو چکے تھے۔

''مقدمات آب و اراضی میں کورٹ فیس وصول ہونے کے باوجود متنازعہ پیداوار کو میانجی خانہ میں رکھنے کے واسطے تین روپے فیصدی مزید معاوضہ لیا جاتا تھا حالانکہ اس قسم کے اجناس کو سرکاری تحویل میں رکھا بھی نہ جاتا بلکہ دوکاندار لوگوں کے پاس امانتاً رکھوایا جاتا اور ان کو بھی کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔

''موسم خزاں میں باغات کی برگ ریزی کے موقع پر پہلے کوئی مالیہ مقرر نہ تھا لیکن پھر وزیراعظم نے برگ ریزی پر بھی نیا محصول لگا دیا۔

''اس نے ایستادہ فصلات، آلو، پیاز وغیرہ پر بھی ''محصول جمعداری'' کے نام سے ایک نیا ٹیکس لگا دیا۔

''اس نے کچھی کے علاقوں میں کپاس پر بھی ٹیکس لگا کر کسانوں کی کمر توڑ دی۔(٦)

اسی طرح عدالتی نظام کے حوالے سے مندرجہ ذیل زیادتیوں کی نشاندہی کی گئی:

''عدالتوں میں رشوت ستانی کا دور دورہ تھا۔ معمولی محرر بھی جب تک روپیہ، آٹھ آنہ غریب اہل مقدمات سے نہ لیتے ان سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔

''پھر معمولی معمولی مقدمات میں (جو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر فیصلہ پا سکتے تھے) وہ ابتدائی دریافت میں ہی سالہا سال تک معلق رہتے تھے۔ ہر مسل کا وزیراعظم کے پاس جانا ضروری ہوتا۔ اس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں مرکوز رکھ کر اس ستر سالہ بوڑھے شخص کے لیے کام کو وقت پر نمٹانا ممکن ہی کہاں تھا؟۔

> ”چنانچہ اہل مقدمات دعویٰ دائر کرنے کے بعد دو تین سال دفتروں کی خاک چھان کر اور منشیوں کی منت خوشامد کر کے تھک جاتے تھے۔“(۷)

خزانے کو کس طرح لوٹا اور برباد کیا گیا، اس بارے میں مصنفین کا کہنا تھا کہ :

> ”چار چار پانچ پانچ سال سے دربار کے بجٹ میں منظور شدہ مدارس وغیرہ کی تعمیر نہ کر کے وہ پیسے شمس شاہ نے بچا رکھے تھے۔ بجٹ میں ملازموں کے لیے جو تنخواہیں مقرر تھیں، وہ ان سے لوگوں کو کم دیکر اس صورت میں بھی روپیہ بچاتا تھا۔ نہ تو نئے سال کا بجٹ کسی کونسل میں پیش ہوتا تھا اور نہ ہی گزشتہ سال کے اخراجات پر کوئی پڑتال ہوتی تھی۔ عرصہ تک وزیراعظم صاحب اسی طرح خوب بے دردی سے حسب ذیل صورتوں میں ریاست کا سرکاری روپیہ ضائع کرتے رہے۔
>
> ۱۔ گھوڑوں کی آمدورفت کا ریلوے کرایہ وغیرہ
>
> ۲۔ وزیراعظم کے لیے ریزرو فرسٹ کلاس بوگی کا گراں قدر کرایہ آمدورفت۔
>
> ۳۔ قیام بر مقامات ہارس شو کے معاوضے میں روزانہ تحصیل ہالنگ والاؤنس
>
> ۴۔ عملہ کی آمدورفت کا سفر خرچ۔
>
> ۵۔ اپنے ہمراہ ریاست کے موٹر لے جانا جس کا ریلوے کرایہ آمدورفت و خرچ پٹرول وغیرہ۔“(۸)

بلوچستان میں دورِ استبداد کے خلاف یہ پہلی آواز تھی، جسے دبانے کے لیے تمام نوآبادیاتی مشینری حرکت میں آ گئی۔ 20 نومبر 1931 کو شائع ہونے والے اس کتابچے نے حکمرانوں کی آتش غضب مزید بھڑکا دی۔

> ”کتابچے کی زبان انتہائی تلخ تھی اور اس میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔“(۹)

کتابچہ ایک سیاسی اظہار تھا۔ ”مگسی سمجھتے تھے کہ بلوچ اتحاد اور بلوچستان کی آزادی کا انحصار بلوچ معاشرے میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں پر ہے(۱۰)۔ یہ کتابچہ ایک طرح سے یوسف عزیز مگسی کا سیاسی منشور تھا۔ جس پر وہ اپنی آئندہ سیاست کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ کتابچے کے ردِعمل

میں شمس شاہ نے دوبارہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کروادیے لیکن وہ کسی طرح بچ کر نکل گئے اور جیکب آباد پہنچ کر اپنا نیا سیاسی لائحہ عمل مرتب کیا۔

## مگسی ایجی ٹیشن

سر شمس شاہ کے جبر کا جواب عوامی سیاسی عمل تھا۔ حکیم بلوچ کے بیان کے مطابق:

''میر یوسف علی خان قلات کے وزیر اعظم شمس شاہ کو ذمہ دار حکومت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ قلات کی تمام بے اعتدالیوں، کرپشن اور مظالم کی بنیاد اسی کو جانتے تھے اس لیے مگسی صاحب نے اپنے جھل مگسی کے علاقہ سے انجمن اتحاد بلوچستان کے ذریعہ ایک ایجی ٹیشن کا آغاز کیا جس میں وزیر اعظم قلات شمس شاہ کے خلاف بھرپور تحریک شروع کردی گئی تو مگسی قبائل کے ہزاروں افراد ریاست قلات کی حدود سے نکل کر سندھ ہجرت کر گئے۔''(۱۱)

اس عوامی ایجی ٹیشن نے شمس شاہ کے اقتدار کے مرکز کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں، اس کے مخالف شہزادہ اعظم جان خان قلات بن گئے۔ ان کے اقتدار سنبھالتے ہی شمس شاہ کو اقتدار سے دخل ہونا پڑا اور اس کی جگہ بہادر گل محمد خان قلات کے نئے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ نیا خان قلات ذمہ دار حکومت قائم کرنے سے وعدے سے پھر گیا اور میر عبدالعزیز کرد کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔

## بلوچ قومی کانفرنسیں

لیکن میر یوسف اور عزیز کرد ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا سیاسی عمل مزید تیز کردیا۔ میر گل خان نصیر کے لفظوں میں:

''میر یوسف عزیز مگسی کی انتھک کوششوں سے دسمبر 1932 میں جیکب آباد سندھ میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ـــ۔ کانفرنس 27-28 اور 29 دسمبر 1932 تین دن تک نہایت کامیابی سے جاری

رہی۔ اس کانفرنس میں بلوچستان کے تمام اضلاع سے مندوبوں کے آنے کے علاوہ بعض سیاسی اور اصلاحی تنظیموں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی مثلاً انجمن اتحاد بلوچاں ہند، انجمن اتحاد بلوچاں بلوچستان، انجمن اتحاد بلوچاں سندھ وکراچی، انجمن انیس مکران، لوکل ایسوسی ایشن بلوچستان، جمعیت العلما سندھ، مجلس احرار السلام، انجمن مجاہدین اسلام جیکب آباد، انجمن اسلامیہ شکارپور۔ ان کے علاوہ بلوچستان سے بعض مقتدر ہستیوں نے بھی شمولیت کی جس سے کانفرنس کو مسلمہ طور پر ایک نمائندہ حیثیت ملی۔ بقول مُرید حسین مگسی ''گوناگوں مشکلات اور بلوچوں کے جمود وتساہل کے باجود آل انڈیا بلوچ کانفرنس کو ایسی بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی جس کی نظیر بلوچستان کی دوصد سالہ تاریخ پیش کرنے سے قاصر۔'' (۱۲)

جیکب آباد کے بعد حیدرآباد میں بھی 1932 اور 1933 میں بلوچ قومی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان تمام اجلاسوں میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

۱۔ بلوچستان کے متعدد حصوں کا اتحاد اور مکمل سیاسی آزادی کا مطالبہ

۲۔ سرداریت کا خاتمہ

۳۔ عورتوں کو اسلامی طریقہ سے میراث میں حصہ

۴۔ ڈیرہ جات وجیکب آباد کی بلوچستان میں شمولیت

۵۔ برطانوی بلوچستان کو صوبائی درجہ اور اصلاحات دیئے جانے کا مطالبہ

۶۔ بلوچستان میں مفت تعلیم کا اجراء۔ نئے سکولوں اور کالج کے قیام کا مطالعہ

۷۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی

۸۔ چھوٹی صنعتوں کا قیام

۹۔ قبائل رسومات مثلاً ولور اور لب پر پابندی اور کالا کالی کا خاتمہ

اس آخری مطالبہ سے مقصود عورتوں کے وقار کی بحالی اور ان کو اسلامی قوانین کے تحت حقوق وبرابری دلانا مقصود تھا۔ (۱۳)

## نواب مگسی اور سماجی اصلاحات

1932 میں نواب یوسف عزیز جھل مگسی کے نواب بنا دیئے گئے۔ اس سے قبل گل محمد خان کو نوابی سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس نوابی کے باعث انہیں جھل مگسی کے علاقے میں عوام کی فلاح و بہبود کا موقع ملا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری کے لفظوں میں:

> ''یہ کوئی معمولی سرداری نہ تھی۔ ایک اچھا خاصا وسیع علاقہ تھا، ایک اچھی خاصی افرادی قوت تھی جو یوسف عزیز مگسی جیسے انقلابی کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس زرخیز علاقہ اور کثیر آبادی پر مشتمل رعیت کی مطلق نوابی ملنا چھوٹی بات نہ تھی۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جہاں پر نواب یوسف عزیز کے گفتار اور عمل کے مابین موجود کوئی معمولی تضاد بھی اُبھر کر سامنے آ سکتا تھا۔ مگر مگسی صاحب نے اصلاحات کے بارے میں اپنے نظریات کو عملاً نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ بہت مختصر وقت میں:

### ۱۔ کیرتھر نہر:

آپ نے کیرتھر نہر بنوائی جس سے مگسی کا علاقہ سیراب ہوا اور مفلوک الحال لوگوں کو اپنی زراعت کو ترقی دینے کا عظیم موقع میسر ہوا۔

### ۲۔ نیا شہر:

مگسی صاحب نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی، جس کا نام ''کوٹ یوسف علی خان'' رکھا۔

### ۳۔ ڈسپنسری:

غریب عوام کے علاج معالجے کے لیے ڈسپنسری بنوائی۔

### ۴۔ اسکول:

اس نئے شہر یعنی کوٹ یوسف علی خان اور پنجک میں آپ نے پرائمری اسکول قائم کیے۔

### ۵۔ جامعہ یوسفیہ :

اس بڑے انسان نے 15 اکتوبر 1933 کو جھل مگسی میں ''جامعہ یوسفیہ'' کی بنیاد ڈالی۔ اپنی ذاتی جیب سے پچاس ہزار روپیہ اس پر خرچ کر دیا۔ غریب بچوں کے لیے دارالاقامہ کا بندوبست کیا جہاں قیام و خوراک کا انتظام جامعہ کی طرف سے تھا آپ نے پانچ سال سے لے کر نو سال تک کے بچوں کی خاطر تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ (۱۴)

## دوبارہ جلاوطنی

جو سیاسی لہر بلوچستان میں ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ انگریز محسوس کرتے تھے کہ اس کے پیچھے یوسف عزیز مگسی کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے لاہور سے روزنامہ 'آزاد' کا اجراء کیا تھا۔ اس کے مدیر عبدالعزیز کُرد تھے۔ بقول گل خان نصیر:

> ''لاہور سے روزنامہ 'آزاد' کی اشاعت سے بلوچستان سے متعلق سیاسی مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا اس سے ریاست قلات اور برطانوی بلوچستان کے ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا۔ ان مضامین میں بلوچستان کے عوام کو انگریزی اقتدار اور سرداری نظام کے خلاف آئینی جدوجہد کی تلقین کی جاتی رہی۔ برطانوی حکومت اور خان قلات سے مطالبہ کیا جاتا رہا کہ :

۱۔ ریاست قلات میں عوام کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی قائم کی جائے۔

۲۔ بولان، شال (کوئٹہ) نوشکی اور نصیر آباد کے مستجار علاقوں پر برطانوی اجارہ داری منسوخ کر کے ان علاقوں کو ریاست قلات میں شامل کر دیا جائے۔

۳۔ لس بیلہ، خاران، مری بگٹی اور چاغی کے بلوچ قبائلی علاقوں کو جو قلات کے حصے میں، قلات کی قومی حکومت سے پھر وابستہ کیا جائے۔

ان مضامین کی اشاعت سے بلوچستان میں بھونچال آ گیا۔ میر عبدالعزیز کُرد اور عبدالصمد اچکزئی گرفتار کر لیے گئے اور انہیں لمبی سزائیں ہوئیں۔ اس دوران یوسف عزیز کو پہلے خریدنے کی کوشش کی گئی۔ اس پر ناکامی کے بعد انگریزی حکومت نے انہیں زبردستی انگلستان جلاوطن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گل خان نصیر کا خیال ہے کہ انہیں انگلستان جانے پر رضامند کر لیا گیا تھا، ایک اور

روایت کے مطابق:

''ترغیب وتحریص کی کوششیں ناکام ہوگئیں تو بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل سرنورمن کیٹر Norman Cater نے انہیں ملاقات کے لیے بلایا اور کہا:

''سردار صاحب'' نورمن نے ان سے کہا'' آپ نوجوان ہیں اور آپ نے احباب کے انتخاب میں عقلمندی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بارہ مہینوں کے لیے بلوچستان چھوڑ دیں اور ولایت کے سفر سے اپنی فکر کو وسعت دیں۔ آپ یورپ کیوں نہیں جاتے اور وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے کہ مغرب کیسا ہے؟''

یوسف علی خان عزیز مگسی نے احتجاج کیا ''میں اپنا وطن چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

''تمہیں ہر حالت میں وطن چھوڑنا پڑے گا۔'' سرنورمن نے کہا ''میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم بلوچستان میں رہو اور مشکلات پیدا کرتے رہو۔ اگر تم عقل مند ہو تو رضا کارانہ طور پر وطن چھوڑ کر باہر چلے جاؤ گے کسی شخص کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم نے اس معاملے میں میرے مشورے پر عمل کیا ہے۔''(۱۵)

لندن سے انہوں نے اپنے دوستوں کو جو خط لکھے، ان سے، ان کے جذبات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا:

''جلسے جلوس، جماعت بندی، اخبار نویسی یہ سب جمہوریت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ فرنگی استبداد کا یہ حال ہے کہ ہمارے رفقا کو قید و بند میں ڈال دیا گیا ہے اور ہمارے ہمدردوں کو بے روزگار کیا گیا ہے دربار سبی سے خطاب کیا جاتا ہے کہ چند شورش پسند اٹھے ہیں جو بلوچستان کی پُر امن فضا کو مکدر اور اس کے سکون کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔ آؤ ہم مل کر ان کا استقبال کریں۔''

یوسف عزیز نے ان دھمکیوں اور غیر انسانی پالیسیوں پر برطانوی استعمار کو ان لفظوں میں للکارا:

''ایسی آمریت کے دور میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا کہ آزاد بلوچستان کا جھنڈا بلوچستان کے سرحدی علاقہ گرم سیل میں گاڑ کر اپنی پرانی تاریخی بلوچی روایت کے تحت بلوچی لشکر لے کر فرنگی استعمار پر ہلہ بول دیا جائے۔''

اس پیغام نے بلوچستان کی سیاست میں ہیجانی صورت پیدا کر دی۔''(۱۶)

## وطن واپسی اور انتقال

''ولایت کے دوران قیام میں ان پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ محض سیاسی آزادی قوم کی تقدیر نہیں بدلتی، بلکہ اس کے لیے اقتصادی اور پیداواری طریقہء کار کو بھی بدلنا ہو گا لہٰذا وہ بلوچستان میں اشاعت تعلیم، ڈسپنسریاں اور گھریلو صنعتوں کے قیام کی ضرورت اور قبائلی نظام کو یکسر بدل دینے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے نئے سفر کا آغاز کریں۔ایک دوسرے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ 31 مئی 1935 کی صبح تھی، ہوا تھم گئی تھی، میر یوسف علی خاں عزیز مگسی کوئٹہ کے ریلوے ریسٹ ہاؤس میں محوخواب تھے، ساڑھے تین بجے کے قریب زلزلہ آیا اور نہ صرف کوئٹہ بلکہ بلوچستان کے مختلف علاقے خاک و خون میں غلطاں ہو گئے۔۔۔۔اور کوئٹہ کی شاندار عمارتیں، کچے مکان، اکہرے اینٹ اور ٹین کے چھت والے مکان اس طرح فرش زمین پر ڈھیر ہو گئے، گویا شہر کوئٹہ کبھی تعمیر ہی نہ ہوا تھا۔

اس زلزلے میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور ان میں بطل حریت میر یوسف عزیز مگسی بھی تھے۔''(۱۷)

## حوالہ جات


۱۔ عنایت اللہ بلوچ، ڈاکٹر، نومبر 2003، یوسف عزیز مگسی کا انقلابی ورثہ' اخبار اردو، اسلام آباد

۲۔ گل خان نصیر، 1993، تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) قلات پبلشرز، کوئٹہ۔ ص۔ ۴۰۴

۳۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۔ ۴۰۵

۴۔ بگٹی، عزیز احمد، تاریخ بلوچستان، شخصیات کے آئینے میں، کوئٹہ، ص۔ ۱۹۹

۵۔ شمس گردی، 1931 لاہور، ص۔ ٦

۶۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص۔ ۴۰

۷۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔

۸۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔

۹۔ )08, Back to the Fulure Oxford University Press, Karachi, P-146

۱۰۔ Marginality and Modernity, Oxford University Press, Karachi, P-234

۱۱۔ حکیم بلوچ، 2007 بلوچ قومیت: جانیت وسرداریت، گوشہ ادب، کوئٹہ، ص۔ ۹۸

۱۲۔ میر گل خان نصیر، 1982 بلوچستان ۔۔قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ

۱۳۔ عنایت اللہ بلوچ، ڈاکٹر، نومبر 2003، ص۔ ۵۷

۱۴۔ شاہ محمد مری، میر یوسف عزیز مگسی، ۲۰۰۹ء، سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ۔ ص نمبر ۹۳

۱۵۔ نمائندہ لیل ونہار، 21 جون 1970 فریاد بلوچستان ہفت روزہ لیل ونہار کراچی ص۔ ۱۴

۱۶۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔

۱۷۔ ۔۔۔ایضاً۔۔۔۔

# سفر در سفر، راہگزر، راہگزر، پاکستان کے خانہ بدوش تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر انور شاہین

اس کرۂ ارض پر انسان کا ظہور کب ہوا، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم یہ امکان غالب ہے کہ جب بھی انسان اس زمین پر آیا، تب سے آج تک وہ اس کی وسعتوں میں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔ یہ 'خانہ بدوشی' آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ خانہ بدوشی کی تاریخ ابتدائے آفرینش انسان اور ابتدائے ثقافت سے لامحالہ طور پر جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسانوں کے تہذیبی سفر کا ایک تقویمی جائزہ لیا جائے۔[1]

آج سے کوئی بیس لاکھ سال قبل افریقی جنوبی مانس پایا جاتا تھا جو اوزار ساز تھا، دو پیروں پر چلتا تھا۔ تقریباً پندرہ لاکھ سال قبل 'کھڑا آدمی' (homoerectus) اور سات لاکھ سال قبل 'باشعور آدمی' ارتقا پذیر ہوا۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں جدید انسان نے اپنے آپ کو برفانی ادوار کے تیسرے وقفے میں مستحکم کر لیا تھا۔ ان انسانوں کے آرٹ کے نمونے جو آج ملتے ہیں، ان کے کمالات ثقافت اور دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ آج سے چھ لاکھ سال قبل پوٹھوہار میں وادئ سون کی صنعت کا زمانہ شروع ہوا جو تقریباً دو لاکھ سال قبل درمیانی درجے میں داخل ہو گیا۔ ایک لاکھ سال قبل کا انسان گھوڑے، اونٹ، بیل، بھینس اور کتے کو پالتو بنانے اور سدھانے کا فن جانتا تھا۔ یہ قدیم پتھر کا زمانہ تھا جس میں خانہ بدوش غیر طبقاتی اشتراکیت پر مبنی سماج میں رہتے تھے۔ رہنے کے لیے غار اور اغلباً جھونپڑیاں بھی تھیں۔ ھوبل کے مطابق ابتدائی انسان نما جانور (hominid) نے جو کہ شکار اور غذا جمع کرنے پر زندہ تھا، بعد ازاں وسطی حجری عہد میں شکار اور

چارے پر زندہ رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ زراعت کی بھی ابتدا ہوئی جبکہ وسیع پیانے پر کاشتکاری کا نظام تو کانسی اور لوہے کے زمانے میں فروغ پایا۔ اس سارے زمانے میں انسانی جمعیتوں نے چرواہی خانہ بدوشی کا آغاز کر دیا تھا جو کہ ان کے لیے روزی حاصل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ تھی۔ کیونکہ ان کے حالات کے مطابق یہی موزوں ترین وسیلہ تھا' ایک طرزِ زندگی کے طور پر یہ نہ تو زراعت سے پہلے شروع ہوا اور نہ ہی بعد میں، بلکہ یہ ایک متبادل طریقہ تھا جس کو جب طبعی و سماجی حالات زیادہ سودمند بنا دیتے تو اختیار کر لیا جاتا تھا۔[۲]

۱۹۶۳ء میں شدگا ہو کا غار دریافت ہوا جس میں پینتالیس ہزار سے بیس ہزار سال قبل کے اوزار ملے ہیں۔ وادیٔ شنگھاؤ میں تنگ دروں اور گھاٹیوں میں آج ایسی غاریں ملتی ہیں جن میں آج بھی چرواہے آندھی و بارش کی صورت میں اپنے جانوروں کو لے جاتے ہیں یا گرمی میں ان کے سائے میں آرام کرتے ہیں۔ چیلاس کے علاقے میں جو تصاویر ملی ہیں ان سے ان شکاریوں کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے جو یہاں پچاس سے پندرہ ہزار سال قبل رہتے تھے۔ یہ وسطی حجری دور کی تصاویر ہیں۔ سرزمینِ پاکستان میں یہ شکار کرنے اور خوراک جمع کرنے والے انسان کا عہد تھا۔ پھر انسان نے پتھر کے درمیانی اور اخروی زمانے تک پہنچتے پہنچتے بہت سی مہارتیں اور علم سیکھ لیا۔ مثلاً آگ جلانا، پتھر سے اچھی تراش خراش کے اوزار بنانا، گوشت کو آگ پر بھوننا، کاشت کاری کرنا، کھالوں کے لباس پہننا اور جانوروں کو سدھانا اور پالتو بنانا۔ اوزاروں کی عمدگی اور کاشتکاری سے خوراک کی افراط ہونے لگی چنانچہ انسان نے ایک جگہ مقیم ہونا شروع کر دیا۔ خانہ بدوشی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی، بستیاں آباد ہونے لگیں۔

پاکستان میں پانچ سے چھ ہزار قبل مسیح میں وسطی حجری سماج کے آثار بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں ملتے ہیں جہاں قدیم اشتراکیت پر مبنی معاشرہ موجود تھا۔ تقریباً چھ ہزار سے ۳۸۰۰ قبل مسیح میں ذاتی ملکیت کا آغاز ہونے لگا تو یہی سماج غلام داری سماج کی جانب بڑھا۔ اس دور میں دیہاتوں کے آباد کار مٹی کے برتن بناتے تھے اور قدیم دیہی ثقافت کے امین تھے۔ ۳۸۰۰ قبل مسیح سے ۳۱۰۱ قبل مسیح کے عہد میں سماجی طبقات کا ظہور ہونے لگا اور انسان ترقی کے زینے پر چڑھتا گیا۔ جب دو ہزار سے ایک ہزار قبل مسیح کے زمانے میں آریاؤں نے برصغیر پاک و ہند کی زمین پر قدم رکھا تو یہاں قبائلی اقتدار پر مبنی قبائلی سماج موجود تھا جس میں حرکت پذیری کم اور اقامت

پذیری کا رجحان بڑھ چکا تھا۔

آریاؤں کا اصل وطن بقول رشید اختر ندوی کے، بلرطاغ اور مضطاغ سلسلۂ کوہ کی ڈھلوانوں میں واقع تھا۔ آریا دراصل کاشتکار تھے۔ انہوں نے زراعت کی تکنیک جاننے کے ساتھ ساتھ گھوڑے، کتے اور گائے کو بھی سدھالیا تھا۔ پیتل، سونے، لوہے اور چاندی سے واقف تھے۔ سینا پرونا جانتے تھے اور سڑکیں، پانی کے جہاز و مکانات بنانے کا ہنر آتا تھا۔ جب تک وہ اپنے وطن سے نہیں نکلے تھے خود کو اپنے مخالفین سے ممتاز کرانے کی غرض سے آریہ، بمعنی کاشتکار، کہلانا پسند کیا جبکہ ان کے مخالفین جو خانہ بدوش تھے گھوڑوں کے گلے ہانکتے تھے، اسی سبب سے انہیں تورانی کہا جاتا تھا۔ عربی مؤرخ سعودی کے مطابق مشرق و مغرب کی ساری اقوام ایک ہی نسل سے ہیں وہ سب ایک ہی زبان بولتی تھیں ور جب اپنے اصل وطن سے نکلی تھیں تو اس وقت تک وہ خانہ بدوش تھیں۔[۲] دیگر تاریخ دانوں نے ان سب قبائل کو خیموں میں رہنے والے بدو قرار دیا ہے۔ عرب علمائے تاریخ جو آج سے تقریباً ۱۰۵۰ سال قبل کے تھے اور سپرینڈر (۱۸۹۰ء) میں اس امر کی تصدیق کر چکے ہیں کہ انڈو آرین قبائل جب جودی پہاڑ سے متصل سرزمین سے نکل کر آگے چلے تو وہ خانہ بدوش تھے اور انہیں قدم قدم پر عراق، بختریہ اور آریانہ کی سرزمین پر غیر آریاؤں سے الجھنا پڑا۔[۳]

## خانہ بدوشی اور جغرافیائی ماحول

تاریخِ عالم میں جغرافیائی عوامل اور تبدیلیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کرۂ ارض کی تاریخ میں اس کی سطح کی تبدیلیاں، براعظموں اور سمندروں کی تشکیل، ہمالیہ سمندروں کا دور ہٹ کر صحراؤں کو پیچھے چھوڑ جانا، براعظمی پلیٹوں کے ٹکرانے سے جیسے پہاڑوں کا ابھرنا اور موسمی عوامل سب اپنی جگہ فطرت کی عظیم قوتوں کے شاہکار ہیں۔ جغرافیائی اور موسمی عوامل انسانی معیشت، معاشرت، ثقافت و مذہب، زبان اور رسم و رواج پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ موسمی تبدیلیاں اکثر چھوٹے فاصلے کی اور جغرافیائی تبدیلیاں لمبے فاصلے کی نقل مکانی پر مجبور کرتی ہیں۔ اس وجہ سے جب ہم خانہ بدوشوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ جغرافیے اور بدلتے ہوئے جغرافیے سے بہت زیادہ منسلک نظر آتی ہے۔ خانہ بدوشوں کا اپنے ماحول کے عناصر، تبدیلیوں اور امکانات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور ماحولیاتی تبدیلیاں ان کو گہرے طور پر متاثر کرتی ہیں۔

پاکستان کے طبعی خدوخال اور آب و ہوا کا تنوع مختلف علاقوں میں قدرتی وسائل میں کمی بیشی کے ذریعے متعدد علاقے محض خانہ بدوشوں کے قابل استعمال چھوڑتا ہے کیونکہ وہ اتنے زیادہ بنجر اور جنگلات سے تہی دامن ہو جاتے ہیں کہ محض اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہی ان میں زندہ رہ سکتی ہیں۔ پاکستان کا تقریباً اسّی فیصد رقبہ بنجر یا نیم بنجر ہے۔ جنگلات کو انسانی سرگرمیوں نے گذشتہ پانچ ہزار سال میں اتنا کم کر دیا ہے کہ اب یہ محض چار فیصد رقبے پر باقی ہیں۔ چنانچہ خانہ بدوشانہ طرزِ زندگی غریب و کمزور طبقوں کے لیے جہدِ بقا کی ایک آخری شکل بن کر رہ گیا ہے۔

## صحراؤں کا ماضی

یہ امر بھی علمی اعتبار سے قابلِ توجہ ہے کہ آج پاکستان کے جو علاقے لق و دق صحرا ہیں، وہ کبھی تہذیبی اعتبار سے مالا مال بھی ہوتے تھے۔ اس حوالے سے بلوچستان، چولستان اور تھرپارکر کا ذکر بالخصوص کیا جائے گا۔ یہ علاقے آج کل خانہ بدوشوں کا غالب علاقہ ہیں۔

ا۔ بلوچستان: آج کل سنگلاخ پہاڑوں، بے آب و گیاہ صحرا، لق و دق سطح ہائے مرتفع، سالہا سال تک خشک رہنے والے نالوں اور دریاؤں کے پاٹ پر مشتمل صوبہ بلوچستان کا بیشتر حصہ ہمیشہ سے یوں ویران نہ تھا۔ اس بنجر خدوخال کے نیچے قدیم تہذیب و تمدن کے آثار چھپے ہیں۔ یہ معاشرہ ترقی یافتہ تھا اور اپنے موسم و ماحول کی مناسبت سے وسیع نباتاتی و حیوانی وسائل سے بھرپور تھا۔ انسانوں کی بستیاں بھی اپنے علم و مہارت اور ثقافت و سیاست کے اعتبار سے اپنے عہد کے دیگر قریبی علاقوں سے کسی طور کم نہ تھیں۔

پاکستان میں آثارِ قدیمہ کے شواہد بتاتے ہیں کہ بلوچستان کا موجودہ صحرائی خطہ کبھی بارشوں کی معتد بہ مقدار حاصل کرتا تھا۔ بحیرۂ روم سے آنے والی ہوائیں جو آج کل سردی میں پنجاب میں بارش برساتی ہیں کبھی بلوچستان سے گذرتی تھیں اور شمالی سندھ کی بھی آبیاری کرتی تھیں۔ پوٹھوہار اور کوہ نمک سے ملنے والے پودوں کے متحجرات (fossils)، دراوڑی عہد کی مہروں میں موجود گینڈوں، شیروں اور ہاتھیوں کی تصاویر، موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے ظروف کے نقوش اور بلوچستان میں ملنے والا پانی کو روکنے والا (Cyclopean) نظام جو بڑی مقدار میں ہونے والی بارش کے پانی کو بند باندھ کر محفوظ کرنے کا کام کرتا تھا، اس امر کے گواہ ہیں کہ کبھی پاکستان کا موجود خطہ بارش

کی کثیر مقدار حاصل کرتا تھا جس سے یہ علاقے گھنے جنگلات رکھتے تھے۔ پنجاب اور سندھ کے میدانوں میں بڑے طویل تناور درخت ہوتے تھے جس کی گواہی ۳۲۶ ق۔م میں آنے والے سکندر اعظم اور چوتھی صدی کے چینی سیاح فاہیان کے بیانات ہیں جن کے مطابق دریائے سندھ اور دریائے بیاس کے درمیانی علاقے میں گھنا جنگل تھا، آب وہوا معتدل تھی۔ یہ صورت حال کسی نہ کسی طور بابر بادشاہ کے آنے تک قائم رہی۔[۴] بلوچستان کے یہ بارانی پانی کو روک کر ذخیرہ کرنے یا آبپاشی میں استعمال کرنے کی غرض سے بنائے گئے بند گبر بند یا گوبر بند کہلاتے اور ان کے بنانے والے غرب یا زرتشت کہلاتے تھے۔[۵]

ماہرینِ تاریخ یہ بھی بتاتے ہیں کہ انسانوں کی تہذیبی، معاشی سرگرمیوں نے کس طرح قدرتی وسائل کا ضیاع کیا ہے اس طرح کہ آنے والی نسلوں کے لیے جنگلات کے وسائل خاص طور سے تباہ ہوتے چلے گئے۔ اس کا یقیناً شعور انسان کو اس وقت نہیں تھا کیونکہ کانسی کے زمانے (۳۰۰ ق۔م) سے شروع ہوکر جو تانبے اور دھاتوں کو پگھلانے، ظروف سازی، چینی کے برتن بنانے، اینٹیں بنانے، زیورات بنانے، کشتیاں، فرنیچر، مکانات الغرض ساری تہذیبی سرگرمیوں کے لیے لکڑی درکار ہوتی تھی۔ فاتحین کی قتل و غارت میں شہر، فصلیں، جانور، جنگلات سبھی تباہ کردیئے جاتے تھے۔ لوگ نئے سرے سے جنگلات صاف کرکے نئے گاؤں بساتے۔ لکڑی کے تاجر بھی اس تباہی میں پیش پیش تھے۔

۱۸۶۴ء کے سال میں برطانوی حکام نے لکڑی کی تجارت کو روکنے کے لیے قوانین تو ضرور بنائے لیکن خود انہوں نے اپنی چھاؤنیوں، ریلوے، اسٹیمر، سڑکوں، فوجی و ریاستی دفاتر، تفریح گاہوں اور نئے شہروں کی خاطر لکڑی کو بے دریغ استعمال کیا۔ جنگلات کے تحفظ کے قوانین کا اطلاق تبھی مؤثر ہوسکتا ہے جب عوام اور حکومت میں رابطہ واعتماد ہو۔ عوام غربت اور لاقانونیت کی وجہ سے بھی جنگلات کو تباہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ جنگلات پر انحصار کرنے والی انسانی آبادیاں اور گروہ وسائل کی ابتری کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔

## خانہ بدوشوں کی اقسام

عمومی طور پر خانہ بدوشوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔[۶]

۱۔ جانور پالنے والے (جو شکار اور خوراک جمع کرنے کا کام بھی کرتے ہیں)۔

۲۔ سیلانی، تجارت کرنے والے۔

۳۔ تفریح مہیا کرنے والے۔

انسانی سرگرمیوں کے تحت خانہ بدوشی کی متعدد شکلیں وجود میں آئیں۔ انسانی مہارتوں اور ذہانت نے قدرت کے عطیات کے ساتھ مل کر انسانوں کو اس قابل کیا کہ وہ ایسے خطوں میں رہ سکیں جو دوسری صورتوں میں شدید نا قابلِ رہائش یا نامہربان ہوں۔

بشریاتی تحقیق سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ جانوروں کو پہلے پہل پالتو بنانے کا مقصد معاشی وجوہ سے ہٹ کر دیگر وجوہ پر مبنی تھا۔ انہیں بطور پالتو جانور (pet)، مذہبی قربانیوں یا جذباتی سہارے کی وجہ سے رکھا جانے لگا۔ گرچہ بعد میں ان کے عملی فوائد بڑے پیمانے پر خانہ بدوشوں کی زندگی میں حاصل کیے جانے لگے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مرڈوک نے دنیا میں موجود خانہ بدوشوں کی ۵۶۵ ثقافتوں میں سے صرف تیرہ فیصد کو چرواہی نظام کے تحت پایا۔ اس کے مطابق خوراک کی معیشت اکثر مخلوط نوعیت کی ہوتی ہے مثلاً شکار کرنا، مچھلی پکڑنا اور زراعت یہ سب چرواہی خانہ بدوشی کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ پاکستان کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے خانہ بدوشوں کی بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔

خانہ بدوشوں کے تاریخی طور پر معروف گروہوں میں Hephthalites شامل ہیں کہ جن کو انڈو یورپین ماخذ رکھنے والے سفید ہُن کہا جاتا ہے۔ چوتھی سے چھٹی صدی تک یہ خانہ بدوش چین وسطی ایشیا، افغانستان، پاکستان اور شمال مغربی بھارت میں رہتے تھے ان کا کوئی نظامِ تحریر نہیں تھا اور وہ خیموں میں رہتے تھے۔ وہ شہری زندگی سے ناواقف تھے اور ان میں ایک بیوی کے کئی شوہروں کی روایت (polyandry) پائی جاتی تھی۔

## خانہ بدوشی: عالمی منظر نامہ

عالمی سطح پر خانہ بدوشی انسان کی طبعی وسماجی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ موجود رہی ہے۔ آج بھی دنیا میں مجموعی طور پر خانہ بدوشوں کی تعداد کا اندازہ تین سے چار کروڑ تک ہے۔ یہ خانہ بدوشی کی مندرجہ ذیل تینوں اقسام سے تعلق رکھتے ہیں:

۱۔ شکار کرنے اور غذا جمع کرنے والے معاشروں کے خانہ بدوش صحرائے کالاہاری، کینیڈین

آرکٹک، ایمازون کے بارشی جنگلات اور جنوبی مشرقی ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ چرواہی خانہ بدوشوں میں پیرو میں اینڈیز کے بکریاں چرانے والے، سعودی بدو، صومالیہ اور منگولیا کے باشندے شامل ہیں۔ سیکنڈے نیویا میں تقریباً چھ ہزار سامی خانہ بدوش ہیں جو اپنے رینڈیر کے ریوڑ لے کر موسم سرما میں گھنے جنگلوں سے چل کر ساحلی چراگاہوں تک کا تقریباً تین سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور یہ موسمی ہجرت صدیوں سے جاری ہے۔

۳۔ سیلانی خانہ بدوش (Peripatetie nomads) جو دستکار اور تاجر، فنکار یا خدمت گار بھی ہوتے ہیں، اوپر بیان کی گئی دو اقسام سے ہٹ کر ہیں۔ یہ شہروں شہروں گاؤں گاؤں پھرتے رہتے ہیں۔ دنیائے مغرب میں ان کو روم (Rom) یا جپسی بھی کہا جاتا ہے اور ان کا ماخذ ہندوستان سمجھا جاتا ہے جہاں سے وہ تقریباً ایک ہزار سال قبل نکلے اور یورپ تک پھیلتے گئے۔ آج بھی ان کو معمولی درجے کی تجارت، کاشت یا دیہاڑی دار مزدوری کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔ جب سرحدیں اتنی دقیق نہیں تھیں اور انسان اپنے رزق و چارے کی تلاش میں یا سیاسی وجوہ سے نقل مکانی کرتے رہتے تھے، یہ بنجارے یا جپسی براعظموں کی حدود پھلانگتے چلے گئے۔ آج بھی ترکی، رومانیہ، اسکاٹ لینڈ میں یہ کہیں نہ کہیں اپنے ہندوستانی ناک نقشے رنگت اور پوشاک کے باعث پہچانے جاسکتے ہیں۔

دنیا کے چند ممالک میں خانہ بدوش آبادی کا تناسب کچھ اس طرح سے ہے:

| ملک | کل آبادی | تناسب | خانہ بدوش آبادی |
|---|---|---|---|
| تبت | ۲ء۱ملین | ۲۴فیصد | ۵ء۰ملین |
| کینیا | ۲۴ء۲ملین | ۱۶فیصد | ۴ء۰ملین |
| مالی | ۹ء۲ملین | ۱۱فیصد | ۱ملین |
| ایتھوپیا | ۵۰ملین | ۱۰فیصد | ۵ملین |
| سوڈان | ۲۵ء۲ملین | ۱۴فیصد | ۵ء۳ملین |
| منگولیا | ۲ء۲ملین | ۴۰فیصد | ۹ء۰ملین |

ایران میں اندازاً ۵ء۱ملین خانہ بدوش پائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں خانہ بدوش آبادی کا صحیح شمار معلوم نہیں۔ نہ ہی اس ضمن میں گذشتہ مردم شماری کے اعداد و شمار میں کوئی الگ زمرہ اور

تفاصیل مرتب کرنے کا ثبوت پایا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان افراد کے معاشرے میں الگ تھلگ ہونے کے ساتھ نظرانداز کیے جانے کا رجحان بھی مستحکم ہو گیا ہے۔

عالمی سطح پر خانہ بدوشی کی تاریخ انتہائی دلچسپ ہے۔ یہ ہجرت جدوجہد اور معاشی بقا کی تاریخ ہے۔ خانہ بدوش گروہ کبھی مغلوب ہو گئے اور وحشی کہلائے یا پھر کبھی حکمران بن گئے۔ وہ زمین کے حاکم بنے تو خانہ بدوشی ختم ہو گئی۔ کبھی وہ نئی ثقافتوں میں جذب ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھے یا پھر بڑی ثقافتوں کے کناروں پر چلے گئے اور پسماندگی ان کا مقدر بن گئی۔

## پاکستان کے خانہ بدوش

پاکستان کے خانہ بدوشوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قدیم مقامی باشندے۔
۲۔ سرحد پار کرنے والے مثلاً پاوندے صوبہ خیبر پختونخواہ میں اور بلوچستان کے خانہ بدوش۔
۳۔ پہاڑی وقبائلی علاقوں کے خانہ بدوش۔
۴۔ صحرائی علاقوں کے خانہ بدوش۔
۵۔ عارضی اور موسمی خانہ بدوش۔
۶۔ نیم خانہ بدوش۔

پاکستان کے صحرائی خانہ بدوش تقریباً گیارہ ملین ہیکٹر رقبے پر پھیلے صحراؤں میں رہتے ہیں ان میں تھل کا صحرا (رقبہ ۲.۶ ملین ہیکٹر)، چولستان (رقبہ ۲۶،۳۰۰ مربع کلومیٹر)، تھرپارکر (۲۲۰۰۰ مربع کلومیٹر) شامل ہیں۔ چولستان میں تقریباً ایک لاکھ لوگ، تھرپارکر میں سات سے آٹھ لاکھ خانہ بدوش ہیں۔ چاغی اور خاران کے صحراؤں کے علاوہ مکران کی ساحلی پٹی ولسبیلہ کے علاقے میں تقریباً پندرہ سے تیس میٹر اونچے ٹیلے پائے جاتے ہیں۔ یہاں خشک جھیلیں بھی ہیں یہاں اکثر بارش ہو تو دلدل بن جاتی ہے۔ بلوچستان کا تقریباً ایک وسیع رقبہ بنجر و بے آب و گیاہ ہے۔

## پاکستان کے شمالی علاقہ جات

پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں تقریباً ۴۶۹۷ ہزار ایکڑ کا علاقہ عمودی پہاڑی ڈھلوانوں، تنگ گھاٹیوں اور سطح مرتفع پر مشتمل ہے یہاں خانہ بدوشی کا جو نظام پایا جاتا ہے اسے

Transhumance کہا جاتا ہے جس میں پہاڑوں کی alpine اور sub-alpine بلندیوں تک موسمِ گرما میں ہجرت کی جاتی ہے جب کہ باقی موسموں میں مقیمی گلہ بانی ہوتی ہے۔

یہاں کی زرخیز زمین چراگاہوں، جنگلات یا زراعت کے کام آتی ہے۔ دشوار گذار خدوخال کے باعث آبادی بہت کم ہے اور کسان صرف چھوٹے ریوڑ ہی پال سکتے ہیں۔ قابلِ زراعت رقبہ صرف پانچ فیصد تک ہے اور موسمِ گرما میں بھی یہ رقبہ جانوروں کی ایک قلیل تعداد کو سبز چارہ مہیا کرسکتا ہے۔ جبکہ موسمِ خزاں و سرما میں اس کی شدید قلت ہو جاتی ہے۔ موسمِ گرما میں باشندے اپنے جانوروں کو گھر سے دور لے جاتے ہیں۔ چونکہ جانوروں پر انحصار بہت زیادہ ہے اس لیے ان کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ہی ماحولیاتی وسائل پر دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے اور جانور کمزور و غیر صحت مند ہونے لگتے ہیں۔ [8]

اس علاقے میں تاریخی اعتبار سے یہ چرواہی نظام چلا آ رہا ہے جبکہ دیگر باشندے تجارت ملازمت وغیرہ سے روزی کماتے ہیں۔ خانہ بدوش متبادل ذرائع آمدنی بمشکل تلاش کر پاتے ہیں تاہم اس علاقے کے دریا اس ضمن میں ان کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سچر یڈر کی تحقیق کے مطابق دریائے جیحوں کا ایک معاون دریا 'زرافشاں' ہے جس کی ریت میں سونے کے ذرّے ہوتے ہیں۔ انڈو آرین قبائل نے اس کی ریت سے سونا نکالنا شروع کردیا۔ بعد کی صدیوں میں رگ وید کے برہمن شعرا دریائے سندھو کو بھی سونا اچھالنے والا دریا کہتے تھے۔ یہ برہمن سونے سے پہلے ہی واقف تھے اس لیے وہ سندھو کو زرافشاں کے برابر اہمیت دینا چاہتے تھے۔ تاریخ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ سونا صرف وسط ایشیا میں دریافت ہوا اور پھر یہ ایران کے راستے مشرقی ممالک اور یونان و یورپ تک پہنچا۔ لیکن حیرت و دلچسپی کی بات یہ ہے آج بھی پاکستان کے شمالی علاقوں میں دریا کی ریت سے سونا نکالنے والی ایک ذات سونیوال موجود ہے جو آج بھی یا تو خانہ بدوش ہے یا سونا کھنگالتی ہے گرچہ اس محنت کے بدلے میں ان کو آمدنی بہت کم ہوتی ہے لیکن کوئی اور روزگار نہ ہونے کے باعث وہ اسی کام کو مناسب سمجھتے ہیں۔ [9]

### سندھ

صوبہ سندھ کے دو بڑے جغرافیائی خطے ہیں سیرابی زرخیز علاقہ جو پٹ کہلاتا ہے اور دوسرا شمالی وشمالی

جنوب میں پھیلا صحرا جو ہندوستان کے صحرائے راجپوتانہ سے منسلک ہے۔ عمر کوٹ کے قلعے پر سے دیکھیں تو ایک جانب مشرق میں اُفق تک پھیلی ریت کی پہاڑیاں ہیں دوسری جانب سندھ کے وسیع زرخیز میدان، مشرقی نارا ان کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتی ہے۔

گزیٹر آف سندھ کے مطابق:

'فطرت کی جن قوتوں نے ابتدا صحرا کو پیدا کیا وہ آج بھی سرگرمِ عمل ہیں اور واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ زمانوں تک جو کہ انسانی تاریخ سے بھی دور جاتے ہیں، دریائے سندھ کا تمام ڈیلٹا جہاں اس عظیم دریا کا پانی سمندر برد ہوتا ہے، اس ساحلی پٹی اور رن آف کچھ میں باریک ترین ریت کا ایک عظیم ذخیرہ جمع ہوتا رہا ہے جس کو جتنی تیزی سے پانی کے بدلتے بہاؤ نے خشک کیا اسی رفتار سے سمندر سے آنے والی تیز ہواؤں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ ہوا عموماً تیز چلتی رہتی ہے سوائے شدید موسمِ گرما کے ایک طویل وقفے کے...... ' [۱۰]

ہوا کی اس کارگذاری کے باعث جو ریت کے ٹیلے بنتے جاتے ہیں ان کی اوٹ میں وہ وادیاں ہوتی ہیں جن میں اتنی نمی ہوتی ہے کہ کاشت کاری ہو سکے۔ اگر کاشت نہ ہو تو بھی ان میں اچھی بھرپور گھاس اُگتی ہے۔ صحرا نشینوں کے جانوروں کے لیے یہ چارہ خصوصی غذائیت کا حامل ہے۔ اچھے سالوں میں ان جانوروں کی ایک بڑی تعداد اور گھی وغیرہ کو اس علاقے سے برآمد کیا جاتا ہے۔ ریت کے ٹیلوں پر کئی قسم کی گھاس اگتی ہے جن میں کھمڑ، بیر، ببول اور ایسی جھاڑیاں ہیں جن کو اونٹ شوق سے کھاتے ہیں۔ یہاں کی زمین کھاری ہے غیر معمولی نمکیات کے باعث یہاں کا زیرِ زمین پانی انسانی و حیوانی استعمال کے قابل نہیں اس لیے بعض خطوں میں آبادی مشکل سے ہوتی ہے۔ نگر پارکر کے جزیرہ نما کے انتہائی جنوب مشرقی حصے میں پہاڑیاں ہیں۔ کارونجھر کا پہاڑی سلسلہ تقریباً بارہ میل لمبا اور ایک ہزار فٹ تک بلند ہے۔ اس کے مشرق میں چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن میں اِکاّ دُکاّ بکھرا ہوا جنگل ہے جس میں چراگاہیں، دائمی چشمے اور بارش کے بعد کی عارضی ندیاں ہیں۔ [۱۱]

۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس علاقے میں بہت کم آبادی تھی یعنی بمشکل ۳۲۔ افراد فی

مربع میل۔ ۱۹۱۱ء میں کُل آبادی کا شمار اس ضلع میں چار لاکھ تینتیس ہزار تھا۔ خانہ بدوشی حرکت اور قحط کے اثرات کے تحت آبادی کا شمار کم وبیش ہوتا رہتا تھا۔ راجستھان سے بڑی تعداد میں لوگ یہاں آتے رہتے تھے۔ اس ضلع میں ہندوؤں کی تعداد بھی ۱۹۱۱ء میں سندھ کے کسی اور ضلع کے مقابلے میں زیادہ تھی یعنی مسلم اور ہندو ۵:۴ کی نسبت میں تھے۔ اس وقت ہندوؤں کا پانچواں حصہ بنیا اور باقی نچلی ذات کے تھے جن میں بھیل، کوہلی اور ڈھیڈ شامل تھے۔ بنیا خود کو لوہانہ اور کرار کہلاتے تھے، زمیندار زیادہ تر سوڈھا ذات سے ہیں اور ٹھاکر کہلاتے ہیں۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں میں بلوچوں کی تعداد تقریباً ۵/۱ تھی۔[۱۲]

تاریخی آثار کے اعتبار سے تھرپارکر کوئی محروم خطہ نہیں ہے۔ یہاں جین مذہب کی عمارتیں ہیں جو ۱۳۷۵ء اور ۱۴۴۹ء کی بنی ہوئی ہیں۔ نگرپارکر کے چار میل شمال مغرب میں قدیم جین عمارتیں ہیں اور ایک اتنی ہی پرانی مسجد بھی ہے۔ ویرواہ کے چودہ میل شمال مغرب میں ایک بہت عمدہ سنگِ مرمر کا بنا جین مندر ہے جس کی جین سالانہ زیارت کرتے تھے۔ یہ صورتِ حال سندھ گزیٹر کے مطابق ۱۹۱۱ء اور بعد کے سالوں میں تھی گویا یہ علاقہ مذہبی اعتبار سے رنگارنگی کا حامل ہے۔[۱۳]

سندھ کے تمام جغرافیائی خطوں کا خانہ بدوشی سے کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے۔ یہاں اوّل تو مغرب سے آنے والے موسمی ہجرت کے گروہ جو بلوچ اور بروہی ہوتے ہیں۔ دوسرے مقامی خانہ بدوش جو پورے صوبے میں نقل وحرکت کرتے پائے جاتے ہیں، تیسرے صحرائی علاقوں کے خانہ بدوش جو موسمی اور ساتھ ہی دیگر سیاسی و معاشی وجوہ سے نقل وحرکت کی عادت وصلاحیت رکھتے ہیں۔ گرچہ ان کا حال ان کے ماضی سے یقیناً مختلف ہے لیکن تبدیلیوں کی نوعیت اور رفتار بہت سست ہے۔ صوبہ سندھ اور تھرپارکر کے علاقے میں آج کل غیر سرکاری تنظیمیں بھی خاصی بڑی تعداد میں سرگرمِ عمل ہیں لیکن ان کے ذریعے آنے والی تبدیلی میں بیرونی عوامل کی مرضی اور موجودگی سے بڑھ کر مقامی عوامل کی معاونت وشراکت کا زیادہ ہاتھ ہے۔

ماہرین کے مطابق تھرپارکر کا خطہ جن طبعی تبدیلیوں کا شکار ہے ان کا اثر اس کے آبادیاتی، معاشی و معاشرتی منظرنامے پر بھی پڑتا ہے۔ تھرپارکر میں انسانوں کی تعداد کا اندازہ سات سے آٹھ لاکھ اور جانور تقریباً پندرہ سے اٹھارہ لاکھ ہیں۔ تھر کے خانہ بدوش فروری سے جون تک ریگستان سے سیراب علاقوں یا سیلابی میدانوں کو ہجرت کرتے ہیں۔ یہ زرعی علاقوں میں کٹائی کے

موسم میں بڑی تعداد میں مزدوری کرتے ہیں۔ ماضی میں ان کو اس کے بدلے میں چارہ، اجناس، تحفظ اور چراگاہیں فراہم کی جاتی تھیں آج نقد معاوضے کا رواج ہے۔ عورتیں کپاس کی چنائی کا کام بڑے پیمانے پر کرتی ہیں جن کا معاوضہ ان کو عموماً کپاس ہی کی شکل میں ملتا ہے کوہلی بھیل اور غریب ذاتیں تو ہجرت کر کے زندہ رہتی ہیں۔ اعلیٰ ذات کے لوگ (ٹھاکر اور نوری وغیرہ) ہجرت نہیں کرتے بلکہ ان کے مویشی دوسرے افراد معاوضے کے بدلے بیراج سے سیراب زمینوں پر لے جاتے ہیں اس طرح یہاں ہجرت کا انداز خشک موسموں اور خشک سالی کی ہجرت کا ہے ان ہجرت کرنے والوں میں کوہلی لوگ تقریباً ستر فیصد تک شامل ہوتے ہیں۔[۱۴]

## بلوچستان

صوبہ بلوچستان میں آب و ہوا کے اعتبار سے کئی خطے پائے جاتے ہیں جہاں موسموں کا تنوع اور شدت اپنی مثال آپ ہے۔ برفانی پہاڑ، جھلستے صحرا، نمی سے چُور ساحل اور شدید بارشوں کے طوفان ندی، نالوں میں سیلاب لانے والے موسم سب اس صوبے کا خاصہ ہیں۔ جنوب مغربی بلوچستان کا صحرائی خطہ اپنے رینج، چراگاہوں اور وادیوں میں ایسی کیفیت کا حامل ہے کہ یہاں پانی و چارہ انتہائی کم تعداد میں ملتا ہے۔ یہاں کے چرواہی نظام کو ماہرین نے اس طرح بیان کیا ہے:

۱۔ موسمِ بہار اور گرما کا Transhumance۔

۲۔ موسمِ سرما کی خانہ بدوشانہ ہجرت۔

۳۔ سال بھر کی مقیمی تنظیم کے تحت چرواہی نظام۔

فریڈشولز کے مطابق بلوچستان جغرافیائی اعتبار سے اس مقام پر واقع ہے کہ جہاں ایرانی سطح مرتفع اور سندھ کے نشیبی میدانوں کا اتصال ہوتا ہے۔ ثقافتی اعتبار سے یہ اسلامی ثقافت کو مغربی اور ہندو ثقافت کو مشرقی سرحدوں پر پاتا ہے۔ معاشی اعتبار سے اس نے قدیم دور سے تجارتی کاروانوں کی راہگزر کا کام دیا ہے۔ طبعی اعتبار سے اس کے ایک جانب پہاڑ دوسری جانب سمندر ہے۔ مغرب میں صحرا اور دریاؤں سے سیراب میدان مشرق میں ہیں۔ بلوچستان میں آب و ہوا کی رنگارنگی بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں برف پوش پہاڑ وادیاں سرما میں اور جھلساتی حرارت والے بنجر خطے گرما میں ملتے ہیں جبکہ اس کی ساحلی پٹی پر اکثر ناقابلِ برداشت رطوبت (۸۰ فیصد تک)

پائی جاتی ہے۔ ملک کے گرم ترین مقامات بلوچستان میں (سبی، کچ گندھاوا) ملتے ہیں، اس کے ساتھ بہت ہی خال خال آبادی کی موجودگی کے باعث اس خطے نے ایک وسیع بفرزون کا کام بھی دیا ہے۔[15]

تاریخ دانوں میں موجودہ بلوچوں کے آبائی وطن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ 'اس زمانۂ ماقبل التاریخ سے جبکہ بلوچ بل دیوتا کے پرستار تھے اس دور تک جبکہ بلوچ مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر انگریز کے دورِ غلامی سے اب تک بلوچ بدستور اسی سرزمین پر آباد چلے آتے ہیں۔ یہ سرزمین جو ان کے نام کی مناسبت سے بلوچستان کہلاتی ہے، ان کی ماتر بھومی یا مادرِ وطن ہے۔[16] بلوچوں کو اس علاقے کے پرانے غار نشینوں کی اولاد بھی سمجھا جاتا ہے گویا وہ اس زمین کے قدیمی باشندے ہیں۔ بلوچ قوم کے بارے میں دیگر دعوے ان کو ترک، عرب (حلب، موجودہ شام) سے نکلا ہوا بتاتے ہیں۔ تاہم ان کا نام بل دیوتا کے پرستار ہونے کے باعث بلکوس، بلکوچ، بلوص اور بلوچ پڑ گیا۔

وجہ تسمیہ سے الگ ہو کر دیکھیں تو فردوسی کے 'شاہنامہ اسلام' میں جن عظیم سپوتوں، پہلوانوں اور بادشاہوں کا ذکر ہے، ان کی ایک معتدبہ تعداد اسی خطۂ بلوچستان میں آباد تھی جس کا کچھ حصہ ایران اور افغانستان میں ہے اور کچھ حصہ پاکستان میں۔ اور پیچھے جائیں تو مہاراجہ اشوک کے عہد میں بھی بلوچ اسی خطۂ بلوچستان میں آباد تھے۔ اس امر کا ثبوت اس دور کے غالب مذہب بدھ مت کے وہ آثار ہیں جو اس اقلیم بلوچستان میں ملتے ہیں۔

بلوچستان کے پرانے مکین تعمیراتی کاموں کے لیے مشہور تھے اور بلوچستان میں پائے جانے والے تہذیبی آثار و کھنڈرات کے معمار تھے، ان کے علاوہ بڑے پیمانے پر وہ صحراؤں، کوہساروں اور میدانوں میں گھومنے پھرنے والے قبائل بھی تھے جو کسی قسم کے مقامی سرداروں، قوانین اور لشکروں کے خوف سے آزاد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لیے موزوں اندازِ سفر، قبائلی ثقافت اور معمولات وضع کر لیے۔ یہ ہر قبیلے سے مخصوص ثقافت و انداز تھے لیکن چونکہ وہ سارے قبیلے یکساں جغرافیائی حالات میں رہ رہے تھے، ان کے روزی تلاش کرنے اور طرزِ زندگی میں بھرپور مماثلت پائی جاتی تھی۔

ایچ ٹی لمبرک کے مطابق، ہزاروں سال پہلے مشرق کی جانب حرکت پذیر ایک چرواہی نسلی

گروہ، بلوچ، کچھ کے علاقے میں رک گیا، جہاں کہ ان کے ریوڑوں کے لیے پانی و چارہ فراواں تھا اور یہ جگہ سیلابی میدانوں کے مقابلے میں زیادہ پُر آسائش تھی۔ آہستہ آہستہ چرواہی نظامِ پیداوار سے زراعتی نظامِ پیداوار کی طرف رجوع کرنے کے عمل کے دوران بلوچوں نے اپنے آپ کو سارے سندھ میں مستحکم کرلیا۔ [17]

مارکسی مصنفین نے بلوچ تاریخ کو چار اہم ادوار میں تقسیم کیا ہے جن میں قدیم اشتراکیت کا عہد سب سے پہلے آتا ہے جس کے بعد سرقبیلوی نظام (۱۰ ویں۔۱۶ ویں صدی تک) آیا جس میں نقل مکانی کے ذریعے قبضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جاگیرداری نظام (۱۶ ویں سے ۱۹ ویں صدی تک) جاگیرداری رشتوں کے ارتقا کا زمانہ تھا جبکہ سرمایہ دارانہ نظام نے انیسویں صدی میں آہستہ آہستہ اپنی جڑیں پھیلانا شروع کیں۔ تاہم آج تک بلوچستان میں گذشتہ ادوار (سرقبیلوی، جاگیرداری اور سرمایہ داری) کے اثرات باقی ہیں ان تمام ادوار میں خانہ بدوشی بدستور جاری رہی ہے۔

قبائلی و نسلی اعتبار سے بلوچستان میں جو قدیم ترین باشندے ملتے ہیں ان میں ناہروئی شامل ہیں جن کی زبان دراوڑی ہے۔ براہوی جو بلوچوں سے مختلف زبان بولتے ہیں، تاتار کہستانی ہیں۔ یہ پہلے خانہ بدوش تھے، پھر سرداروں کے ماتحت آئے اور بالآخر قلات و بلوچستان میں آباد ہوگئے براہویوں کے آباؤاجداد پر آریوں (یعنی ہندوؤں) نے حملہ کیا تھا جس سے براہوی ہندوستان سے نکل کر بلوچستان کے علاقوں میں محدود ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا۔ براہوی بڑی تعداد میں کوہ کیرتھر کے دروں سے سندھ میں موسمی نقل مکانی کرنے والوں میں شامل ہوتے ہیں۔

چرواہی حقوق اکثر چرواہوں کے گروہوں کے درمیان وجۂ نزاع بنتے رہتے ہیں۔ پوٹنگر نے بلوچ اور بروہیوں کے درمیان ہونے والے تنازعے کا ذکر کیا ہے جب اس نے ایک مقامی سردار کو اس کا فیصلہ کرتے دیکھا نوشکی کے علاقے میں بلوچ تعداد میں کثیر اور طاقتور بھی تھے لیکن سردار نے بروہیوں کے حق میں فیصلہ دیا کیونکہ وہ مقامی زعما کی دعوت کے تحت ہی اس علاقے میں آئے تھے اور ان کے ریوڑ جو بلوچوں نے قبضہ کرلیے تھے، ان کو آزادانہ چرنے کی اجازت دے دی گئی۔ [18]

خانہ بدوشی بلوچوں کے ساتھ اس قدر زیادہ لازم وملزوم ہوگئی تھی کہ ملک کے دیگر حصوں خصوصاً

پنجاب میں اونٹ پالنے والے لوگ بلوچ ہی کہلاتے ہیں۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹائی علاقے میں اونٹ پالنے والے جاٹ بھی بلوچی کہلاتے ہیں۔ بلوچستان کے اندر بھی جاٹ قدیمی کاشتکار اور اونٹ پالنے والے تھے اور رند، بلوچ اور براہوی سب بعد میں آباد ہوئے۔

## پاکستان کے سیلانی قبیلے

ڈینزل آئبٹسن کی تحقیق کے مطابق پنجاب میں پائے جانے والے وہ قبائل جو اپنے مختلف ہنر، مہارت، مزدوری یا جسم فروشی وغیرہ کر کے روزی کماتے ہیں اور جو اپنی وضع میں خانہ بدوش بھی ہیں ان میں اوڈ، بیلدار، چنگڑ، باوریا، آہیری، تھوری، سانسی، پکھی وار، جھبیل، کیہل، گاگڑ، مینا، ہارنی، بلوچی، نٹ، بازی گر، پرنا، کنجر، ہیسی، گری، قلندری، گندھیلہ اور بدون شامل ہیں۔ یہ تعمیرات کے کام میں یا دیہاڑی کی مزدوری کرتے ہیں۔ اپنے ماحول سے کم قیمت میٹریل حاصل کر کے چھوٹی دستکاریاں بنا کر بیچتے ہیں، رقاص ہیں یا تھیٹر میں کام کرتے ہیں۔ کتے، ریچھ، بندر کا تماشہ دکھاتے ہیں، پرندے، چوڑیاں اور کھلونے بیچتے ہیں۔ ان سب کاموں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ سامراجی عہد کے انگریز مصنفین نے سارے خانہ بدوشوں کو بیک جنبش قلم آوارہ گرد اور جرائم پیشہ قرار دے دیا تھا۔ غربت، ناخواندگی اور تہذیب کے کناروں پر دھکیلے گئے لوگ جو بیشتر اوقات شدید محنت مزدوری اور استحصالی نظامِ اجرت میں رہتے ہیں، ان کو حقارت آمیز انداز میں پیش کرنا سامراجی محققین کو ہی زیب دیتا تھا۔ آج ہم جب ان قبائل کو پسماندگی، محرومی اور ماحولیاتی فرسودگی کے ہاتھوں مزید تباہی سے ہمکنار ہوتے دیکھتے ہیں تو ان کے انسانی حقوق کے لیے آواز اٹھانے والی تنظیموں اور اہلِ درد کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ جن سرگرمیوں کو معاشرے میں یہ افراد انجام دیتے ہیں ان کی افادیت پر زور دینا بھی اہم ہے۔ مثلاً مردہ جانوروں کی کھال اتار کر اسے استعمال کرنا، ناکارہ کاغذ کپڑے وغیرہ کو دوبارہ قابلِ استعمال بنا کر ماحول دوستی کا ثبوت دینا، بہت سستی مزدوری کر کے معیشت کا پہیہ چلانا، جنگلی جانوروں اور پودوں کی وہ اقسام استعمال کرنا جو مسلمان معاشرے میں بطور خوراک قابلِ قبول نہیں۔ حتیٰ کہ تھیٹر، فلم اور جسم فروشی کے نظام میں ان افراد کی خدمات معاشرہ استعمال تو کرتا ہے لیکن انہیں انسانی سطح پر زندہ رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ [19]

پاکستان میں قدیم مقامی باشنوں (Indigenous People) کے حقوق کے لیے شاذ ہی کوئی تنظیم خصوصی سرگرمی میں مصروف نظر آتی ہے۔ گرچہ بیگار، جبری مشقت اور غلامانہ مشقت میں پھنسے افراد کے حوالے سے حقوقِ انسانی کی تنظیمیں کام کرتی ملتی ہیں تاہم ایک بڑی تعداد میں قبائلی نظام کے حامل خانہ بدوش افراد جو جدید نظامِ معیشت کے اندر بکھرے ہوئے ہیں، خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

## سرحدوں سے بے نیاز خانہ بدوش

سفر در سفر رہنے کی قدیم عادت نے خانہ بدوش قبائل کو سیاسی حد بندیوں کو تسلیم نہ کرنے کا ایک رجحان عطا کیا ہے کیونکہ وہ صدیوں سے اس کرۂ ارض پر اپنے روزی کے وسائل کی تلاش میں چلتے پھرتے آئے ہیں۔ آج پاکستان میں پائے جانے والے خانہ بدوشوں میں وہ پاوندے بھی شامل ہیں جو صدیوں سے وسط ایشیا سے چلتے ہوئے موسمِ سرما میں دریائے سندھ کے اِس پار کے میدانوں میں خصوصاً درۂ گومل کو کراس کر کے آتے اور پڑاؤ ڈالتے تھے۔ وہ عورتوں، بچوں اور ریوڑوں کے ہمراہ ان میدانوں میں قیام کرتے۔ ان میں سے بیشتر جوان تنومند آدمی برصغیر ہندوستان میں اپنے آبائی وطن سے لائی ہوئی مصنوعات و پیداوار بیچنے نکل جاتے اور واپسی پر موسمِ گرما کے آغاز کے قریب وہ افغانستان لوٹ کر چلے جاتے۔ ان کی تعداد کا اندازہ برطانوی مصنفین کے مطابق تقریباً ستر ہزار تک اور بعد میں تقریباً دو سے تین لاکھ تک لگایا گیا ہے۔[۲۰]

تاہم ان کی یہ ہجرت پاک افغان سرحد پر کشیدگی اور جنگوں کے باعث شدید متاثر ہوئی اور ان کو آباد کار ہونا پڑا ہے۔ آج کل کچھ افغان پاوندے پشاور میں ایک کمیونٹی میں بطور مہاجر مقیم ہیں اس کو 'ہزار بز' کا نام دیا گیا ہے۔ چونکہ متواتر سفر میں رہنے کی وجہ سے یہ انتھک محنت کے عادی ہیں، یہ اپنی روایتوں کی بھی اتنی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ طالبان کی حکومت میں بھی ان کی عورتوں پر پردے کی پابندی نہیں تھی۔[۲۱]

پاوندوں کی دو اقسام بتائی جاتی ہیں۔ پاکستانی اور افغانی پاوندے، لیکن بقول کنڈی، ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے کیونکہ نسلی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے وہ حد درجہ مشابہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پاوندے اور کچھ دیگر افغانی افراد جنگ و جدل کے دوران ظلم و ستم کے خطرے کے پیشِ نظر

مہاجرین بن کر مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اب بھی اندازاً بیس لاکھ افغان پاکستان میں مقیم ہیں جن کو رضا کارانہ طور پر واپس جانے کو کہا جا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے ان کے لیے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وہ جنوبی افغانستان کے صحرا میں واپس جانور پالنے کی معیشت کو لوٹ آئیں تا کہ ان کا انحصار کیمپوں پر ختم ہو سکے۔ بہت سے پاوندے اب اس بات کو حتمی سمجھتے ہیں کہ ان کی خانہ بدوشی کی زندگی ختم ہو چکی ہے، تاہم ان کے معمر افراد اس امکان پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پاکستانی سرحد کے ادھر مغرب میں ایران میں آج بھی تقریباً ڈیڑھ ملین خانہ بدوش ہیں جو پاکستانی خانہ بدوشوں کے خونی رشتہ دار ہیں، کیونکہ آریا ایرانی سطح مرتفع سے تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں گذرے۔ ایرانی خانہ بدوشوں میں کُرد، بختیاری، لور، گلاک اور بلوچ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو براہِ راست آریاؤں کی اولاد ہیں جبکہ دیگر خانہ بدوش ان منگولوں یا عربوں کی اولادیں ہیں جو اس علاقے سے گذرتے رہے۔ آج بھی وہاں تقریباً ایک سو خانہ بدوش قبیلے اپنی منفرد بولیوں، لباس، سرداروں اور مکانات کے ساتھ بستے ہیں۔ یہ دراصل نیم خانہ بدوش ہیں اور ایران کے جنوب مشرقی حصوں، مکران اور پاکستان کے انتہائی مغرب میں پائے جاتے ہیں، جو کہ صحرائی خطہ ہے۔ یہ مذہبی اعتبار سے سُنّی ہیں اور اپنے اونٹوں کی دوڑ اور غالیچوں کے باعث مشہور ہیں۔

صحرائی خطوں میں خصوصاً خانہ بدوش قبائل سیاسی سرحدوں کو عارضی طور پر عبور کرتے رہتے ہیں اور شاید اس سے کسی فریق کا کوئی خاص نقصان بھی نہیں ہوتا کیونکہ وسائل کو برادرانہ طور پر مل بانٹنے کی روایت موجود ہوتی ہے۔ تاہم پاکستان بھارت کی سرحد جو صحرائی علاقوں میں ہے۔ اس پر باقاعدہ تحفظاتی انتظامات کے باعث ان علاقوں کے لوگوں کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ سرحدوں کے دونوں جانب رشتہ داری کے ساتھ اسمگلنگ کا کاروبار بھی چلتا رہتا ہے جو ظاہر ہے سرحدی محافظوں کے سرگرم تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

تاریخی شواہد کے مطابق کرغیز کے ریوڑ چرانے والے پامیر کی بلندیوں سے اٹھارہویں صدی تک بالائی ہنزہ کے علاقوں کلک اور منتکا میں چراگاہوں کی تلاش میں موسمی ہجرت کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ سرحدی پابندیوں کا شکار ہو کر قیام پذیر ہو گئے۔[۲۲] ۱۹۷۸ء میں ثور انقلاب کے نتیجے میں ہونے والے سیاسی انتقام کے خوف سے بارہ سو سے زائد کرغیزی افغانستان کے پامیر خطے

سے بھاگ کر گلگت (پاکستان) میں آ گئے۔ تاہم انہیں ۱۹۸۲ء میں ترکی میں سکونت کی اجازت مل گئی۔[۲۳]

پاکستان میں سرحدیں عبور کر کے آنے والے خانہ بدوش آبادی میں ایک بڑی تعداد سرمائی مہاجرین کی ہی ہے جو خیبر، کرم اور گومل کے دروں سے روزی کی تلاش میں موسمِ سرما میں آتے رہے ہیں۔ دوسری قسم ان تجارتی کاروانوں کی ہے جو اس پورے خطے میں نقل و حمل اور تجارت کا کام صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں سے پشاور اور کابل کو ملانے والے اہم راستے پر درۂ خیبر سے ہو کر ہفتے میں دو بار کارواں آتے جاتے تھے۔ تیسری اہم بات ان چرواہی خانہ بدوشوں کی رہی ہے جن کے بڑے بڑے گروہ پشاور اور کوہاٹ کے راستے ہو کر دریائے سندھ کے اس پار کے میدانوں میں ہر موسمِ سرما میں آتے اور موسمِ گرما میں لوٹ جاتے تھے۔ ان ہی میں کچھ گروہ ہر سال اپنے جانوروں کے چارے کی تلاش میں وادئ کاغان تک کا سفر کرتے تھے۔[۲۴]
ان موسمی مہاجرین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جب افغان مہاجرین اس علاقے میں آئے تو ان کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں بکریوں، بھیڑوں، گایوں، گدھوں، گھوڑوں اور اونٹوں وغیرہ پر مشتمل ریوڑ تھے جو وہ افغانستان کے پامیر کی سطح مرتفع والے علاقے کی زرخیز چراگاہوں میں پالتے تھے۔ ان بڑی تعداد میں جانوروں کا ہجوم جب وادئ کاغان کی بلندیوں تک پہنچا تو موسمِ گرما میں وہاں کے مقامی چرواہوں کی آمد سے قبل وہ گھاس اور جھاڑیاں اس حد تک صفاچٹ کر چکے تھے کہ ان کی دوبارہ نشو ونما کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ عموماً چرواہے اس حد تک نباتاتی وسائل کی تباہی سے قبل ہی نئی چراگاہوں کو چل دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے ان ہی چراگاہوں کی جانب واپس بھی آنا ہوتا ہے۔ مہاجرین کی اپنی مصیبت زدگی مقامی چرواہوں اور ان کے جانوروں، ماحول اور مجموعی طور پر معیشت کے لیے مصیبت زدگی کا باعث ضرور بنی۔

## خانہ بدوش عورت کی دنیا

خانہ بدوشی ارتقائے انسانیت کا وہ مرحلہ تھا جس میں صنفی امتیاز اور عدم مساوات کی وجوہات پیدا ہوئیں۔ سیمون دی بووا نے مرد اور عورت کی برابری کو مغلوبیت اور غالبیت کے رشتے میں بدل جانے کے عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ وضاحت پیش کی ہے کہ عین ممکن ہے خانہ بدوش نقل مکانی

اور حتیٰ کہ قیام پذیری کے دوران عورتوں اور مردوں کے کاموں میں امتیاز پیدا ہو گیا ہو۔ جیسے کہ عورت بوجھ اٹھائے اور مرد نے ہاتھ خالی رکھے تاکہ وہ کسی ممکنہ حیوانی و انسانی حملہ آوروں سے دفاع کر سکے۔ عورتیں جنگوں میں بھی حصہ لیتی رہی ہیں۔ لیکن تولید کے بندھن کے باعث عورتیں جارحیت پسند دنیا میں اپنا دفاع کرنے سے معذور بھی ہو جاتی ہیں جو کہ وقتی طور پر ہوتا ہے۔ بچوں کی تعداد پر قابو نہ پاسکنا اور دوسری جانب وسائل کا کم ہونا غیر متوازن کیفیت پر دلالت کرتا تھا۔ عورتیں اسی وجہ سے مستقل ماںتا کی ذمہ داریوں میں جکڑے رہنے کے باعث گھریلو محنت کے لیے مخصوص ہو گئیں جبکہ مردوں نے باہر کی دنیا میں موجدانہ تجربات کر کے اپنی قوت بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا، سوان کی ہستی خردافروزی کی راہ پر چلتی رہی۔ مردوں کی فعالیت نے ان کو اعلیٰ ترین قدرومنزلت عطا کی۔ گرچہ یہ خطرات سے بھرپور تھی۔ قدیمی گروہوں کی حیاتیاتی اور معاشی ضروریات وحالات نے مرد کو حاکم بنادیا اور اس نے فطرت اور عورت کو مطیع بنالیا۔ تاہم سیمون دی بووا اس بات پر زور دیتی ہیں کہ صنفی جبر واستحصال کی روایات ابتدائی خانہ بدوشی کے دور میں موجود نہ تھیں بلکہ روایت اور قانون اس وقت ظاہر ہوئے جب خانہ بدوش آبادیاں بنا کر رہنے لگے اور زراعت کار بن گئے۔ تاہم عورتوں پر مردوں کی حاکمیت مستحکم کرنے کے سفر میں مادری نظامِ (Matriarchy) کا ایک عہد بھی آتا ہے جس میں نسوانی دیویاں، ان سے وابستہ اساطیر اور ان کی قوتوں کی کارفرمائی پر یقین ہوتا تھا۔ مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق نجی ملکیت کا نظام شروع ہونے کے ساتھ ہی عورت کا درجہ کمتر اور زوال پذیر ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مرد نے اس سے ملکیت اور جائیداد ترکے میں لینے کے تمام حقوق چھین لیے۔[۲۵]

عورتوں نے خانہ بدوشی کے ابتدائی مراحل، قیام پذیری اور آج کے دور میں قائم خانہ بدوشی کے تمام مراحل میں تہذیب کی نشوونما میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ عورتوں نے بیجوں کو اُگایا، جانوروں کے چھوٹے بچوں کو پال کر پالتو بنایا، لباس کی تیاری جو اون و کپاس کے دھاگے کی بٹائی سے شروع ہوتی ہے اور ادویات کے نباتاتی وسائل تلاش کرنا، گھروں کی تعمیر و مرمت اور دستکاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ، یہ سب خانہ بدوشی کے عہد سے آج تک عورتیں کرتی آئی ہیں۔ آج جو مصنوعات و دستکاریاں خانہ بدوش بیچتے ہیں ان میں خواتین کی محنت شامل ہوتی ہے۔ عورتیں چرواہی نظام میں چرواہے کا کام بھی کرتی ہیں مثلاً گجر قبیلے کی عورتیں جو برصغیر پاک و

ہند کے شمالی مغربی علاقوں، ہمالیائی خطے اور شمالی ہند میں پھیلا ہوا ہے۔ سندھ کے علاقے تھر پارکر کی خواتین کی محنت کشی لاجواب ہے جو وہ دور دراز سے پانی بھر کر لانے، زرعی محنت مزدوری اور ماحولیاتی مفلسی کے عالم میں زندگی کو سہارا دینے کے لیے کرتی ہیں۔

سندھ کے علاقوں میں کپاس کی فصل جب تیار ہوتی ہے تو بڑے پیمانے پر یہ کو ہلی، عورتیں ہی ہوتی ہیں جو یہ مشقت اٹھاتی ہیں۔ ہڈیوں کی چوڑیاں پہننے والی تھری عورتیں ہوں یا گھاگھرا اور چھوٹی قمیض پہننے والی چولستان کی عورت، یہ سب زیورات کی شوقین ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار تو دلہن کو چاندی کے زیورات میں لاد دیا جاتا ہے۔ بھیڑوں، بکریوں، اونٹوں کے بالوں اور اون سے دھاگہ بنانا، کمبل بننا اور دیگر دستکاریاں بنانا وہ محنت طلب کام ہے جو عورتوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے گرچہ مرد بھی اس میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ چولستانی عورتیں خاص طور پر بہترین کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ سندھ میں رلّی اور پنجاب میں جُلّی بنانے کا رواج ہے جس میں کپڑے کے بہت سے ٹکڑے جوڑ کر ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔

چولستان کے صحراؤں کی عورت ہو یا تھر کی، بلوچستان ہو یا صوبہ سرحد کے آر پار سفر کرنے والے پاوندوں اور مقامی خانہ بدوشوں کی عورت، یہ سب اپنے مخصوص لباس کے ساتھ منفرد نظر آتی ہیں۔ اکثر تو شوخ رنگ پسند کیے جاتے ہیں۔ صحراؤں کی بے رنگی اور حیات دشمنی کے مقابل یہ رنگ آنکھوں کو بھی بھاتے ہیں اور دور دراز انسانوں کو تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ لمبے چولے (گھاگرے) اور کرتے کو اکثر پسند کیا جاتا ہے لیکن پنجاب میں کرتے کی لمبائی اکثر زیادہ اور تھر پارکر میں بہت کم ہوتی ہے۔ چولستان میں تو عورتیں قمیض شلوار بھی پہنتی ہیں۔ سر پر لمبا دوپٹہ یا چادر حیاداری کے خیال سے ہو یا موسمی سختیوں سے بچنے کے لیے یہ عورتوں کے لباس کا لازمہ ہے۔

پاکستان کے خانہ بدوش قبائل میں مرد و زن کے رشتوں میں برابری یا عدم برابری کے حوالے سے دو انتہائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک جانب جسم فروش قبیلے ہیں تو دوسری جانب عفت و عزت کے نام پر جان قربان کرنے والے بھی ہیں۔ میر گل خان نصیر کے مطابق جب عورت کی عزت و ناموس پر کوئی حرف آتا ہے تو بلوچوں کے لیے موت کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے بلوچ شہروں اور آبادیوں کے مقابلے میں بیابانوں کو زیادہ پسند کرتے آئے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

بلوچ چونکہ معاشرتی طور پر اب تک قبائلی دور میں پھنسا ہوا ہے جو چراگاہوں کی تلاش میں گھومنے پھرنے والے مال و مویشی پالنے اور خانہ بدوش زندگی سے گذرنے کے ابتدائی قبائل و معاشرت کا دور ہے، اس لیے اس تناسب سے اس کا احساس شدید ترین ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ بلوچ ابتدا سے ہی اپنی نسل کو خالص اور پاک رکھنے کا خواہش مند رہا ہے، غیر بلوچ قبائل سے رشتے ناطے کے ذریعے رابطہ پیدا کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا رہا ہے، اس لیے وہ عورت کے معاملے میں انتہائی سخت گیر اور متشدد واقع ہوا ہے۔[۲۶]

ماہرینِ بشریات جنہوں نے بلوچ اور پختون قبائل کا مطالعہ کیا ہے، عزت و ہتک کے نام پر ان کی شدید ردِ عمل ظاہر کرنے کی روایت کی وضاحت کرتے آئے ہیں۔

## خانہ بدوشی، تاریخی مہاجرت اور تغیرات عالم: ایک ماڈل

تاریخی شواہد اور زمانۂ حال کی صورتِ حال سے متعلقہ، اثریاتی، طبعی، موسمیاتی، بشریاتی، معاشیاتی اعداد و شمار کی روشنی میں ایک ماڈل ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جو خانہ بدوش گروہوں کی تاریخ کی راہگزر پر طویل اور قلیل فاصلوں کی ہجرت کا خاکہ واضح کرتا ہے۔ (تصویر اگلے صفحے پر ملاحظہ کیجیے)۔

اس ماڈل میں تین بنیادی تعاملاتی عناصر انسان۔ حیوان۔ ماحول ہیں۔ ان کا یکجا ہونا ایک ایسے مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں یہ تینوں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بقا اور فنا کا سبب بنتے ہیں اور اس پورے نظام کی وقت کے ساتھ ساتھ آگے پیش رفت کا تعین کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ ہجرت موسمی اور تاریخی ہو سکتی ہے۔ تاہم پہلے ان تینوں عناصر کا تذکرہ تفصیلاً ضروری ہے۔

۱۔ انسانی عناصر: ان میں آبادیاتی اعتبار سے انسانوں کی تعداد، صنف اور عمر کے اعتبار سے تقسیم اور ان میں اضافے کی شرح ہے جو ہجرت کا بڑا سبب بنتی ہے۔ انسان کا بکھراؤ اور پڑاؤ، معاشی اور دفاعی صلاحیت بھی اہم ہے۔ تکنیکی اعتبار سے انسانوں کی ماحول پر قابو پانے، پیش بینی

Ecological Factors: Global, climatic, changing river courses, global warming, deforestation, desertification
Historic Migration
Environment
Seasonal Migration
Human
Animal
Human Factors: Demographic, Psychological, Technical
Animal Factors: Number, species, fodder needs
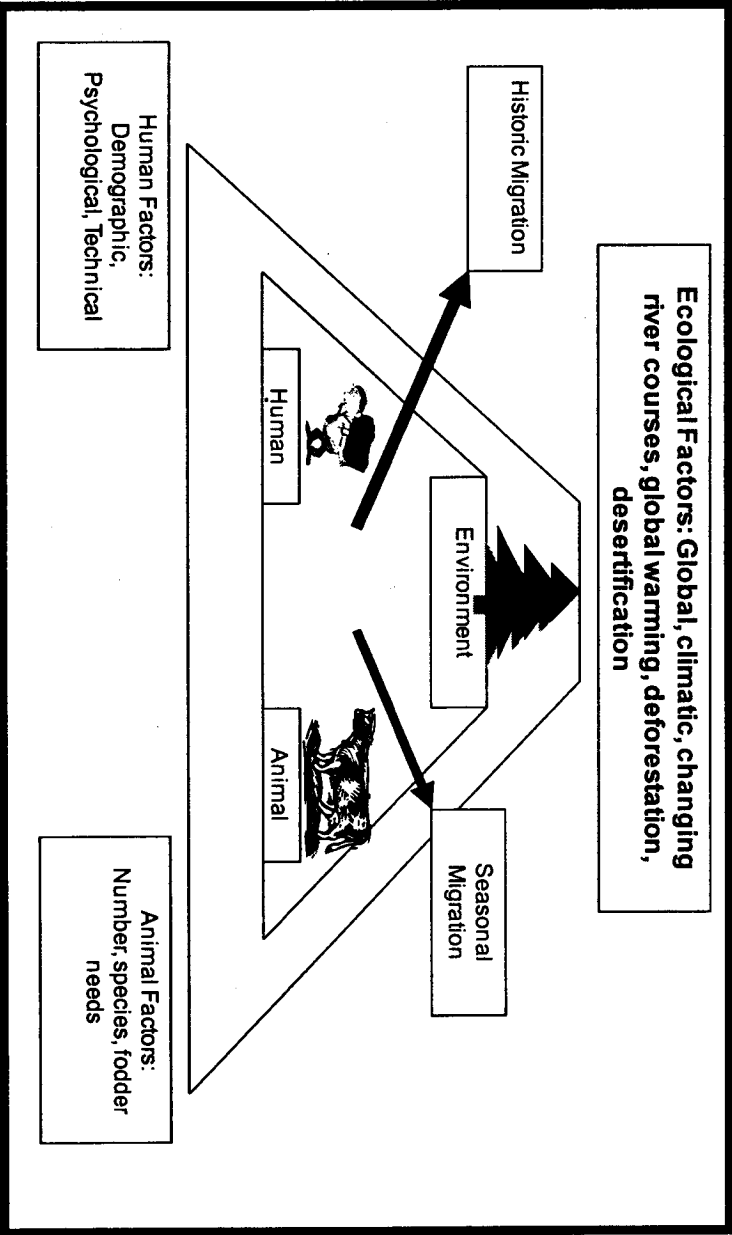
کرنے اور باہم ابلاغ کی اہلیت ہے جو اکثر روایتی دانش تک محدود ہوتی ہے۔ خانہ بدوشی نظام میں جدید تکنیک کو جذب کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ان کی تبدیلی اور ترقی کی خواہش بھی محدود ہوتی ہے۔ جس کا بڑا سبب آزاد منش فطرت اور دوسری نسلی و ثقافتی آبادیوں سے بین عمل کا خوف بھی ہے۔ خود اپنے نسلی و ثقافتی خواص پر تفاخر بھی ان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے جس کے باعث درون زوجی (endogamy) پر بہت زیادہ زور ہوتا ہے۔

**۲۔ حیوانی عناصر:** ان میں جانوروں کی اقسام جو اس ماحول میں زندہ رہ سکیں بہت اہم ہیں۔ ہجرت میں معاون، بار برداری کے قابل، خشک و سرد و گرم موسموں میں سخت جانی، جسمانی طور پر مشقت کی صلاحیت اور جسم کا سائز بھی اہم ہے کیونکہ اس کا تعلق خوراک کی مقدار پر بھی ہوتا ہے۔ جانور جو انسانی خوراک مہیا کرتے ہیں وہ شدید موسمی حالات (برف باری، سیلاب، طوفان) میں انسانی بقا کی ضمانت مہیا کرتے ہیں۔ معاشی طور پر یہ آمدنی کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان کو مذہبی اعتبار سے قربانی اور دیگر رسوم میں اہم سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں جانور جذباتی سہارا اور تفریح بھی فراہم کرتے ہیں۔ جپسی قبائل تو ریچھ بندر پرندے وغیرہ پالتے ہیں اور ریچھ بندر کا تماشہ دکھا کر روزی کماتے ہیں۔

**۳۔ ماحولیاتی عناصر:** ان میں طبعی و نباتاتی دونوں عناصر شامل ہیں۔ طبعی میں زمین کی بناوٹ، زرخیزی (صحرا، پتھر، ریت، پہاڑ) اور آب و ہوا (درجہ حرارت، بارش کی مقدار و تواتر، ہوا کی رفتار) اہم ہیں۔ نباتاتی عناصر میں پودے و گھاس کی انواع، چارے کی کوالٹی، ماحول سے مخصوص جانور و پودے جو کسی خاص اونچائی پر یا کسی خاص موسم میں اگتے ہوں، شامل ہیں۔ مزید برآں صحرا کاری (ریگستانوں کا اپنے کناروں سے پھیلتے جانا، سیم و تھور و کٹاؤ کے اثرات) جنگلات کی تباہی، ضرورت سے زیادہ چرائی اور موسمی تبدیلیوں کے عوامل شامل ہیں جو سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

خانہ بدوشوں کی تاریخی ہجرت ہو یا موسمی ہجرت یعنی لمبے فاصلے کی ہجرت اور چھوٹے فاصلے کی ہجرت، دونوں کا تعلق اوپر بیان کردہ تینوں عناصر کے باہمی تعامل سے ہے۔ تجویز کردہ ماڈل کے اندر ثقافتی، سیاسی، تاریخی اور عالمگیریت سے ماخوذ عناصر کا بھی ایک سلسلہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ عوامل بھی ہجرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۔ **سیاسی عوامل:** قوانین، حکومتیں، سرحدوں کی سختی ونرمی، قیادت، زمین کا رقبہ جو زیرِ انتظام ہو، چراگاہوں اور پانی وجان مال کے تحفظ کا نظام، پانی کے ذخائر کی کھدائی ومرمت کا نظام، جنگوں میں ارادتاً یا مجبوراً شامل ہونا وغیرہ۔

۲۔ **تاریخی عوامل:** اس میں بین البراعظمی اور بین الملکی حالات وکوائف شامل ہیں جو خانہ بدوش گروہوں کو دور دراز جانے پر مجبور کرتے ہیں۔

۳۔ **ثقافتی عوامل:** ان کی دو سطحیں ہیں۔ اندرونی ثقافتی خواص جو خود خانہ بدوش گروہوں کی اپنی روایات وعقائد پر مبنی ہیں۔ بیرونی ثقافتی خواص اس گروہ کے اردگرد خارجی ماحول کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں اقسام سے رسوم و رواج، خوراک کے حصول وممنوعات، میلے ٹھیلے، مذہبی احکامات، صنفی ضوابط، رقص، موسیقی، لوک ادب اور دستکاریاں متاثر ہوتی ہیں۔ ان میں حسبِ ضرورت تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ تاہم بنیادی (core) ضوابط نہیں بدلتے۔

۴۔ **عالمگیریت کے عوامل:** عالمگیریت چونکہ ایک ہمہ گیر عملیہ ہے، اس لیے اس کے اثرات بھی کثیر الجہتی ہیں۔ آج کے گلوبل/ عالمگیر معاشرے میں نسلی ثقافتی گروہ آپس میں معاشی وسیاسی کنٹرول کے لیے برسرِ پیکار بھی ہیں اور حسبِ ضرورت تعاون پر آمادہ بھی ہو جاتے ہیں، جبکہ خانہ بدوش گروہ جو یا تو کناروں پر دھکیلے گئے ہیں یا بڑے سماج کے اندر کمزور و بے آواز ہیں، اس لیے ان کو عالمگیری سماج کے نقصانات زیادہ پہنچ سکتے ہیں کیونکہ ان کی تحفظ کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔

ان تمام عوامل سے ہٹ کر ایک اور عظیم تبدیلی جو ان سارے خواص کو یکسر تبدیل کر سکتی ہے وہ ہے عالمی ماحولیاتی تبدیلی۔ اس کے اثرات طویل مدت ہوتے ہیں۔ مثلاً دریاؤں کا رخ بدل جانا یا دریا کا سوکھ جانا۔ بارشوں کی کمی وزیادتی، عالمی حدت میں اضافہ، ڈیلٹاؤں کا سکڑنا یا پھیلنا، ساحلی جنگلات کی تباہی، گلیشیرز کا پگھلنا اس طرح کہ وہ ختم ہونے کے قریب ہو جائیں، وغیرہ۔

اس ماڈل کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان کے خانہ بدوشوں کی صورتِ حال کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی ہجرت (طویل فاصلے کی مستقل ہجرت) اور موسمی ہجرت (کم فاصلے کی عارضی ہجرت) دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ موسمی چکر سے متاثرہ گروہ اپنے قریبی علاقوں میں جا کر وسائل خوراک اور چارہ تلاش کر لیتے ہیں جبکہ وہ موسم بدلنے پر واپس بھی آ جاتے ہیں۔ تاہم تاریخی ہجرت زیادہ پائیدار اور تقریباً سو فیصد صورتوں میں ناقابلِ مراجعت ہوتی ہے، اگر مہاجرین

جیسے قبائل واپس آ بھی جائیں تو ان کی روانگی اور واپس آمد کے حالات میں بہت زیادہ فرق آ چکا ہوتا ہے۔

تاریخی ہجرت جو خانہ بدوش قبائل سے مخصوص ہے اس کے بنیادی محرکات میں جہدِ بقا اوّلین اہمیت کی حامل ہے جس میں ان کے اپنے ماحول کے علم، ایجادات و اختراعات اور مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ناسازگار تاریخی، سیاسی اور موسمی حالات میں ہجرت کے نتیجے میں نیا ماحول اور نیا چیلنج سامنے آتا ہے جو نئی دانش مندی، نئی ایجادات و مطابقت کی نئی مہارتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس ضمن میں جو تعینات ہیں وہ خانہ بدوشی کے اعتبار سے ناقابلِ گرفت یا قابلِ گرفت ہو سکتے ہیں۔ اول الذکر کا تعلق آب و ہوا اور جغرافیائی تبدیلیوں سے ہے۔ قابلِ گرفت محرکات میں سیاسی و انتظامی عوامل، ماحولیاتی عناصر پر تحقیق، نئی ٹیکنالوجی اختیار کرنا، متبادل روزگار، انسانی حیوانی اور ماحولیاتی عناصر کا توازن قائم رکھنا اور ماحول کے زندگی بخش عناصر کو توازن کی سطح سے نیچے نہ آنے دینا شامل ہے۔

خانہ بدوش گروہ ہوں یا کوئی اور تاریخی ہجرت کے اثرات کثیر النوع ہوتے ہیں۔ ان میں نیا علم حاصل کرنے کی خواہش، مطابقت و بقا کا چیلنج، نسلی بنیادوں پر مسابقت تعاون یا غلبے اور قیادت کی خواہش شامل ہے۔ قبائلی و گروہی بنیادوں پر اندرونی اتحاد و تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آبادیاتی اثرات میں اقامت پذیری کا رجحان بڑھتا ہے۔ نئے پیشے اور نئی شرائط ملازمت و اجرت سامنے آتی ہیں، عورت مرد کے رشتوں کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ مزید برآں جیسا کہ پاکستانی خانہ بدوشوں کی زندگی کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ادب و ثقافت پر دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہجرت کی یادیں صدیوں باقی رہتی ہیں، نظم و نثر اور لوک ادب میں ان کی صدیوں گونج باقی رہتی ہے۔ ان کے اثرات لسانی خصوصیات پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ بچھڑے وطن کی یادیں اور سوکھے دریاؤں کے نوحے قرنوں تک باقی رہتے ہیں جیسا کہ آج بھی چولستان میں یہ صدائیں لوک گیتوں میں محفوظ ہیں۔ اور مٹھڑی روہی میں میگھ ملہاروں کی فضا میں بوٹا بوٹا گلزار کھلانے کی خواہش پوری توانائی سے زندہ ہے۔[۲۴]

## حوالہ جات

۱۔ (مروج الذہب، جلد دوئم، ص ص ۴۳۔۱۴۲) جس کا حوالہ رشید اختر ندوی نے دیا ہے۔ ارضِ پاکستان کی تاریخ، جلد اول و دوئم، لاہور، سنگِ میل، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۷

۲۔ سچر یڈر، Prehistoric Antiquities میں یہ لکھتے ہیں، بحوالہ رشید اختر ندوی، ایضاً، ص

۳۔ کے۔ ایم۔ صدیقی......

۴۔ H.T.Lambrick P 52

۵۔ جنوبی ایشیا میں دنیا کے سب سے زیادہ خانہ بدوش پائے جاتے ہیں۔ ان پر تحقیق کرنے والے مصنفین نے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Michael Casimir and Aprna Rao, Nomadism in South Asia, OUP: India, 2008.

۶۔ جسم فروشی، تھیٹر و فلموں کے اداکاروں کے حوالے سے خانہ بدوشوں یا سیلانی قبیلوں کی متذکرہ بالا ذاتوں کے افراد آج بھی سرگرم ہیں۔ مثال کے لیے دیکھیے: فوزیہ سعید، کلنک، ہیرا منڈی کی در پردہ ثقافت، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص ص

۷۔ Alpine سے مراد چار ہزار فٹ سے مستقل برف جمنے کی بلندی تک کی پٹی ہے اور Sub-alpine اس چار ہزار فٹ سے نیچے وہ پٹی ہے جس میں نباتات کی اقسام تبدیل ہو جاتی ہیں۔

۸۔ S.M.Rafique, Status of Fodder Production and Pastoral Systems in Northern Mountaneous Region, NWFP, Pakistan.

۹۔ عکسی مفتی، سیّد محمد علی، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا، شمالی علاقہ جات، سلسلہ قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش (اسلام آباد: لوک ورثہ/ الفیصل ناشران، لاہور)، ص ۵۵

۱۰۔ J.M.Smyth, *Gazetteer of The Province of Sind, Thar and Parkar District,* (Karachi: Indus Publications, 2003), 1st edition, 1919, pp.1-2.

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۹

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ عارف حسن، بے ضابطہ انقلاب، پاکستان میں سماجی معاشی تبدیلی کے عوامل کے مشاہدات، کراچی: عشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل، ۲۰۰۹، ص ص ۱۳۰۔۱۷۵ (تک تفصیلی بیان ہے)

۱۵۔ Fred Scholez, *Nomadism and Colonialism A Hundred Years of Baluchistan, 1872-1972* (Karachi: Oxford University Press, 2002).

۱۶۔ گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۴

۱۷۔ منصور اکبر کنڈی۔

۱۸۔ www. pashtunforums.com/pashtun-culture-9/pashtun-nomads, acussed, 12 -3-11 .

۱۹۔ New world Encyclopedia, 'Nomad' http://www.newworldencyclopedia.org/entry/nomad, 22-3-11

۲۰۔ The Facts New International, http://www.newint.org/features/1995/04/05/facts/,22-3-11

۲۱۔ Akbar S. Ah......

۲۲۔ سیمون دی بووا، عورت: جسمانی، تاریخی، نفسیاتی اور معاشرتی مطالعہ، ترجمہ یاسر جواد، لاہور، ص ص ۱۲۷۔۱۰۵

۲۳۔ میر گل خان نصیر، بحولہ بالا، ص ص ۱۸۔۱۹

۲۴۔ یہ خواجہ غلام فرید کی نظم سے اخذ کردہ ہے۔

# پٹ فیڈر کسان تحریک

## محمد رمضان

محترم جناب ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر مبارک علی، ملک بھر سے آئے ہوئے عوام دوست دانشورو کراچی یونیورسٹی کی طالبات اور طالب علم ساتھیو!

مقالہ کیا ہوتا ہے، کس طرح لکھا جاتا ہے مجھے معلوم نہیں، میں آپ کی طرح کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے سے سند یافتہ نہیں ہوں۔ پڑھنا لکھنا نہ جاننے کی وجہ سے بی۔ایف کیمرل اردو بوائز پرائمری اسکول ککری گراؤنڈ لیاری کراچی کی پانچویں کلاس سے بھاگنے والا وہ بچہ ہوں جس نے گیارہ سال کی عمر سے محنت مزدوری کر کے اپنی بیوہ ماں کا آٹھ بچوں کی کفالت میں ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۷۰ء میں کورنگی کے صنعتی علاقے میں ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں سے طبقاتی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پاکستان کے سویلین اور فوجی آمروں کی جانب سے خلافِ قانون قرار دی گئی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ساتھیوں نے سیاسی تربیت کی۔ نیشنل عوامی پارٹی میں سیاسی سرگرمیاں کیں، ساتھیوں اور بیوی شاہینہ کی کوششوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ۱۹۹۰ء میں سوویت یونین کے خاتمے سے تین ماہ پہلے انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز ماسکو میں سماجی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ساتھیوں نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں کانفرنس 'عوام اور تاریخ' میں پٹ فیڈر کسان تحریک پر آپ سے بات چیت کروں۔ پہلے عوام کی تاریخ پر بات کروں گا پھر 'پٹ فیڈر کسان تحریک' پر اپنی کتاب پر اور آخر میں عوام کی تاریخ نویسی کے لیے عوام کی تاریخ سازی کی ضرورت پر بات کروں گا۔

تاریخ صرف سماجی عمل نہیں۔ تخلیق کائنات، نظام شمسی میں گردش کرتی ہوئی ہماری زمین اس کے بدلتے ہوئے لاکھوں رنگ، جیون کا سارا سفر ان کی تاریخ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ ہمارا موضوع وہ تاریخ ہے جس کا تعلق سماجی زندگی میں تبدیلی کی جدوجہد میں عوام کا کردار ہے۔ میں

نے کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کی تصنیف کمیونسٹ مینی فیسٹو میں یہ پڑھا کہ 'انسانی سماج کی ساری تاریخ درحقیقت انسانی محنت کی تاریخ ہے' آلاتِ محنت اور طریقۂ پیدار کی تبدیلی سے سماج کے سارے ادارے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میں خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ سماجی زندگی میں تبدیلی آلاتِ پیداوار اور نیا نظامِ پیداوار تخلیق اور تعمیر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کے خالق حکمران نہیں بلکہ تخلیق کار محنت کش عوام ہوتے ہیں۔

جب میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ذرّے سے آفتاب تک ہر ہستی، مظہر اور مناظر، اتحادِ ضدین ہوتے ہیں۔ یعنی ہر ہستی متضاد قوتوں کے درمیان اتحاد اور متضاد کشمکشوں کے ذریعے قائم ہے۔ رفتہ رفتہ سست جاری و ساری تبدیلیوں کے ساتھ تیز رفتار چھلانگوں والی انقلابی تبدیلیاں ہی تاریخی واقعات کہلاتی ہیں۔ جہاں حکمرانی طبقات کے مؤرّخ سارے تاریخی واقعات کو، بادشاہوں، فوجی جرنلوں، سیاسی رہنماؤں، حکمران طبقات کے اہم افراد و اور افراد کے مختصر مخصوص گروہوں کے کارناموں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ وہاں ہم عوامی لوگ سارے واقعات کو صرف عوامی سرگرمیوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں۔ آلاتِ پیداوار اور طریقۂ پیداوار کی تبدیلیوں سے سماج کا معاشی ڈھانچہ تو فوری تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر سیاسی ڈھانچہ یعنی ریاستی ادارے، حکومت، قانون، انتظامی ادارے صرف منظم سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے تبدیل ہوتا ہے۔ سیاسی جدوجہد کا فیصلہ زیادہ متحرک، زیادہ منظم سماجی گروہ کے حق میں ہوتا ہے عوام اگر اپنے طبقاتی مفادات کا شعور نہیں رکھتے اپنے آپ کو اپنے طبقاتی مفادات کے مطابق منظم نہیں کرتے متحرک نہیں ہوتے تو وہ پاکستان کے حکمران طبقات کے مذہبی، نسلی، لسانی، قبائلی، قومی تنگ نظری اور معاشی انصاف کے کھوکھلے نعروں کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔

تاریخ صرف حکمران یا عوام کی دوطرفی سرگرمیوں سے تخلیق نہیں پاتی بلکہ ان دونوں قوتوں کے ساتھ دیگر داخلی اور خارجی قوتوں کے مفادات اور سیاسی سرگرمیوں کے مطابق کثیر رخی پیچیدہ کشمکش کے ذریعے تخلیق پاتی ہے۔ بے شمار عوامی تحریکوں نے تاریخ میں عوام کے کردار کو واضح کیا ہے۔ میں نے جن تحریکوں میں حصہ لیا۔ ان میں سب سے نمایاں تحریک 'پٹ فیڈر کسان تحریک' تھی اس پر کتاب لکھنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ عوام کی تاریخ کا یہ پہلو گمنام نہ ہو جائے اس تحریک نے سیاسی، معاشی اور سماجی صورتِ حال کا رخ موڑ دیا اس تاریخی جدوجہد میں امید کی

وہ کرن تھی جو سامنے آنے سے عوام کے حقوق کے لیے لڑنے والے سیاسی کارکنوں اور دانشوروں کی مایوسی میں کچھ کمی لانے کا سبب بن سکتی ہے۔

ایوبی فوجی آمریت کے دور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۷ء میں جب پاکستان میں چار صوبے نہیں بلکہ ون یونٹ کے ذریعے ایک صوبہ مغربی پاکستان قائم کیا گیا اس کا دارالحکومت لاہور کو بنایا گیا پاکستان کے سارے مسائل ساری زمینیں لاہور میں موجود فوجی اور سویلین نوکرشاہی کے قبضے میں چلی گئی۔ سبی ڈویژن کی اس وقت کی سب ڈویژن نصیر آباد موجود دور کے صوبے بلوچستان کا نصیر آباد ڈویژن کی تحصیل نصیر آباد کی بارانی زمینوں کو نہری نظام میں لانے کے لیے گڈو بیراج سے ۱۹۶۷ء میں پٹ فیڈر نہر نکالی گئی اس سے آباد ہونے والی زرعی زمینیں نہر نکلنے سے پہلے برساتی پانی سے آباد کرنے والے مقامی کسانوں کو دینے کی بجائے لاہور کی حکومت نے پنجاب کے آبادکاروں کو الاٹ کردیں جس کے خلاف مقامی بلوچ کسانوں نے قبائلی انداز سے کئی بار مسلح اور غیر مسلح جدوجہد کی۔ جس کے نتیجے میں پٹ فیڈر کی زرعی زمین مقامی قبائل کے قبضے میں رہیں۔

۱۹۷۱ء میں جنرل یحیٰی خان کی فوجی حکومت نے مشرقی پاکستان کے بنگالی عوام کی قومی حقوق کی جدوجہد سے شکست کھائی مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد مغربی پاکستان کے سندھی، بلوچ اور پختون قوموں کے مطالبے پر ون یونٹ ختم کرکے پاکستان کے چاروں صوبوں کو بحال کردیا گیا۔ باقی پاکستان کی حکومت پاکستان پیپلز پارٹی کے ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کردی گئی جس نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ دیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے زرعی اصلاحات ۱۹۷۲ء مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ پورے ملک کے لیے ۲۰ مارچ کو جاری کیا اس سے دو دن پہلے مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۷ بلوچستان کے پٹ فیڈر کینال کے زرعی اصلاحات گزٹ ۱۸ مارچ ۱۹۷۲ء جاری ہوا جس میں مقامی کسانوں یا ضلع سبی اور کچھی کے کسانوں کو پٹ فیڈر کی زرعی زمین الاٹ کرنے کا آرڈر دیا گیا تھا مقامی کسانوں نے بھرپور جدوجہد کرکے اپنے قبضے میں موجود زمینیں اپنے اور اپنے افرادِ خانہ کے نام کروائیں پاکستان میں ۱۹۷۲ء کی زرعی اصلاحات سب سے زیادہ مؤثر طور پر پٹ فیڈر بلوچستان میں ہوئیں۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے ۶ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کردی۔ جنرل ضیاء الحق کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سرداروں، بنیاد پرست مولویوں اور

امریکی حکومت کی حمایت حاصل تھی جن کو خوش کرنے کے لیے ملتان کے کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مالکوں کو مزدوروں کا قتلِ عام کرنے کی اجازت دی گئی۔ میڈیا پر پابندیاں لگائی گئیں۔ پٹ فیڈر کے کسانوں سے زرعی زمینیں واپس چھیننے کے لیے پٹ فیڈر نہر سے آباد ہونے والا نو کلومیٹر کا علاقہ خالی کروانے کے بعد جب ۲۱، ۲۲ دسمبر کی درمیانی شب میر ظفر اللہ جمالی کا پرائیویٹ مسلح لشکر قیدی شاخ کے کنارے آباد میر گل موسانی گوٹھ پہنچا مقامی کسانوں کی زرعی زمینیں اپنے قبضے میں لینے تو وہاں کے کسانوں نے اپنی زرعی زمینوں کا قبضہ ظفر اللہ جمالی کو اس وقت تک دینے سے انکار کر دیا جب تک حکومت ان کو دیئے ہوئے الاٹ منٹ آرڈر منسوخ نہیں کرتی یہ وہ قانونی انکار تھا جس نے پٹ فیڈر کے ساتھ پورے ملک میں زرعی اصلاحات کے تحت ۱۹۷۲ء میں کسانوں کو ملنے والی زرعی زمینوں کو واپس جاگیرداروں اور سرداروں کے قبضے میں دینے کی ضیاء فوجی آمریت کی حکمت عملی کو ناکام بنا دیا۔

۲۲ دسمبر کی صبح روشنی ہوئی تو ظفر اللہ جمالی اور اس کا ہراول دستہ میر گل موسانی گوٹھ کے کسانوں کے نرغے میں تھا اور اس کے لشکر کا گاؤں سے باہر گاؤں والوں کو گھیرنے والا حصہ دوسرے گوٹھوں سے آنے والے کسانوں کے نرغے میں تھا میر ظفر اللہ جمالی کے لشکر کو مکمل شکست سے بچانے کے لیے جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت حرکت میں آ گئی ضلع کا ڈپٹی کمشنر لیویز فورس کے ساتھ ہاتھ میں اس کا سفید جھنڈا لیے میر گل موسانی گوٹھ میں داخل ہوا اس وقت کسانوں نے ظفر اللہ جمالی جاگیردار کے لشکر سے ہتھیار چھیننا شروع کر دیئے تھے۔ امن کے نام پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے لیویز کی مدد سے ظفر اللہ جمالی اور اس کے لشکر کو کسانوں کے نرغے سے نکالا۔ ضلعی حکومت کے سائے میں نکلنے والے جاگیرداروں کے لشکر نے کسانوں کی مدد کو آنے والے قریب کے گاؤں عبدالعزیز لہڑی کے تین بھائیوں رحمت اللہ لہڑی عمر ۴۰ سال، عبداللہ لہڑی عمر ۳۶ سال، عبدالحق لہڑی عمر ۲۷ سال، اُن کے بھانجے زرق جان لہڑی عمر ۲۶ سال، رخشانی گاؤں کے عبدالکریم رخشانی کو راستے میں گھیر کر شہید کر دیا۔ اس جنگ میں کئی افراد زخمی اور لاپتہ ہو گئے تھے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کے دن پٹ فیڈر کے پانچ شہید کسانوں کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کے بجائے جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے ڈھائی سو کے قریب مقتول کسانوں کے ورثا اور ان کا ساتھ دینے والوں کو گرفتار کر لیا۔ پورے پٹ فیڈر کے علاقے میں زرعی زمینوں کو متنازعہ قرار دے

کر کھیتوں میں رکھی ہوئی سرسوں کی فصل کے کھلیانوں پر لیویز کے سپاہی بٹھا کر حکومت کے قبضے میں لے کر کسانوں کو معاشی طور پر کمزور کر کے جدو جہد سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کی حکمت عملی پر عملدرآمد شروع کر دیا۔

اس تاریخی ناانصافی کے خلاف پٹ فیڈر کے کسانوں نے آواز بلند کرنے کی کوششیں کیں مگر فوجی حکومت اور میڈیا پر پابندیوں کی وجہ سے نصیرآباد کے کسانوں کی آواز ملک گیر سطح پر سنائی نہیں دی جا رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے پٹ فیڈر کے کسانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی کے مزدور، طلبا، کسان، عوامی کمیٹی کی میٹنگ نے طے کر کے مزدور رہنماؤں اور طالب علم رہنماؤں کا ایک پانچ رکنی وفد حالات کا جائزہ لینے کے لیے پٹ فیڈر روانہ کیا وفد نے شہیدوں کے ورثا سے اظہارِ یکجہتی کرنے کے ساتھ ان کو قبائلی طریقے سے بدلہ لینے سے روکا۔ ان کے قاتلوں کی گرفتاری، گرفتار شدہ کسانوں کی رہائی اور سرسوں کی فصل کے کھلیانوں کو واگذار کروانے کے لیے عوامی طاقت سے سیاسی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ مقامی لوگوں کو سیاسی تحریک چلانے پر آمادہ کرنے کے ساتھ تحریک کی حکمت عملی ترتیب دی۔

جنوری ۱۹۷۸ء کے دوسرے ہفتے میں شیر محمد مینگل، غلام قادر مینگل، شربت خان لہری، سکندر محمد شہی اور عبدالوہاب جمالی پر مشتمل پٹ فیڈر کے کسانوں کے ایک نے وفد کراچی، حیدرآباد، سکھر اور روہڑی میں مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں، سیاسی پارٹیوں، طلبا تنظیموں اور میڈیا کے رہنماؤں کے سامنے پٹ فیڈر میں کسانوں پر ہونے والے ظلم کی داستان بیان کر کے جنرل ضیاء الحق اور اس کے اتحادی جاگیرداروں کا ظالمانہ چہرہ بے نقاب کیا۔

کراچی سے پہلا بھوک ہڑتالی گروپ ۱۰ فروری ۱۹۷۸ء کے دن میرے ساتھ طالب علم رہنما غلام اکبر، مزدور رہنما عمر دین۔ پٹ فیڈر کے مرکزی شہر ٹمپل ڈیرہ (موجودہ نام ڈیرہ مراد جمالی) پہنچا۔ مقامی کسان کارکنوں کی بہت بڑی تعداد گرفتار ہو چکی تھی بہت ہی زیادہ خوف و ہراس تھا۔ ہمارا وفد سیاسی پارٹیوں کی مقامی قیادت سے ملا، پٹ فیڈر کے کسانوں کے تین مطالبات: (۱) کسانوں کے قاتلوں کی گرفتاری، (۲) حکومت کی طرف سے ضبط شدہ سرسوں کی فصل کسانوں کو واپس دلانا، (۳) بے قصور گرفتار سارے کسانوں کی رہائی۔ کی جدوجہد پر آمادہ کیا کسانوں کو متحرک کرنے کے لیے گاؤں، گاؤں جانے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۱فروری سے ۱۵فروری تک جیپ کے ذریعے اور پیدل چل کر سینکڑوں دیہاتوں کو ۱۸فروری کے دن ٹیمپل ڈیرہ آنے کے لیے آمادہ کیا گیا۔ ۱۶فروری کو بھوک ہڑتالی کیمپ بنانے کے لیے ہم ٹیمپل ڈیرہ کے ایک ہوٹل کے مالک محمد عالم پندرانی کے پاس آئے اس نے اپنا سارا ہوٹل مفت میں بھوک ہڑتالی کیمپ کے لیے دے دیا ہم نے چٹائیاں بچھا کر ۱۶فروری کو ہی کیمپ کھول دیا ایک گھنٹے میں سینکڑوں کسان کیمپ کے اندر اور باہر جمع ہو گئے یہ صورتِ حال دیکھ کر ضلعی انتظامیہ اور جاگیردار بوکھلا گئے۔ مختارکار ٹیمپل ڈیرہ نے لیویز کی نفری کے ساتھ بھوک ہڑتالی کیمپ پر حملہ کر دیا شدید لاٹھی چارج کے بعد کراچی کے ہم تین ساتھیوں کے ساتھ پی پی پی کے ضلعی سیکریٹری پیر بخش سامت، کسان کمیٹی کے ہزار خان بنگلوئی، سٹی کے صدر ڈاکٹر احمد حسن ہندانی، نائب صدر میر ملک زار ڈومکی اور جمعیت علما اسلام کے غلام قادر مینگل کو گرفتار کر کے ٹیمپل ڈیرہ کی لاک اَپ میں بند کر دیا۔ ہمارا گروپ گرفتاری کے بعد لاک اَپ تک نعرے لگاتا رہا۔ ۱۸فروری کے دن بھوک ہڑتال کرنے کا اعلان کرتا رہا۔ ہماری گرفتاری سے پہلے کسانوں کے دو مطالبات، گرفتار کسانوں کی رہائی اور سرسوں کی فصل کسانوں کے حوالے کی جائے، پورے ہو چکے تھے باقی ایک مطالبہ کسانوں کے قاتلوں کو گرفتار کرو باقی تھا اس کے ہی نعرے لگاتے رہے۔

۱۷اور ۱۸فروری کی درمیانی شب ٹیمپل ڈیرہ شہر بلوچستان ریزرو پولیس بی آر پی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ۱۸فروری کی صبح ہم نے لاک اَپ کے سامنے والی عمارتوں پر مشین گنیں سنبھالے سپاہیوں کو دیکھا ہم آٹھ قیدیوں نے اعلان کے مطابق صبح ناشتہ کیے بغیر بھوک ہڑتال کر دی لاک اَپ کے اندر نعرے بازی شروع کر دی۔ کسان لاک اَپ پر آتے رہے جان کی بازی لگانے جانے والوں کی طرح ہم لوگوں سے خدا حافظ کرتے جاتے رہے ٹیمپل ڈیرہ آنے والی ساری ٹرانسپورٹ بند ہونے کے باوجود ہزاروں کسان شہر کی سڑکوں پر نکل آئے کسانوں کے نعروں کی آوازوں کے بعد ہم لوگوں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں پھر نعرے شروع ہوئے جلوس ہمارے لاک اَپ کے سامنے کچھ فاصلہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے ہاتھ میں قرآن شریف اٹھا کر روک لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ لیویز اور بی آر پی کی ہوائی فائرنگ میں ایک کسان نے آگے بڑھ کر بندوق کی نال اپنے سینے سے لگا کر زور سے کہا اوپر ہوا میں گولیاں کیوں چلاتے ہو ہمارے سینے پر مارو ۱۸فروری کی رات بی بی سی لندن نے خبر نشر کی کہ جنرل ضیاء الحق کے فوجی حکومت کے خلاف پہلا بڑا مظاہرہ

کر کے کسانوں نے کوئٹہ، سکھر شاہراہ کئی گھنٹوں تک بند کر کے اپنے گرفتار ساتھیوں کی رہائی اور پٹ فیڈر کے شہید کسانوں کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا ہے۔

۱۸اور ۱۹ فروری کی درمیانی شب ہم آٹھ قیدیوں کو ٹیمپل ڈیرہ سے سبی جیل منتقل کردیا گیا جب شام کو ضلعی انتظامیہ نے کسان رہنماؤں کے ساتھ لاک اَپ میں آ کر کسانوں کے قاتلوں کی گرفتاری اور ہم لوگوں کی رہائی کے وعدے پر ہماری بھوک ہڑتال ختم کروائی تھی۔ سبی کی فوجی عدالت نے ہم قیدیوں کو چند دنوں میں سزائیں سنا دیں ہمارے دو ساتھی جن کی سزائیں تین ماہ اور چھ ماہ تھیں سبی میں رہے باقی چھ لوگ جن میں سے چار کی سزائیں ایک ایک سال اور دو کی چھ ماہ تھیں مچھ جیل منتقل کر دیئے گئے۔ ہمارے بعد کراچی کی طالب علم رہنما آصفہ رضوی کی قیادت میں ایس این ایس ایف کی رہنما حمیدہ گھانگھرو مزدور رہنما الطاف الرحمٰن، محمد سلیم بیگ، کسان رہنما پیر شہاب الدین والوں کا دوسرا وفد ٹیمپل ڈیرہ میں بھوک ہڑتال کر کے گرفتار ہوا اور مچھ جیل لایا گیا۔ بلوچستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا کہ سندھ کی اردو اور سندھی بولنے والی دو لڑکیاں بلوچ کسانوں کی حمایت میں بھوک ہڑتال کر کے مچھ جیل آئیں۔ کسانوں کے قاتلوں کی گرفتاری کے بجائے ضیاء الحق کی فوجی عدالت نے ہمیں سزائیں دے کر خود کو بے نقاب کر دیا تھا اس لیے دوسرے وفد کا مقدمہ فوجی عدالت کی بجائے قبائلی جرگے کے حوالے کیا گیا جس کے ایک ممبر میوا خان بگٹی نے جرگے کے ممبران کو مخاطب کر کے کہا کہ جو کام سندھ کے ان بچوں اور بچیوں نے کیا ہے وہ کام ہم کو کرنا چاہیے تھا اس لیے ان پر مقدمہ چلانے کی بجائے ان کو فوراً باعزت طور پر رہا کیا جائے۔ جرگے کے فیصلے پر آصفہ رضوی اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ حیدر آباد کے مزدور رہنما محمد زمان خان، عبدالحیٔ اور گل محمد عرف غلام قادر ڈینھو نے ٹیمپل ڈیرہ میں بھوک ہڑتال کر کے گرفتاریاں دیں۔ پی ایس ایف کے ضلعی رہنما نصیر اللہ رند، بی ایس او کے عطا محمد عاسی، عزیز رند، جبار رند اور دیگر کئی لوگ اس تحریک میں گرفتار ہوئے سب کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

ہم لوگ ابھی مچھ جیل میں تھے کہ گورنر بلوچستان نے ۲۲ مئی ۱۹۷۸ء کے دن بلوچستان کے کسانوں کے حقوق کے قانون بلوچستان ٹیننسی آرڈی نینس کا اعلان کیا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کے دن پٹ فیڈر کے شہید کسانوں کے ورثا ہماری سیاسی جدوجہد کے مکمل کامیاب نہ ہونے کی وجہ

سے قبائلی انتقام کی طرف چلے گئے انہوں نے جمالی سردار گھرانے کے اہم فرد میر محمد مراد جمالی کو کوئٹہ میں قتل کردیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے اتحادی کے قتل پر ٹیمپل ڈیرہ کا نام ڈیرہ مراد جمالی رکھنے کے ساتھ گورنر بلوچستان کو ہدایت کی کہ وہ ملک بھر کے بلوچ سرداروں کا جرگہ منعقد کر کے کسانوں اور مراد جمالی کے قاتل کا فیصلہ کروائے۔ اب تک بلوچ سردار قبائلی جھگڑوں، قتل و غارت گری کو قبائلی غیرت کے نام پر ہوا دیا کرتے تھے۔ پٹ فیڈر کسان تحریک کے بعد خون کا بدلہ عام لوگوں سے لینے کی بجائے حملہ آور سردار گھرانوں سے لیا جانے لگا۔ سارے پاکستان، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے سرداروں نے ۱۷ تا ۲۲ نومبر ۱۹۷۸ء چھ دنوں تک کوئٹہ میں جمع ہو کر پٹ فیڈر کے کسانوں اور جمالی جاگیرداروں کے قاتلوں، زخمیوں، فریقین کے چھینے ہوئے اسلحے کا فیصلہ کیا جمالی سرداروں نے اپنا ایک خون معاف کیا تو بروہی سرداروں نے اپنے چار لہڑیوں کے خون معاف کردیئے، یعنی ایک سردار گھرانے کے فرد کے مقابل چار کسانوں کا خون برابر کردیا گیا۔ جرگہ کسان نمائندوں کا نہیں بلکہ سرداروں کا تھا، مگر پھر بھی اس جرگے نے پٹ فیڈر کی زمینوں کا قبضہ کسانوں کے پاس رہنے کی اس وقت تک حمایت کی جب تک حکومت پاکستان ۱۹۷۲ء کا زرعی اصلاحات کا مارشل لاء ریگولیشن منسوخ نہیں کرتی۔ پٹ فیڈر کے کسانوں کی جدوجہد کے بعد جنرل ضیاء الحق کی فوجی آمریت کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ بھٹو دور کی زرعی اصلاحات ختم کرنے کا اقدام اٹھائے۔

سارے ملک میں جنرل ضیاء الحق کی وحشیانہ مارشل لاء حکومت کو یہ پہلا دھچکا تھا۔ یہ پاکستان کے عوام کی وہ تاریخی کامیابی تھی جو 'پٹ فیڈر کسان تحریک' سے حاصل ہوئی اور کتاب 'پٹ فیڈر کسان تحریک' نے عوامی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے عوام دوست، سیاسی کارکنوں کو جو حوصلہ دیا وہ تاریخی واقعات کی محرک قوت بن رہا ہے۔ بلوچستان کے ضلع جعفر آباد کے گوٹھ غلام محمد جمالی کے وہ ہاری خاندان جنہوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کی رات اپنے جمالی سرداروں کی طرف سے بروہی قبیلے کے کسانوں کے قتل کے خلاف اپنے سرداروں کی بجائے بروہی مظلوم کسانوں کا ساتھ دے کر جس طرح ایک نئی تاریخ رقم کی تھی آج اس سے بھی بڑھ کر گوٹھ غلام محمد جمالی کے کسانوں نے اپنے قبیلے کے سردار کے بیٹے کے سامنے بی پی۔۲۵، جعفر آباد نمبر۱، کے ضمنی انتخابات میں اپنی بہادر بہن مائی جوری جمالی کو الیکشن میں امیدوار نامزد کر کے ثابت قدمی سے

ڈٹے رہنے، ساری مشکلات کے باوجود بغیر وسائل کے زبردست قبائلی اور ریاستی دباؤ کے باوجود اپنے گاؤں کی پولنگ جیتنے کی جو تاریخ ۱۰ مارچ ۲۰۱۰ء کے دن رقم کی ہے وہ عوام کی تاریخ کی ایک اور مثال بن کر دنیا کے سامنے آئی ہے اور آتی رہے گی۔ مجھے آج اس بات پر بھی فخر ہے کہ مائی جوری جمالی کا انتخابی معرکہ تاریخ سازی کا اہم واقعہ بنے گا جس میں میرا، میری بیوی شاہینہ، ثانیہ ملک، آدم ملک، مومن جمالی، مائی نصیبہ اور دیگر بہت سارے عوامی پارٹی (پاکستان) کے ساتھی مجاہدانہ تاریخی کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ عوام کی تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی تاریخ سازی ہو۔ آیئے ہم سب مل کر عوام کی تاریخ نویسی کے لیے تاریخ سازی میں اپنا کردار ادا کریں۔

# عوام اور مزارات

ڈاکٹر غافر شہزاد

برصغیر پاک و ہند میں صوفیاء کی شخصیت اپنی زندگی میں اور وصال کے بعد ان کی جائے تدفین مریدین اور عوام الناس کیلئے ہمیشہ سے باعث کشش رہی ہے صوفی یا اس کے مزار کا وجود مسلم سوسائٹی کے قصبوں اور شہروں کے بیچ میں ایک مقناطیس جیسی حیثیت رکھتے ہیں، صوفیاء جیسی ذہنی فریکوئنسی رکھنے والے مرید اور پیروکاران کی جانب کھچے چلے آتے ہیں، جس طرح مقناطیس کی کشش کا اپنا حصار ہوتا ہے جسے میگنیٹک فیلڈ (Magnetic Field) کہا جاتا ہے، اس طرح صوفیاء کا بھی روحانی کشش کا حصار ہوتا ہے اور جو جتنا قریب آتا جاتا ہے، اس کے دل و دماغ پر صوفی یا اس کی جائے تدفین کی کشش کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے البتہ جو لوگ اپنی فطرت میں فولادی اوصاف (1) نہیں رکھتے، ان کا ان صوفیاء کی کشش کے حصار میں پڑا رہنا ان پر کوئی اثرات مرتب نہیں کرتا۔ مزارات پر دن رات عوام الناس کی حاضری، قرآن خوانی، نوافل اور دیگر مذہبی و روحانی تقریبات کا انعقاد صوفی کی جائے تدفین کے گرد کشش کے ہالے کو اور بھی توانا اور طاقتور بناتا ہے۔ اور جس طرح مقناطیس کے پاس پڑے ہوئے لوہ چون کے ذرات میں کچھ وقت گزرنے کے بعد مقناطیسی صفات پیدا ہونے لگتی ہیں، بالکل ایسے ہی صوفیاء کی قربت میں رہنے والوں میں خوابیدہ روحانی صلاحیتیں بیدار ہونے لگتی ہیں۔

اس انداز نظر سے اگر صوفیاء اور ان کے مراکز کو دیکھا جائے تو مسلم معاشرے میں ان کا کردار اور حیثیت ایک ایسے مرکز و محور کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ جس کے گرد مسلم معاشرے کی تمام سرگرمیاں گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہمارے آج کے مقالے کا موضوع صوفیاء اور انکے مزاروں کے ساتھ عوام الناس کے تعلق کی مختلف جہات اور پرتوں سے متعلق ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ عوام

کس کس سطح پر مزارات اوران پر انعقاد پذیر ہونے والی سرگرمیوں میں علمی اور روحانی سطح پر شمولیت اختیار کرتے ہیں، ان کا کردار کس انداز میں ان تقاریب رسومات اور سرگرمیوں کو متاثر کرتا ہے اور اگر مزار پر تشکیل پانے والے منظرنامے سے عوام کا کردار نکال دیا جائے تو اس کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

گزشتہ ایک ہزار برسوں سے برصغیر کی سرزمین پر بادشاہوں، مہاراجوں سے لیکر عوام الناس تک لوگ تواتر سے مزارات یا درگاہوں پر حاضری دے رہے ہیں، ان کی حیثیت و مرتبہ معاشرے میں خواہ کچھ بھی ہو، حاضری دینے والوں میں ایک قدر مشترک رہی ہے اور وہ یہ کہ ان کے دل میں کوئی خواہش، کوئی تمنا اور کوئی طلب موجود ہوتی ہے، جسے دل میں لیے حاضری کیلئے یہ لوگ صوفیاء کے آستانوں پر آتے ہیں۔ ان کے آنے کے انداز میں فرق ہو سکتا ہے، کوئی ننگے پاؤں آتا ہے، کوئی ڈھول کے ردھم پر دھمال ڈالتا ہوا آتا ہے، کوئی نہایت خاموشی سے تنہا حاضری دیتا ہے تو کچھ لوگ ایک جماعت کی شکل میں درگاہوں پر حاضری دیتے ہیں۔ اسی طرح جب ان عقیدت مندوں کے من کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو اظہار تشکر کے بھی بے شمار انداز ہیں، نذرانہ جات کی بھی بیسوں قسمیں ہیں، کوئی سینکڑوں ہزاروں مربع زرعی اراضی وقف کر دیتا ہے، (2)۔ کوئی حلیم دال گوشت کی دیگیں نذر کرتا ہے تو کوئی کیش کی شکل میں کرنسی نوٹ مزار کے منتظمین کے رکھے ہوئے کیش بکسز میں ڈالتا ہے۔ (3)۔ خانقاہ کتنی بھی چھوٹی یا بڑی ہو، صوفی کیسی بھی روحانی طاقتوں کا حامل ہو، خانقاہ شہر کے اندر تنگ گلیوں میں ہو یا شہر سے باہر کسی ویرانے میں، عقیدت مندوں کی حاضری اور پھر ان کے اظہار تشکر کے انداز کی یہی اشکال سامنے آتی ہیں۔ صوفی کی درگاہ تک کھینچ کر لانے والی قوت اس کے اپنے من کی مراد کے حصول کی ایک موہوم سی امید ہوتی ہے جو اس کی انگلی پکڑ کر اس کو آستانے کی جالی کے پاس لا کھڑا کرتی ہے۔ صوفی اپنے عقیدت مندوں کے دل میں اپنا مقام متعین کرنے کیلئے کبھی یہ کہتا ہے کہ ایک صوفی اپنے مریدوں کے درمیاں میں یونہی ہے جیسے ایک پیغمبر اپنے صحابہ کے درمیان میں، کبھی وہ یہ کہتا ہے کہ ایک صوفی کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح مہمان نواز ہونا چاہیے۔ صوفیاء نے ان درگاہوں کی قدر و تکریم بڑھانے کیلئے اور ان اداروں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے اگر اپنے مریدوں کیلئے بہت کڑی تربیت اور سختی روا رکھی ہے تو اپنے لیے بھی کچھ کم قواعد وضوابط نہیں بنائے اور ایک

صوفی کیلئے ایسے معیار مقرر کیے ہیں اور کہا ہے کہ اگر وہ ان پر پورا اترتا ہے تو وہ صوفی یا شیخ طالب کو سلوک کی منازل طے کرواسکتا ہے۔ سیئر الاولیاء میں (4)۔ درج ہے کہ شیخ کا ادنی حال یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان اوصاف سے آراستہ ہو، اول یہ کہ وہ مراد ہوتا کہ مرید کی تربیت اس سے ممکن ہو۔ دوسری صفت یہ ہے کہ سلوک کے راستے کو اس نے طے کیا ہوتا کہ وہ راستے کی صحیح رہنمائی کر سکے تیسری صفت یہ کہ خود صاحب آداب ہوتا کہ مریدوں کو آداب سکھا سکے چوتھے یہ کہ صوفی صاحب جودو عطا اور بے ریا ہو، پانچویں یہ کہ مرید کے مال پر بھی ذرا حریص نہ ہو چھٹے یہ کہ جہاں اشارے سے پندو موعظت ممکن ہو صراحت سے احتراز کرے ساتویں یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مرید کو آداب کی تعلیم نرمی سے کرے، غصے اور سختی سے آداب نہ سکھائے، آٹھویں یہ کہ جس چیز کیلئے شیخ مامور ہے اس کے کرنے کا مرید کو صراحت سے حکم دے نویں یہ کہ اس کے شیخ نے جن چیزوں سے منع کیا ہو ان سے وہ مریدوں کو بھی روکے دسویں یہ کہ جب کسی کو اللہ کیلئے مرید کرے پھر اسے کسی کیلئے رد نہ کرے۔ پس جس صوفی میں یہ صفات ہونگی اس کے مرید صادق القول ہونگے۔

ایک دوسری جگہ سیئر الاولیا (5)۔ میں صوفی یا شیخ کے بارے میں لکھا ہے کہ جس کو باری تعالی نے علم، عقل و عشق کی نعمتیں دی ہیں جو ان اوصاف سے آراستہ ہو وہ خلافت مشائخ کے فرائض نہایت عمدگی سے سرانجام دیتا ہے۔ ایک اور جگہ مرید کیلئے کڑی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے سیئر اولیاء میں تحریر ہے کہ شیخ جب کسی کو بیعت کرتے تو فرماتے "تم اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا اور اہل دنیا کو پیدا ہی نہیں کیا گیا" جب خرقہ پہناتے تو فرماتے یہ لباس پرہیز گاری کا ہے یہ بہتر ہے اور آخرت کی خوبیاں پرہیز گاری کیلئے ہیں۔ (6)

سیئر اولیاء میں ایک اور موقع پر شیخ اپنے مرید کو ہدایت کرتے ہوئے کہتا ہے (7)۔ "دنیا سے علیحدہ رہو، اور خلق خدا سے جدا ہو جاؤ، شیطان سے لڑو اور اس وقت اپنے پیر کو یاد کرو اور نفس و خواہشات کے گھوڑے کے منہ میں تقوی کی لگام دو اور گوشہ نشین ہو جاؤ" ایک صوفی یا شیخ اور ایک مرید کیلئے اس طرح کی کڑی شرائط کو نافذ العمل کرنے کے بعد جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

اس سے وابستہ افراد یقیناً ایک بہتر معاشرت، مطمئن زندگی، علم و عمل سے وابستگی، تقوی و پرہیز گاری جیسی صفات و خصائص سے مالا مال ہونگے، جوں جوں مرید ان معاملات پر عمل پیرا ہوتا جاتا ہے، شیخ کی اس کے دل و دماغ پر گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خود شیخ کی

طرح سوچنے اور عمل کرنے لگتا ہے اور پھر ہدایت کا سرچشمہ بن کر روشنی پھیلانے لگتا ہے۔ جس طرح صوفی اور مرید کیلئے قواعد وضوابط بنائے گئے ہیں ایسے ہی درگاہوں پر حاضری کی خاطر آنے والوں کیلئے بھی ایک ضابطہ اخلاق ترتیب دیا گیا ہے درگاہوں پر دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو وہاں کم وبیش رہائش پذیر رہتے ہیں اور دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو وہاں حاضری کیلئے آتے ہیں اور سلام کے بعد چلے جاتے ہیں اگر ضرورت ہو تو دو چار دن قیام بھی کر لیتے ہیں مگر یہ عارضی قیام ہوتا ہے۔ عوارف المعارف میں خانقاہ میں رہائش پذیر لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔(8)۔ پہلی قسم ''اہل خدمت'' لوگوں کی دوسرے ''اہل صحبت'' کہلاتے ہیں اور تیسرے ''اہل خلوت'' ہیں گئے سالوں میں خانقاہوں پر رہائش پذیر ان لوگوں کی دو بنیادی ضروریات تھیں، پہننے کیلئے لباس، اور کھانے کیلئے اشیائے خورد ونوش، دونوں کے حصول کیلئے یا تو کسب کو اپنایا جاتا یا پھر خیرات یا فتوح پر گزارہ کیا جاتا۔ خانقاہ کا ادارہ وہاں رہائش پذیر لوگوں کے دلوں کو صاف کرتا، علم وریاضت کے حصول کیلئے معاونت کرتا، تبادلہ خیالات کیلئے جگہ فراہم کرتا۔

صوفی کے وصال کے بعد مزار کی دیکھ بھال اور انتظامات کی نگرانی متولیوں، گدی نشینوں یا شیخ کے خاندان سے متعلق لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو زیارت کیلئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں، ان کیلئے میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ نان ونفقہ درگاہ سے حاصل ہونے والے نذرانہ جات سے مہیا کیا جاتا ہے۔ آج کی ملٹی نیشنل کمپنی کی طرح یہ متولی اپنے زائرین کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ سہولیات فراہم کرنے کے خواہاں رہتے ہیں گئے زمانو ں میں تو خانقاہ رں پر آنے والوں کیلئے بھی اخلاقیات طے کر دی گئی تھیں (9)۔ مثلاً اگر کوئی خانقاہ پر آنا چاہتا تو اس کا سہ پہر سے پہلے پہنچنا لازم تھا۔ خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نفل، سلام اور پہلے سے موجود لوگوں سے گلے ملنا اور ان سے گرمجوشی سے ہاتھ ملانا لازم ہوتا تھا۔ روایت یہ رہی ہے کہ آنے والے کی خدمت میں جو بھی میسر ہو کھانے پینے کیلئے پیش کیا جاتا۔ خانقاہ میں عموماً تین دن تک قیام کرنے کی اجازت ہوتی، ان تین دنوں میں آنے والے کا مہمان کی طرح خصوصی خیال رکھا جاتا، رخصت ہوتے وقت شیخ سے اجازت لی جاتی۔ تین دن سے زیادہ قیام کرنے والوں کیلئے زائرین کی خدمت بجالانا لازم ہوتا۔ پہلے سے قیام پذیر لوگوں پر لازم ہوتا کہ وہ ہر نئے آنے والے کو خوش دلی سے ملیں۔ اس کا احترام کریں شفقت سے پیش آئیں

، خدمتگاروں کا گفتگو کے دوران نرم اور شفیق رہنا لازم تھا۔ اگر نئے آنے والے کو خانقاہ کے آداب سے واقفیت نہیں تو اہل خانقاہ کو اس کی جانب حقارت سے دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

چشتی خانقاہوں میں جماعت خانے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے، جماعت خانہ اجتماعی زندگی کیلئے ایک مرکز تھا جہاں بادشاہ سے فقیر تک سبھی قیام پذیر ہوتے تھے یہیں پر اخلاقی اور روحانی کلچر تشکیل پاتا، یہ سماجی اور ثقافتی زندگی کے مراکز تھے۔(10) چشتیوں کے ہاں مہمان نوازی ایک اہم جز رہا ہے۔

چشتی صوفیاء کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاں جائے اور اسے کھانے کیلئے کچھ پیش نہ کیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ کسی مردہ شخص کے ہاں گیا، اگر خانقاہ میں کھانے کیلئے پیش کرنے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو کم از کم پینے کیلئے پانی ضرور پیش کیا جاتا۔ آج مزارات پر ہونے والی سرگرمیوں اور رسومات کے انعقاد نے ایک پیچیدہ شکل اختیار کر لی ہے، حاضری دینے والے زائرین کے پیش نظر وہ مقاصد نہیں رہے، جو کبھی ہوتے تھے آج لوگ علم کے حصول کیلئے یا روحانی ریاضت کیلئے ان مراکز پر نہیں آتے۔ علوم کے حصول کیلئے مدرسے اور یونیورسٹیاں الگ اداروں کے طور پر کام کر رہی ہیں جبکہ روحانی ریاضت کیلئے انفرادی اور نجی سطح پر تربیت کیلئے گوشے اور مراقبہ گاہیں رواج پا گئی ہیں اب مزاروں پر صرف دلی مرادیں پوری کرنے کی لگن میں زائرین حاضری کیلئے آتے ہیں لہذا درگاہوں پر ہونے والی تمام سرگرمیاں انہی مقاصد کے حصول کے گرد گھومتی ہیں۔ عوام ایک سائل کی طرح دستک دیتے ہیں اور شیخ ایک داتا یا گنج بخش کی طرح نوازنے کا کام عوام کے فہم و یقین کے مطابق سرانجام دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ مزارات پر سرانجام پانے والی سرگرمیوں نے ایک مختلف اور منفرد شکل اختیار کر لی ہے۔ آج دربار یا درگاہ کا انتظام اتنا سادہ اور ان رسومات کی ادائیگی ایسی عمومی نہیں رہی روز بروز حاضری کیلئے آنے والے زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس سارے عمل کو اور بھی تہہ دار اور پیچیدہ کر دیا ہے ان رسومات کے بھرپور انعقاد نے درگاہ کی فعالیت اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے، پہلے پہل مزارات پر حاضری کی اہم ترین اور بنیادی رسم سلام کی ہوتی تھی اور ہر زائر حاضری کے بعد سلام و فاتحہ خوانی کرتا تھا بعض لوگ نوافل بھی ادا کر لیتے تھے مگر اب ان رسومات میں تنوع آ گیا ہے اور یہ تنوع ہی دراصل زائرین کو دربار شریف پر انعقاد پذیر ہونے والی سرگرمیوں میں شمولیت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتا ہے، زائرین

کی جتنی زیادہ بھرپور شمولیت ہوگی، درگاہ عوام کی نظروں میں اتنی ہی زیادہ مقبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے اور حاضری کیلئے آنے والوں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

آج درگاہ پر اہم ترین رسم چادر پوشی کی ہے جسے سرکاری و پرائیویٹ ہر دو سطح پر سرانجام دیا جاتا ہے۔عرس کی سالانہ تقریبات ایک دن سے بڑھ کر تین دن اور بعض اوقات تو کئی ہفتوں پر پھیل جاتی ہیں۔عرس کے علاوہ دربار شریف پر رسم غسل اہم ترین ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت علی ہجویری ؒ کے مزار پر رسم غسل 9 محرم الحرام کو ہوتی ہے جب کہ ان کا عرس 18 تا 20 صفر المظفر کو انعقاد پذیر ہوتا ہے۔اسی طرح دربار حضرت سخی سلطان باہوؒ پر بھی رسم غسل 9 محرم الحرام کو ادا ہوتی ہے جبکہ ان کا عرس قمری سال میں جمادی الثانی کی پہلی جمعرات کو ہوتا ہے۔اس لحاظ سے سال میں دو اہم مواقع بن جاتے ہیں جس میں لوگوں کی شرکت بھرپور ہوتی ہے۔حضرت علی ہجویری ؒ کے مزار پر عرس کے موقع پر چادر پوشی کے بعد دودھ کی سبیل کا افتتاح کیا جاتا ہے جہاں تین دن تک لاہور اور اسکے گردو پیش کے تمام شہروں سے گوالے دودھ کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور زائرین کو خالص دودھ پینے کیلئے میسر آتا ہے۔تصوف کے مختلف موضوعات پر دو دن سیمینار ہوتا ہے، ہر روز تین سے چار سیشن ہوتے ہیں، دو دن قوالی کی محفل برپا رہتی ہے ملک بھر سے منتخب قوال عارفانہ کلام پیش کرتے ہیں۔

تیسرے اور آخری روز رات کو اختتامی دعا ہوتی ہے جس میں شرکت کیلئے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔عرس کی سہ روزہ تقریبات اور غسل کے علاوہ حضرت علی ہجویری ؒ کی درگاہ پر ہر ماہ کی دس تاریخ کو محفل ہوتی ہے۔حضرت علی ہجویری ؒ کے یوم وصال 19 صفر المظفر کی نسبت سے ہر ماہ 19 تاریخ کو ماہانہ ختم شریف ہوتا ہے۔قرات و نعت خوانی ہوتی ہے، ہر قمری ماہ کی آخری جمعرات کو جامع مسجد حضرت علی ہجویری ؒ میں بعد از نماز عشاء محفل نعت ہوتی ہے، علاوہ ازیں 12 ربیع الاول کی نسبت محفل میلاد کا انعقاد ہر قمری ماہ کی بارہ تاریخ کو کیا جاتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ کے یوم وصال 6 رجب کی نسبت سے ہر قمری ماہ کی 6 تاریخ کو چھٹی کا ختم شریف کروایا جاتا ہے۔ہر جمعرات کو نماز عصر اور ظہر کے دوران میں محفل سماع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔بعد از نماز مغرب و عشا محفل نعت کا انعقاد کیا جاتا ہے۔اسی طرح حضرت بابا فرید ؒ کے مزار مبارک پر عرس کی تقریبات کا آغاز 24 ذیعقد کو بعد از نماز مغرب ہو جاتا ہے اس وقت دیوان صاحب

دربار کے اندر قبر کے سرہانے کی طرف جالی کے ساتھ دھاگہ باندھتے ہیں جسے چلہ باندھنا کہتے ہیں 25 ذوالحج تا 5 محرم الحرام روزانہ 9 بجے چینی پر ختم شریف پڑھا جاتا ہے، چلے اور چینی تقسیم کی جاتی ہے درگاہ شریف کا غلاف تبدیل کیا جاتا ہے۔ جبکہ یکم تا پانچ محرم الحرام روزانہ بعد از نماز عصر دیوان صاحب سماع سنتے ہیں، کوڈیاں اور شکر تقسیم کرتے ہیں 5 تا 9 محرم الحرام کو زائرین کیلئے بعد از نماز مغرب بہشتی دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جو فجر کے وقت بند کیا جاتا ہے، یہ دروازہ پہلے دو دن دیوان صاحب کھولتے ہیں جبکہ باقی دن ضلعی واوقاف انتظامیہ کے نمائندے بہشتی دروازہ کھولتے ہیں، (11)

10 محرم الحرام کو صبح دیوان صاحب مزار کے غسل کی رسم ادا کرتے ہیں۔اور بعد از نماز مغرب رسم صندل ادا کی جاتی ہے۔رسم صندل میں دربار کے تعویذ کے اوپر بنی جھری میں صندل بھر دیا جاتا ہے اور پھر باہر نکل کر دربار کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جو کہ بعد ازاں ماہ صفر کی دوسری جمعرات کو دیوان صاحب بعد از نماز مغرب کھولتے ہیں۔رسم صندل کے بعد عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔

یہ روایات اور رسومات جو باقاعدگی سے ان مزارات پر انعقاد پذیر ہوتی ہیں ان میں عوامی سطح پر لوگوں کی شمولیت ان کے انعقاد کی کامیابی کی ضمانت بنتی ہے ان رسومات و روایات کی ادائیگی دربار پر حاضری دینے والوں کو ایک نظم وضبط اور بغیر الجھاؤ کے تقریبات میں شرکت کے مواقع فراہم کرتی ہے یہ رسومات اور روایات کوئی جامد شے نہیں ہیں وقت کے ساتھ ان کے طرز ادائیگی اور نوعیت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہ تبدیلی عوام کیلئے اور زیادہ کشش کا باعث بنتی ہے۔ یہ رسومات و روایات دراصل غیر مطبوعہ اخلاقی ضابطے ہیں جو مزار پر وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیوں کو منظم کرنے میں معاونت کرتے ہیں اور زائرین کو شمولیت کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔آج مزارات پر ان رسومات و روایات کے بغیر عرس و دیگر تقریبات کے انعقاد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ،گدی نشین اور متولی خود ایسی رسومات کو فروغ دیتے رہتے ہیں۔ان روایات و رسومات کے انعقاد کے پیچھے گدی نشینوں اور متولیوں کے اپنے مقاصد ہوتے ہونگے ،مگر ان کے انعقاد سے عام آدمیوں کو درگاہ کی رسومات میں عملی شمولیت کے مواقع ملتے رہتے ہیں اور یوں دلی وروحانی تسکین حاصل ہوتی رہتی ہے، گزشتہ ایک ہزار سالوں سے یہ مزار اور خانقاہیں یہی مقاصد پورے کر رہے

ہیں، ظاہری ادائیگی میں تبدیلی آتی رہتی ہے مگر بنیادی مقصد آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا۔

## حوالہ جات:

1۔ یہاں ''فولادی اوصاف'' کی ترکیب مقناطیس کی صفت کے حوالے سے عارتیاً لی گئی ہے۔

2۔ حضرت بابا فرید''، حضرت خواجہ معین الدین چشتی'' اور حضرت سخی سرور'' کے مزارات کے ساتھ ہزاروں ایکڑ اراضی سلاطین نے وقف کی تھی۔

3۔ 1960ء سے صوبہ پنجاب میں محکمہ اوقاف نے مزارات کا کنٹرول سنبھالا ہوا ہے۔ ہر مزار پر ضرورت کے مطابق محکمہ لوہے کے بنے ہوئے کیش بکس رکھتا ہے تا کہ زائرین نقدی کی صورت میں نذرانہ جات اس میں ڈال سکیں۔ حضرت علی ہجویری'' کے مزار کی حدود میں چالیس کے قریب کیش بکس رکھے گئے ہیں۔

4۔ امیر خورد ''سیر الاولیاء، اردو سائنس بورڈ لاہور (1996) صفحہ 545

5۔ ایضاً صفحہ 540

6۔ ایضاً صفحہ 509

7۔ ایضاً صفحہ 508

8۔ شہاب الدین سہروردی ''عوارف المعارف'' بیروت (1966)

9۔ ایضاً

10۔ غافر شہزاد'' پنجاب میں خانقاہی کلچر'' فکشن ہاؤس (2007) صفحہ 63-64

11۔ حضرت بابا فرید'' کے مزار پر بہشتی دروازہ کھولنے کا شیڈول لاہور ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی تعمیل میں طے کیا گیا ہے کہ کس دن کون یہ رسم سرانجام دے گا۔

# یوگوسلاویہ کی کسان تحریکیں

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

**ابتدائیہ:**

انسانی معاشروں میں استحصالی نظام اور استحصالی سماجی ڈھانچوں کے خلاف مزاحمتی عمل اور کوششوں کی ایک طویل تاریخ ہے۔ تمام معاشروں اور علاقوں میں سماج کے بیشتر گروہ اور افراد اپنے حالات کے مطابق مزاحمتی کوششیں کرتے اور استحصالی نظام کے خاتمے کے لئے اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اس مضمون میں دوسری جنگ عظیم میں نازی جرمنی اور فاشسٹ اٹلی کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے اور جنگ کے خاتمے پر وجود میں آنے والی ایک عوامی اور سوشلسٹ ریاست یوگوسلاویہ (Yoguslavia) میں اٹھنے والی کسان تحریکوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائیگی۔ ۱۹۸۰ میں مارشل ٹیٹو کے انتقال کے بعد ۱۹۹۰ء میں نسلی اور مذہبی بنیادوں پر سامنے آنے والے اختلافات کے نتیجے میں اس ملک کی تقسیم ہوئی اور یوگوسلاویہ چھ مختلف چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم ہوگیا۔

اس مضمون کے رقم کرنے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ سرد جنگ کے دوران پاکستان میں تمام ترقی پسند اور عوام دوست قوتوں نے ابتدائی طور پر سوویت یونین کو اپنے ماڈل کے طور پر دیکھا اور اس کی تاریخ اور ادب کے بارے میں بھرپور طریقے سے جاننے کی کوشش کی گئی اور بعد ازاں چین کے کامیاب انقلاب اور بائیں بازو کی تحریک کے ماسکو اور بیجنگ کے دھڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد ہماری توجہ ان دونوں ممالک پر ہی مرکوز رہی اور بیشتر لوگ تیسرے ملک کی طرف نہ دیکھ سکے جو کہ یقیناً مکمل طور پر سوشلسٹ اور عوام دوست تھا لیکن وہ کسی بھی دھڑے بندی کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ تھا یوگوسلاویہ۔ مارشل ٹیٹو نے تمام تر دباؤ کے باوجود اپنے ملک کی ایک منفرد

شناخت برقرار رکھی۔ ٹیٹو نے جمال عبدالناصر، سکارنو اور نہرو کے ساتھ مل کر غیر وابستہ تحریک (Non-Alliance Movement) کی بنیاد رکھی۔ کسی بھی دھڑے میں شامل نہ ہونے کے باعث سیاسی اور معاشی طور پر نقصان بھی اٹھانا پڑے لیکن یوگوسلاویہ جنگ کی تباہکاریوں کے باوجود ایک مضبوط اور مستحکم ملک کے طور پر اپنا عالمی کردار ادا کرتا رہا۔

## یوگوسلاویہ کی کسان تحریک کی تاریخ

یہ ملک وسطی یورپ کے ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں دنیا کی کئی عظیم سلطنتوں کا اثر ونفوذ رہا اور انہوں نے اپنے قبضے کو برقرار رکھنے اور اس کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اس علاقے میں کئی جنگیں لڑیں۔ اس کے اطراف میں آسٹریا، اٹلی، جرمنی، ترکی اور ہنگری جیسے اہم ممالک اور بادشاہتیں واقع رہیں جو کہ مختلف اوقات میں اپنی سلطنت وں کو وسعت دیتے رہے اور اپنی سلطنتوں کو مزید توسیع دینے کے لئے اس علاقے پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان فوجی مہم جوئیوں نے عام لوگوں میں بے چینی کو جنم دیا جو کہ دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ محنت کشوں اور کسان تحریکوں کو آگے بڑھانے کا باعث بنیں۔

اس علاقے کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے میں بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں شمال اور شمال مغرب سے جرمن قبائل نے جنوب کی طرف آنا شروع کیا۔ ان کے بڑی تعداد میں آنے کے باعث بالآخر انہوں نے اس علاقے میں سلطنت روم کے اثر کو کم کرنا شروع کر دیا۔ یہ علاقہ اس وقت سلطنت روم کا حصّہ تھا۔ جرمن قبائل کی آمد نے اس علاقے کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے پر کئی اثرات چھوڑے۔ اوّل تو رومی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی یہاں جرمن اثرات بڑھنے لگے۔ آبادی میں اضافہ ہوا اور جرمن کیونکہ مختلف قبائل کی صورت میں آئے تھے اس لئے انہوں نے یہاں جاگیرداری کی ابتدائی شکل کو قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل یہاں کے کسان نسبتاً آزاد تھے یا وہ رومی سلطنت کے اہلکاروں کو مخصوص ادائیگی کے علاقہ کچھ مزید بوجھ نہیں اٹھاتے تھے۔ جرمن قبائل کے اس علاقے میں منتقل ہونے کے باعث یہ رشتے قدرے تبدیل ہوئے اور کسانوں کی آزادی پر کاری ضرب پڑی۔ اب وہ آزاد کسان ہونے کے بجائے نئے حملہ آور جرمن قبائل کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارے بن

گئے۔

اس علاقے میں ایک اور اہم تبدیلی آٹھویں صدی میں آئی جب رومی سلطنت (جو کہ درحقیقت جرمن ریاست بن چکی تھی لیکن رومی ریاست ہی کہلاتی تھی) کے حکمران چیمرلین نے عیسائیت کو مذہب کے طور پر اپنا لیا۔ اس کے اس تبدیلی مذہب کے پس پشت دراصل سیاسی محرکات تھے۔ وہ عیسائیت اپنا کر اس علاقے میں جاری چھوٹی چھوٹی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کا خاتمہ چاہتا تھا۔ اس کے تبدیلی مذہب کے عمل کے نتیجے میں پادریوں کو تبلیغ کی آزادی حاصل ہوگئی اور جلد ہی یہ عیسائیت کا مرکز بن گیا اور ویانا پاک جرمن بادشاہت (Holy Roman Empire) کا دارالسلطنت بن گیا۔ آئندہ چند صدیوں میں عیسائیت نے اس علاقے پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کیا اور پادری آئندہ چند دھائیوں میں سلطنت کے تقریباً اکثر چھوٹے بڑے شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں ایک طاقتور کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آگئے اور ریاست کے امور پر اثرانداز ہونے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی نجی زندگی میں بھی دخل اندازی کرنے لگے۔

گیارہویں صدی کے آغاز تک اس علاقے میں جاگیرداری کا مکمل نظام قائم ہو چکا تھا اور ساتھ ہی عیسائیت بھی لوگوں کی زندگی کی ایک بڑی حقیقت بن چکی تھی۔ جرمن جاگیرداری کے دور میں زمینوں کے حقوق کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا۔ پہلی قسم کی زمین وہ تھیں جن پر جاگیرداروں کے مکمل حقوق ثابت تھے اور وہ کسانوں کو بغیر کسی رکاوٹ و نوٹس کے بے دخل کرنے کا اختیار رکھتے تھے جبکہ دوسرے قسم کی زمینیں وہ تھیں جن کا بیشتر بوجھ تو کسانوں پر تھا لیکن زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کی حالت ان سے قدرے بہتر تھی جو کہ اوّل قسم کی زمین پر محنت کرتے تھے۔ جبکہ تیسری قسم کی زمین وہ تھیں جن پر کام کرنے والے محنت کشوں کی حالت قدرے بہتر تھی۔ ان کے حالات اس قدر دگر گونہ تھے جو کہ پہلی اور دوسری قسم کی زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کے تھے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ تیسری قسم کے کسانوں کی تعداد اس علاقے کے محنت کش کسانوں کی کل تعداد کے ۱۰ فیصد سے بھی کم تھی۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کسانوں کی بیشتر تعداد استحصال کا شکار تھی۔ پہلی اور دوسری قسم کے کسانوں سے وصول کئے جانے والی ٹیکس کی شرح اور رقم بھی زیادہ ہوتی تھی۔ کسانوں کے اس نئے بڑھتے ہوئے استحصالی نظام کے خلاف غصّے کو دیکھتے ہوئے بارہویں صدی کے اختتام تک بادشاہ کے حکم پر ملک کے بیشتر علاقوں میں کسانوں

کے مسائل حل کے لئے علاقائی سطح پر عدالتیں قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان عدالتوں میں چرچ اور کسانوں کے علاوہ جاگیرداروں کے نمائندے بھی شامل کئے جاتے تھے لیکن عدالتوں کے سربراہ کا انتخاب ہمیشہ علاقائی جاگیردار کی منشاء پر ہی کیا جاتا تھا۔ اس لئے ان عدالتوں کے قیام کے باوجود کسانوں کو کسی قسم سہولت اور رعایت حاصل نہ ہوسکی۔ کسانوں پر جبری مشقت اور زبردستی ٹیکس وصول کئے جانے کی شکایت پر کوئی خاطر خواہ کاروائی عمل میں نہیں لائی جاسکی تھی۔ ۱۳۷۰ء میں بڑے احتجاج کے بعد پہلی مرتبہ چند قصبوں میں ان عدالتوں کے سربراہوں کے چناؤ میں شہریوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا لیکن اب اس کونسل کے اراکین میں سے بیشتر تعداد کو مقامی جاگیرداروں کی منشاء پر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور نئے قانون کے مطابق کونسل کے سربراہ کو اب کونسل کے دیگر اراکین کے ساتھ مشورہ کر کے جیوری کے متفقہ رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند کردیا گیا۔ کونسل کی اس بدلی ہوئی شکل سے بھی فائدہ کسانوں کے بجائے جاگیرداروں کو ہی ہوا کیونکہ کونسل کی رکنیت میں اکثریت جاگیرداروں اور چرچ کے نمائندوں کو حاصل ہوتی تھی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں جہاں ایک طرف یورپ میں ریاستوں کی نئی تشکیل کا عمل آگے بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف ان کے درمیان جنگ و جدل کے واقعات بھی بڑھتے جارہے تھے۔ اس جنگی کیفیت نے ہولی رومن بادشاہت کے حالات پر بھی اثر ڈالا۔ اس جنگی کیفیت میں سب سے زیادہ نقصان کسانوں اور دیگر محنت کشوں کا ہوتا تھا۔ تیار فصلوں کی تباہی، آگ لگا کر فصلوں کو جلا ڈالنا، علاقوں پر حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں لوٹ مار، توڑ پھوڑ سے متاثر ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد ان غریب محنت کشوں کی ہی تھی، ان جنگی حالات کے باعث کسانوں اور دیگر محنت کشوں کو ٹیکس کا اضافی بوجھ بھی اٹھانا پڑا اور جنگ میں خدمات کے لئے ہر علاقے اور آبادی سے صحت مند افراد کو زبردستی شریک ہونا پڑتا۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے یا پھر پکڑے جانے والوں میں بھی یہی کسان ہوتے تھے۔ جنگوں میں مرنے یا پکڑے جانے والے کسانوں کے خاندانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اس صورتحال نے بڑی بے چینی کو جنم دیا اور کسان وقتاً فوقتاً بغاوتیں کرنے اور مزاحمت کرنے لگے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس علاقے میں تیرہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک چھوٹی بڑی ۱۸۰ کسان مزاحمتی تحریکیں سامنے آئیں۔ ان تحریکوں کا خاتمہ ۱۸۴۸ میں اس وقت ہوا

جب ۱۸۰۴ میں ہولی رومن بادشاہت کے خاتمے کے بعد سامنے آنے والی آسٹروہنگرین شہنشاہیت (Austo Hungarian Empire) نے بالآخر جاگیرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں کسانوں کے ساتھ ہونے والے استحصالی نظام میں بڑی حد تک کمی آئی۔

اس علاقے میں برپا ہونے والی کسان تحریکوں میں سے پانچ کسان تحریکیں بڑی اہم تصور کی جاتی ہیں اور ان کے متعلق بہت سارے دستاویزی ثبوت آج بھی محفوظ ہیں۔ عہد وسطی میں عام طور ہر اٹھنے والے مختلف تحریکوں کے متعلق کئی روایات اور توہمات (Myths) ملتی ہیں۔ لوگوں نے کئی مواقعوں پر یا تو حکمرانوں اور ان بغاوتوں کو کچلنے والوں کو ہیرو اور ماڈل بنا کر پیش کیا ہے یا پھر کہیں کہیں ان بغاوتوں میں حصہ لینے والے کسانوں اور محنت کشوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھ کر انہیں بزدل، کمزور اور ریاست و مذہب کے منحرف قرار دیتے ہوئے ان کے متعلق کئی ایسے قصوں اور کہانیوں کا ذکر کیا ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا۔ ان تحریکوں کے متعلق بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے متعلق بھی کئی مافوق العقل باتیں رقم کی گئی ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ چونکہ اس عہد کا کافی مواد تحریری صورت میں محفوظ ہے اس لئے اس کا بڑی حد تک تعلق موجود اور مہیا تاریخی مواد سے ہے۔

پہلی کسان بغاوت ۱۴۷۸ء میں سلطنت کے شمالی علاقے میں برپا ہوئی۔ اس تحریک کی وجہ یہ تھی کہ جاگیرداروں نے مشترکہ طور پر مل کر کسانوں سے وصول کئے جانے والے ٹیکس کی شرح میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا اور کچھ نئے قوانین نافذ کر دئے جس کے تحت کسانوں کے حقوق ان زمینوں پر کئی برسوں سے کام کرنے کے باوجود کم کر دئے گئے۔ ان استحصالی حالات کے باعث کسانوں کے پاس بغاوت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چونکہ یہ تحریک پہلی مرتبہ اس وسیع پیمانے پر چل رہی تھی اس لئے اس کو ابھر کر سامنے آنے میں کچھ زیادہ عرصہ لگا۔ لیکن چونکہ متاثر ہونے والے کسانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے کچھ عرصے بعد اس کے اثرات شمال سے نکل کر مغرب اور جنوب تک پھیل گئے۔ اس بغاوت کے پس پشت ایک اور وجہ بھی کارفرما تھی۔ مروجہ رواج کے مطابق کسان ٹیکس کا حصہ اجناس کی صورت میں ادا کرتے تھے۔ لیکن نئے قوانین کے مطابق اب انہیں یہ ٹیکس نقدی کی صورت میں ادا کرنے کو کہا گیا۔ کسانوں کو ٹیکس نقد کی صورت

میں ادا کرنے کے لئے فصلوں کو فروخت بھی خود ہی کرنا پڑتا۔ خریدار چونکہ جاگیردار یا انکے حواری ہی ہوتے تھے۔ وہ یہ اجناس ارزاں قیمتوں پر خریدنا چاہتے۔ کسانوں کے اصرار کے باوجود وہ کسی بھی صورت محنت کی مناسب قیمت ادا نہیں کی جاتی۔ دوسری طرف جاگیرداروں اور ریاست کی طرف سے کسانوں پر فصل کی کٹائی کے فوراً بعد ٹیکس کی ادائیگی کا مطالبہ کسانوں کو پریشان کئے رکھتا۔ جاگیرداروں نے مزید استحصالی تدابیر اختیار کرتے ہوئے یہ روش بھی اختیار کرلی کہ ٹیکس کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں کسانوں کو ٹیکس سمیت بھاری جرمانے بھی ادا کرنا پڑیں گے۔ ان تمام ہتھکنڈوں کا مقصود کسانوں کو اجناس ارزاں ترین نرخوں پر فروخت کے لئے کرنا ہوتا تھا۔ کسانوں کے پاس اس صورتحال میں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ اپنی فصلوں کو سستا کرکے ہی فروخت کرکے ٹیکس کی رقم ادا کریں ورنہ جرمانے کی ادائیگی کی صورت میں انہیں اضافی بوجھ برداشت کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ کسانوں کے پاس اجناس کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی کوئی مناسب انتظامات نہ تھے۔ خرابی موسم، بارش، برفباری اور طوفانوں کی صورت میں ان کی ذخیرہ شدہ اجناس کو نقصان پہنچنے کے واضح امکانات تھے۔

کسانوں کی ۱۴۷۸ء کی یہ تحریک سست روی سے آگے بڑھنے کے باوجود چار ماہ تک بھرپور طریقے سے کسانون کے حقوق کے لئے جاگیرداروں اور ان کی فوجوں سے مقابلہ کرتی رہی۔ اس تحریک کی سربراہی متجا (Matjaz) کررہا تھا۔ متجا اس سے قبل ترکوں کے ایک حملے کو روکنے میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے علاقے میں ہیرو کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ اس نے اپنے تین سو کسان ساتھیوں کے ساتھ مل کر ترکوں کو اپنے علاقے پر قبضے کرنے سے روکے رکھا جب تک کہ ہولی رومن بادشاہت کی سرکاری فوجوں نے پہنچ کر ترکوں کو علاقے سے نکال باہر کیا۔ متجا اپنے اس کردار کی وجہ سے علاقے میں ایک رومانوی کردار کے طور پر سامنے آیا۔ بغاوت کے نتیجے میں سرکاری فوجوں کے ہاتھوں کے مارے جانے کے باوجود لوگوں نے اس کی موت کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ لوگوں میں اس Myth نے رواج پالیا کہ متجا اب بھی زندہ ہے اور وہ پہاڑوں میں روپوش ہوگیا اور ترکوں کے خلاف لڑائی میں وہ اب بھی مدد فراہم کررہا ہے اور اس کی بہادری کی وجہ سے ترک کئی حملون کے باوجود اس علاقے پر اپنا مستقل اور مکمل قبضہ حاصل نہیں کرسکے۔ یقیناً ایک رومانوی خیال تھا۔

۱۵۱۵ء میں منظر عام پر آنے والی دوسری بڑی کسان تحریک گذشتہ تحریک سے کافی بڑی تھی اور اس کے اثرات بھی کافی گہرے تھے۔ یہ تحریک اٹلی کی سرحد سے ملحقہ علاقوں میں شروع ہوئی اور پھر دوسرے علاقوں تک پھیل گئی۔ اس بار کسانوں کی بے چینی کی وجہ ہولی رومی بادشاہت اور وینس کی ریپبلک کا جھگڑا تھا۔ اختلافات کے باعث دونوں حکومتوں نے اپنی سرحدیں بند کر دیں اور جنگی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اس صورتحال سے اس بار بھی متاثر عام آدمی ہی ہوا۔ دونوں پڑوسی ممالک میں آمد و رفت بند ہونے سے تجارت وقتی طور پر رک گئی۔ اس علاقے کے کسان اپنی زرعی اجناس کو سرحد پار اٹلی کے علاقوں میں فروخت کر کے آمدنی کر لیتے تھے۔ سرحدیں بند ہونے سے وہ اچانک پریشان کن صورتحال میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس باران کی تحریک میں چھوٹے تاجر کاروباری اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے محنت کش اور خاص طور پر کان کنی سے وابستہ افراد بھی شامل ہو گئے۔ سرحدیں بند ہونے کی وجہ سے وہ بھی متأثر ہو گئے تھے۔ دوسری پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے باعث رومی سلطنت نے ٹیکس کی شرح میں مزید اضافہ کر دیا اور کسانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کا عمل شروع کر دیا۔ ان حالات نے کسانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ علم بغاوت بلند کر دیں۔ اس تحریک کی ضبط شدہ تاریخ کے مطابق اس بار تحریک میں حصہ لینے والے کسانوں اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کی تعداد ۸۰۰۰ سے زائد تھی اور اس کا حلقۂ اثر ابتدائی طور پر اٹلی سے ملحقہ سرحدی علاقہ تھا لیکن جلد ہی تحریک نے پھیل کر دیگر علاقوں کو بھی اپنے دائرۂ اثر میں شامل کر لیا۔

۱۵۱۷ کے ہولی رومن امپائر کی کسان تحریک کے بعد ایک بڑی کسان تحریک بادشاہت کے ان علاقوں میں اٹھی جو کہ موجودہ جرمنی کا حصہ ہیں لیکن اس وقت یہ تمام علاقے ایک ہی سلطنت کا حصہ تھے۔ ۱۵۲۴ء اور ۱۵۲۵ء کے دوران اٹھنے والی اس تحریک نے جرمن معاشرے کے سماجی ڈھانچے پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ مارٹر لوتھر جس نے کہ عیسائیت کے اندار پاپائیت کے خلاف آواز بلند کی تھی اس نے بھی کسانوں کی اس اٹھنے والی تحریک کی حمایت کرنے کے بجائے اس کی شدید مخالفت کی اور اپنے جائز حقوق کے لئے احتجاج کرنے والے کسانوں کو بزدل، مذہب کے انحرافی اور ان کے خلاف کی جانے والے تمام کاروائیوں کی مکمل طور پر حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جرمن کسانوں کی اس تحریک کو کسانوں نے بندشت (Bundschub) کا نام ہے۔

بندشت دراصل کسانوں کے مخصوص جوتے کو کہا جاتا تھا جو کہ زمین پر کام کرتے وقت پہنتے تھے۔ کسان اس علامت کے استعمال کے ذریعے جاگیرداروں کے خلاف اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے نیم غلامانہ زندگی سے نجات اور اپنے مکمل حقوق کی بحالی کے خواہشمند تھے۔ اس تحریک میں اندازوں کے مطابق تین لاکھ کسانوں نے حصّہ لیا اور محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ کسان اس مزاحمتی تحریک میں بادشاہ اور جاگیرداروں کی فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ کسانوں نے اپنی کسمپرسی کے باوجود ریاست کی ایک تربیت یافتہ فوج کے خلاف بڑی سخت مزاحمت کی۔ کسانوں نے تمام کمزوریوں کے باوجود اس تحریک کو بڑے سائنسی اصولوں پر مرتب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک مربوط نظام مرتب دیا تھا جس کے تحت کچھ کسان زمینوں پر کام کرتے جبکہ کچھ مزاحمتی تحریک میں مصروف رہتے اور چھ ہفتوں بعد زمینون پر کاشت کرنے والے کسان مزاحمتی تحریک میں شامل ہو جاتے تھے اور ان کا کام دوسرے کسان سنبھال لیتے۔ اس طرح ایک تو کسان تمام ساتھیوں کو جنگی تربیت کے عمل سے گزرنا چاہتے تھے اور گوریلا جنگ کے ماحول گھروں سے دور گھنے جنگلوں میں زیادہ عرصے تک صرف چند کسانوں کو رکھنا نہیں چاہتے تھے تاکہ ان کی صحت اور نفسیات پر منفی اثرات نہ پڑیں۔ کسانوں نے تحریک کے دوران اپنے مسائل کے پرامن طریقے سے حل کے لئے کوششیں جاری رکھیں۔ مثلاً ١٦ فروری ١٥٢٥ء کو ٢٥ دیہاتوں پر مشتمل کسانوں کی ایک کونسل نے اپنے مطالبات جاگیرداروں اور سرکاری اہلکاروں کو پیش کئے جس پر کوئی خاطر خواہ کاروائی نہ ہوئی۔ ٦ مارچ ١٥٢٥ء کو تمام کسان کونسلوں نے بڑے غور و خوس کے بعد اپنے تمام مطالبات کو ایک باقاعدہ شکل دیتے ہوئے بارہ مطالبات کی ایک فہرست تیار کی اور اسے اپنے مشترکہ ایجنڈے کے طور پر سامنے لائے۔ ان مطالبات میں ٹیکس کی شرح میں کمی، جبری مشقت کے خاتمے، بہتر حالات زندگی، کسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق علاقہ چھوڑنے جیسے مطالبات شامل تھے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے کوئی مثبت نتائج سامنے نہ آئے۔ جس کا نتیجہ بالآخر لڑائی کی صورت میں سامنے آیا۔ ٤ اپریل ١٥٢٥ء کو ایک بڑی لڑائی ہوئی جس میں کسانوں کا بھاری نقصان ہوا۔ اس کے باوجود کسانوں نے حوصلہ نہ ہارا اور مزاحمت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کسانوں کو بڑی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب انہوں نے ہلفسٹن کے ڈیوک (Duke of Helfenstein) کو گرفتار کرلیا۔ اس کی رہائی کے لئے جہاں ایک طرف کسانوں سے بات

چیت شروع ہوئی تو دوسری طرف کسانوں پر حملوں کی خفیہ منصوبہ بندی بھی جاری رہی۔ اس دوہری پالیسی کے نتیجے میں بالآخر ڈیوک مارا گیا۔ اس کی موت نے بادشاہ کے دل میں کسانوں کے لئے مزید غصّہ اور نفرت کو سمو دیا۔ کسانوں نے بادشاہ اور جاگیرداروں کی چالبازیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے حملوں میں مزید شدّت پیدا کر دی اور جاگیرداروں کے محلات پر حملے کر کے انہیں نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ کسانوں کے اس بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھتے ہوئے ۱۵ مئی ۱۵۲۵ء کو سرکاری فوجوں نے کسانوں کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لئے ایک بڑی کاروائی کا آغاز کیا۔ مختلف شہزادے اور جاگیردار ایک بڑی فوج اکٹھا کر کے کسانوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۶ مئی کو صرف ایک لڑائی میں کسانوں کی ہلاکت تین ہزار سے دس ہزار پر مشتمل تھی۔ اس لڑائی میں کسان تحریک کا سب سے اہم رہنما منتزر (Muntzer) زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ جسے شدید اذیتیں دے کر ۲۷ مئی ۱۵۲۵ء کو سرعام پھانسی دیکر ہلاک کیا گیا۔

جرمنی کے عظیم کسانوں کی اس تحریک نے کارل مارکس اور فیڈرک اینگلز کو اپنے تحقیقی کام اور خاص طور پر تاریخی مادیت (Historical Materialism) کے نظریئے پر کام کرنے کے لئے کافی مواد فراہم کیا۔ جرمن کسانوں کی اس ناکامی کی بنیاد پر مارکس کا یہ خیال مزید پختہ ہوا کہ انقلاب دیہی علاقوں میں کسان نہیں لا سکتے بلکہ یہ صنعتی معاشروں میں صنعتی مزدوروں کی جدوجہد سے ہی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

کسانوں کی تیسری اٹھنے والی تحریک ۱۵۷۳ء میں سامنے آئی۔ یہ تحریک رومی سلطنت کے مشرقی علاقوں میں ابھر کر سامنے آئی اور موجودہ دور کے علاقوں کروشیا (Crotia)، سلووینیا (Slovenia) اور سربیا (Serbia) اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ اس بار اس تحریک کے اٹھنے کے پس پشت بھی جنگی حالات ہی تھے۔ اس مرتبہ ہولی رومن بادشاہ کا مقابل سلطنت عثمانیہ کا خلیفہ تھا۔ ۱۲۸۰ء عثمان اوّل کی قیادت میں وجود پانے والی سلطنت عثمانیہ نے مشرق میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد یورپ کو فتح کرنے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی اور ترکوں نے پہلی مرتبہ یورپ پر حملہ ۱۳۵۶ء میں کیا۔ ۱۳۷۱ اور ۱۳۸۹ میں مزید حملے کئے گئے جس کے نتیجے میں بالکان کے کئی علاقے جن میں بوسنیا اور سربیا وغیرہ شامل تھے انہیں سلطنت عثمانیہ کا حصّہ بنا لیا گیا۔ نکوپول کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ۱۴۰۲-۱۱ میں سلطان سلیمان اور ۱۴۵۱-۸۱ میں سلطان

محمود دوئم کے دور حکومت میں مزید حملوں اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن ترکوں کی طرف سے رومی سلطنت کے خاتمے اور اس کے دارالسلطنت ویانا پر قبضے کی سنجیدہ اور بھرپور کوششیں سلطان سلیمان اوّل کے دور حکومت میں شروع ہوئیں۔ سلطان سلیمان کو اس کی فتوحات کی بنیاد پر ترکوں نے عالیشان (Suleyman the Magnificient) کے لقب سے بھی پکارا۔ سلیمان نے تقریباً ۴۶ برس تک حکمرانی کی۔ اس کا دور ۶۶۔۱۵۲۰ کے عرصے پر محیط تھا۔ اس نے حملوں کے لئے بحری بیڑے بھی تیار کئے اور زمینی فوج کے ساتھ ساتھ سمندری راستوں سے بھی یورپ پر حملے جاری رکھے۔ سلیمان کے چھوٹے بڑے حملے بڑے تواتر سے جاری رہے۔ ان حملوں کے باعث خوف اور پریشانی کی کیفیت نے جنم لیا اور ہولی رومی ریاست کے وہ علاقے جو کہ ترکوں کے حملوں سے متاثر ہو رہے تھے اس علاقے کے سماجی ڈھانچے میں بڑی اہم تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ ترکوں کے حملوں کی وجہ سے ان علاقوں میں تبدیلی مذہب کا آغاز ہوا۔ ایک اور اہم تبدیلی منتقلی آبادی کی وجہ سے ہوئی۔ ترکوں کے حملوں سے پریشان ہو کر سرحدی علاقوں سے بڑی تعداد میں نقل مکانی ہونا شروع ہوئی ہوئی جس کے باعث ایک طرف زمین آباد کرنے کا عمل رک گیا تو دوسری طرف جہاں پر نقل مکانی ہو رہی تھی وہاں آبادی کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ اس نقل مکانی نے بھی بسا اوقات کسانوں کی حالت زار کو مزید درگوں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نقل مکانی کے باعث مہاجرین کسانوں کی صورت میں جاگیرداروں کو ارزاں اجرت پر محنت کش کسان باآسانی اور وافر تعداد میں میسّر آنے لگے۔ جس کے مدّنظر انہوں نے کسانوں کو زمین کی آبادکاری پر مامور کرنے کے لئے بڑی کڑی شرائط عائد کرنا شروع کر دیں جس کی وجہ سے ان زمینوں پر کام کرنے والے اصل کسانوں کا استحصال شروع ہو گیا اور حالات ان کے لئے مزید دشوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ترکوں کے خوف کی وجہ سے رومی سلطنت کو فوج کو ہر وقت مقابلے کے لئے تیار رکھنا تھا۔ اس لئے کسانوں کو زبردستی فوج میں شامل کیا جانے لگا۔ یہ عمل بھی کسانوں میں شدید غصہ اور پریشانی کا باعث بنا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ ابتدائی طور پر ترک حملہ آور ہو کر شہروں میں لوٹ مار کرتے تھے۔ کلیساؤں اور جاگیرداروں کے محلات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اس لئے کوشش کی گئی کہ ان شہروں، کلیساؤں اور محلات کے گرد حفاظتی حصار اور دیواریں بلند کی جائیں۔ اس کام کے کئے بھی کسانوں سے جبری مشقت لینے کا عمل شروع کیا۔

جاگیرداروں، پادریوں اور حکمرانوں کی منصوبہ بندی کی وجہ سے اب ان کی عمارتیں اور محلات تو ترکوں کے حملوں سے قدرے محفوظ ہو گئے تھے۔ جس کے باعث ترک حملہ آوروں نے اپنا غصہ اور جبر اب عام لوگوں پر نکالنا شروع کر دیا۔ یہ عام لوگ جن میں کسان اور دیگر چھوٹے محنت کش تھے وہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی خاطر خواہ بندوبست کرنے کے اہل نہ تھے۔ ان کے پاس نا تو کوئی وسائل تھے اور نہ ہی ان کی حفاظت کا خیال جاگیرداروں اور اشرافیہ کو تھا۔ اب اپنے حملوں میں ترکوں نے دیہاتوں پر حملہ کر کے کھڑی فصلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ چھوٹے قصبوں کی مارکیٹوں میں لوٹ مار کے بعد ان کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ ترکوں کی اس نئی اور تبدیل شدہ حکمت عملی سے بھی براہ راست متاثر عام کسان اور چھوٹا محنت کش ہی ہوا۔ ترک کئی افراد کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ اس کے مدّنظر ترک حملوں کی اطلاع ملتے ہی کسان فوری طور پر ان علاقوں سے نقل مکانی شروع کر دیتے۔ جس کے باعث ان کی تیار فصلیں تباہی کا شکار ہو جاتی۔ اس صورتحال نے سب سے زیادہ متاثر عام لوگوں کو کیا۔ ترکوں کے لگاتار حملوں نے اس علاقے کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے پر دوررس اثرات مرتب کئے۔

کسانوں کی ۱۵۷۳ء کی اس تحریک کی قیادت متیجا گوبے (Matija Gubec) کر رہا تھا جب کہ اس کے ساتھ اس کے دیگر ساتھیوں میں ایوان پیسانک (Ivan Psanac) ایون موگک (Ivan Mogic) اور ایلجا جیورک (Ilija Gregoric) شامل تھے۔ چھوٹے پیانے پر کئی ماہ سے جاری کسانوں کی ناراضگی اور غصے نے بھرپور بغاوت کا روپ ۲۸ جنوری ۱۵۷۳ کو اس وقت دھارا جب بیک وقت ملک کے تین علاقوں کروشیا، اسٹیریا (Styria) اور کرنولا (Carniola) میں کسانوں نے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کر دی۔ کسانوں کی بغاوت کی فوری وجہ علاقے کے ایک نہایت جابر جاگیردار فرانجو تے (Franjo Tahy) کے خلاف کئی عرصے سے جاری شکایات کے باوجود بادشاہ کی طرف سے کوئی کاروائی نہ کرنا تھا۔ دیگر جاگیرداروں کی طرح فرانجو تے نے بھی کسانوں کے استحصال اور تذلیل کے تمام مروجہ اصولوں کو اپنائے رکھا تھا جس میں دیگر مکروہ افعال کے ساتھ ساتھ 'پہلی رات' کا استحقاق جاگیردار کو ہی حاصل تھا لیکن اس نے اس میں مزید تبدیلی کی اور 'پہلی رات' کے حق کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی جنسی حوس کی تسکین کے لئے ایک نئی روایت کو پروان چڑھایا جس کے

تحت وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی مخصوص گاؤں کی تمام نوجوان اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کو اپنے محل میں طلب کر کے ان سے برہنہ ناچ کرواتا اور پھر ان میں سے سب سے حسین لڑکی کو منتخب کرنے کے بعد اسے غسل دلا کر اس کے ساتھ ہم بستری کرتا۔ ابتداء میں یہ واقعات کبھی کبھار ہوتے لیکن جلد ہی اس نے اس طریقے کو ایک مستقل عادت بنا لیا۔ جس کے باعث اس کی جاگیردار پر محنت کرنے والے کسانوں کی اکثر بچیوں کی عصمت دری ایک معمول بن گئی۔ کئی مواقعوں پر انتہائی کم عمر لڑکیوں سے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی جس سے وہ زخمی ہونے لگیں۔ فرانجوتے کی اس روایت کو دیگر جاگیرداروں نے بھی اپنانے کا ارادہ اور کوشش شروع کر دیں جس نے کسانوں کو شدید پریشانی اور الجھن میں مبتلا کر دیا۔ جس پر کسانوں نے فرانجوتے کی طرف سے نئی شروع کی گئی رسم کو فوری طور پر ختم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ کسانوں کی اس بے چینی پر غور کرنے کے بجائے جاگیرداروں نے ان پر مزید سختی شروع کر دی اور جن کسانوں نے اپنی بیٹیاں جاگیرداروں کے طلب کرنے پر ان کے محلات بھیجنے سے انکار کیا، ان کے خلاف سخت کاروائیاں شروع ہو گئیں۔ انہیں زمین سے بے دخل کرنے اور اس کی بیویوں اور دیگر خواتین کے ساتھ جنسی زیادتیاں شروع کر دی گئیں۔ کسانوں نے جاگیرداروں کے اس رویئے کے خلاف پادریوں سے رابطہ کیا لیکن چونکہ پادری خود جاگیرداروں کے ساتھ استحصالی عمل میں شریک تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اس کے خلاف کسانوں کا ساتھ دینے میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجبور کسانون نے بادشاہ کے دربار تک رسائی کی کوشش کی اور کڑی جدوجہد کے اور کاوشوں کے بعد بالآخر وہ اپنی گزارشات بادشاہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ شاہی دربار سے سوائے دلاسوں اور امیدوں کے کوئی اور چیز حاصل نہ ہوئی۔ بادشاہ کی طرف سے کسانوں کی شکایت پر کوئی کاروائی نہ کرنے کے پس پشت بھی کئی عوامل تھے۔ اوّل تو یہ کہ بادشاہ کو ٹیکس کی وصولی کے لئے ان زمینداروں پر بھی انحصار کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ کسی صورت اپنی آمدنی میں کمی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا جبکہ دوسری طرف ترکوں کے حملے کی صورت میں دفاعی کام میں جاگیرداروں کی شرکت ضروری تھی۔ ہنگامی حالات میں جاگیردار ہی شاہی دربار کا سہارا ہوتے تھے اس لئے بادشاہ نے کسانوں کے شدید احتجاج کے باوجود کسی بھی قسم کی کاروائی کرنے میں کوئی سنجیدگی نہ دکھائی۔ صورتحال کی سنجیدگی کا جائزہ لیتے ہوئے کسانون نے اب اپنی سطح پر مزاحمتی

تحریک شروع کرنے کا اعلان کردیا۔ اپنی اس شروع کی گئی تحریک میں کسانوں نے اپنے انقلابی ایجنڈے میں جاگیرداری نظام کے خاتمے اور کلیسا کو دی گئی زمینوں کو بھی واپس لینے کا مطالبہ کردیا۔ کسانوں نے جاگیرداروں سے خالی کرائے گئے علاقوں میں فوری طور پر متیجا گوبے کی قیادت میں اپنی حکومت قائم کرنے کا اعلان کردیا اور ایلجا جیورک کو کسانوں کی مزاحمتی فوج کا سپہ سالار مقرر کرنے کا اعلان کردیا۔ کسانوں نے اپنے ایجنڈے میں اس بات پر زور دیا کہ بادشاہ تمام علاقائی اور صوبائی جاگیرداروں کے کردار کو فوراً ختم کرے۔ زمینوں پر کسانوں کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ کسان اپنی زمینوں پر پیداوار خود کریں گے اور بعد ازاں خود ہی بادشاہ کو براہ راست ٹیکس ادا کریں گے۔ اس کسان بغاوت میں شریک بیشتر کسان قبل ازیں ترکوں کے حملوں کے دوران جنگوں میں حصہ بھی لے چکے تھے۔ اس لئے انہیں قدرے جنگی مہارت بھی حاصل تھی۔ اس لئے بغاوت کا اعلان کرتے ہی انہوں نے بڑی کامیابی اور مہارت سے کئی علاقوں سے جاگیرداروں کے اثر ونفوذ کو فوراً ختم کرنا شروع کردیا۔ کسانوں نے فوری طور پر سڑکوں اور گذرگاہوں کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد ان پر جاگیرداروں کی طرف سے قائم کی گئی ٹیکس ٹول کے مراکز کو ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ جس کے باعث کسانوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے تاجر اور دیگر محنت کش بھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے کیونکہ جاگیرداروں کے نظام ٹیکس سے وہ بھی بڑی بری طرح استحصال کا شکار تھے۔ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی اس بغاوت میں شریک ہوجانے سے کسانوں کی تحریک کو مزید تقویت ملی۔ کسانوں نے برزتے (Brezice) کے مضبوط محل پر جسے علاقے کے جاگیردار نے حفاظتی دیواروں کی تعمیر کرنے کے بعد قلعے کی شکل دے دی تھی۔ اس قلعے پر بھرپور لڑائی کے بعد قبضہ کرلیا اور جاگیردار کو گرفتار کرنے کے بعد اسے کسانوں کی عوامی عدالت میں پیش کیا گیا اور اس پر مقدمہ چلانے کے بعد کسانوں کی طرف سے سزائے موت کا اعلان کیا گیا۔ سرعام پھانسی کی سزا دئے جانے کے بعد اس کی لاش کو محل سے لٹکا دیا گیا جبکہ اس کے خاندان کے دیگر افراد اور خواتین کو کسان خواتین کے لباس میں ملبوس کرکے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ جاگیردار فرانجو جو کہ اس علاقے کا سب بااثر اور بادشاہ کا قریب ترین رفیق تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی اس طرح ہلاکت کے بعد علاقے کے دیگر چھوٹے جاگیرداروں نے کسانوں کے غصے کو بھانپتے ہوئے فوری طور پر اپنے علاقوں سے راہ فرار

اختیار کرتے ہوئے ویانا کا رخ کرنا شروع کردیا۔ جاگیرداروں نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر کسانوں کے خلاف فوری کاروائی کا مطالبہ کردیا۔ بادشاہ نے فوری طور پر ۵۰۰۰ اسپاہیوں کو بھرپور اسلحے اور توپوں کے ساتھ لیس کر کے کسانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے روانہ کردیا۔ اس شاہی فوج کی مدد کے لئے جاگیرداروں نے مقامی سطح پر تیس ہزار افراد کو مزید اکٹھا کرلیا۔ ۵فروری ۱۵۷۳ء کو بادشاہ کی ریاستی فوج اور کسانوں کے درمیان پہلا معرکہ ہوا جس میں ایک طرف دس ہزار کسان بغیر کسی اسلحے کے پچاس ہزار کی فوج کے مقابل تھے۔ یہ فوج اسلحے سے مکمل لیس تھی اور بہتر تربیت یافتہ بھی تھی۔ اس تمام تر تفریق کے باوجود کسانوں نے پہلے معرکے میں بڑی استقامت سے سرکاری فوج کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں کسانوں کے ۲۰۰۰ سپاہیوں کی ہلاکت کے باوجود انہوں نے سرکاری فوج کو علاقے میں داخل نہ ہونے دیا اور سرکاری فوج کا بھی بھرپور نقصان ہوا۔ کسانوں کے اس قدر بلند حوصلوں کو دیکھتے ہوئے شاہی فوج نے مزید کمک کا مطالبہ کیا۔ کسان اس دوران چھاپہ مار جھڑپوں کے ذریعے سرکاری فوج سے مقابلہ کرتے رہے۔ تین دن بعد ۸فروری ۱۵۷۳ء کو اضافی فوج اور گولا بارود کے پہنچنے کے بعد سرکاری فوج کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا۔ سرکاری فوج نے آگ کے گولے توپوں کے ذریعے پھینک کر مزاحمتی کسانوں کی پناہ گاہوں کو آگ لگانا شروع کردیا۔ جس کے باعث کسانوں کو مجبوراً کھل کر سامنے آ کر مقابلہ کرنا پڑا۔ اپنی کسمپرسی کی وجہ سے کسانوں کے لئے اب مزید جنگ جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ اسلحے کی عدم موجودگی اور بڑے پیمانے پر کسانوں کی ہلاکت کے بعد کسان اپنی مزاحمتی تحریک کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے اور ۹ فروری کو سرکاری فوجوں نے کسانوں کی مزاحمت کو اسلحہ و بارود کے زور پر کچل دیا۔ اس لڑائی میں ایک دن میں تین ہزار کسان ہلاک کئے گئے۔ سرکاری فوجوں نے فتح کی خوشی میں جشن منائے۔ زندہ بچ جانے والے کسانوں میں سے اکثر کو قتل اور کئی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا جبکہ کسانوں کی خواتین کے ساتھ عصمت دری اور زیادتی کی گئی تا کہ آئندہ کسانوں کو اس قسم کی بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہو۔

کسانوں کی مزاحمتی تحریک کے سربراہ متیجا گوبے کو ۱۵فروری کو سرعام فولاد کا تپتا ہوا تاج پہنا کر برزکے (Brezice) کی گلی کوچوں میں گھسیٹا گیا۔ بعدازاں اسے شدید اذیت دینے کے بعد سرعام پھانسی دے کر اس کی لاش کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد نذر آتش کردیا گیا۔ اس قدر

بھانک سزا دینے کا مقصد دراصل کسانوں میں دھشت کو جنم دینا تھا تا کہ آئندہ وہ اس قسم کی بغاوت کی کوشش نہ کریں۔ اس سخت ترین سزا کے دیئے جانے کے عمل میں علاقے کے تمام کسانوں کی شرکت کو لازمی قرار دیا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ کسانوں کی حمایت میں صدا بلند کرنے والے افراد کے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ فولاد کا تپتا ہوا تاج پہناتے وقت یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ اس نے کسانون کا رہبر اور لیڈر بننے کی کوشش کی اس لئے اسے تاج پہنایا جا رہا ہے تا کہ وہ اب ان کا بادشاہ بن سکے۔ درحقیقت یہ عمل کسان رہنماؤں کی تذحیق کرنے کے لئے کیا جا رہا تھا۔

پندرہویں صدی میں یورپ میں چھپائی کی مشین کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ کسانوں نے اپنی تحریک کو آگے بڑھانے اور اپنا پیغام دیگر کسانوں تک پہنچانے کے لئے پرنٹنگ پریس کا استعمال کیا ۱۵۷۳ کی اس بغاوت میں کسانوں نے اپنے پیغام کو ایک نظم کے ذریعے آگے بڑھایا۔ بعد ازاں یہ نظم کسانوں کا ترانہ بن گیا اور وہ اس کو متحرک کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس نظم کی ایک اصل کاپی کا عکس (scanned copy) یہاں اس مضمون کے ساتھ شامل کی جا رہی ہے جو کہ آج بھی سلووینیا کے سرکاری نوادرات اور میوزیم میں محفوظ ہے۔ کسانوں کی اس مزاحمتی تحریک کے کئی پہلو تھے۔ پہلی بار تو یہ کہ انہوں نے مذہبی پیشواؤں کی تمام نصیحتوں کے باوجود جاگیرداروں کے خلاف اپنی تحریک جاری رکھی۔ کلیسا کسانوں کی اس تحریک کو خلاف مذہب قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف ہر قسم کی کاروائی کو جائز قرار دیتی تھی۔ کلیسا نے ان مزاحمتی تحریکوں کی اس وجہ سے بھی مزید مخالفت کرنا شروع کر دی کیونکہ وہ اس تحریک کو عیسائیت کے خلاف سمجھتی تھی۔ پادری کسانوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ چونکہ سلطنت عثمانیہ عیسائی ریاست کے خاتمے کے لئے حملے کر رہی ہے اس لئے اس موقع پر کسی بھی قسم کی تحریک صرف بادشاہ اور جاگیرداروں کے خلاف نہیں ہوگی بلکہ یہ عیسائیت کو کمزور کرنے کا باعث بنے گی۔ اس لئے ایسی مزاحمتی تحریکوں کو فلفور ختم کیا جائے۔ لیکن کسانوں نے پادریوں کی باتوں پر دھیاں دینے کی بجائے اپنی جنگ کو استحصالی نظام کے مکمل خاتمے تک جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہونا چاہئے کہ ترکوں کے حملوں کی صورت میں جاگیرداروں سے قبل یہ کسان ہی تھے جو کہ ترک حملہ آور فوجوں سے نبرآزما ہو جاتے تھے۔ ان کسانوں نے ترکوں کے حملوں اور جاگیرداروں کے ارادوں پر نظر رکھنے کے لئے مقامی سطح پر خفیہ معلومات (انٹیلیجنس) کا ایک مؤثر اور کامیاب

نیٹ ورک مرتّب کر رکھا تھا۔ کسانوں کے خفیہ مخبر جاگیرداروں کے منصوبوں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے مختلف اشکال میں علاقے میں گھومتے اور ان کی حاصل کی ہوئی معلومات پر اپنی منصوبہ بندی کرتے۔ کسانوں نے ایک علاقے سے دوسرے علاقے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پیغام پہنچانے کے لئے مختلف طریقے اپنائے ہوئے تھے۔ وہ کبھی شمعیں جلا کر ایک دوسرے کو اطلاعات فراہم کرتے تو کبھی ٹوپیوں پر مرغی کے مخصوص پر لگا کر اپنی تحریک کے بارے میں خفیہ سنگل دیتے۔ کبھی لباس پر مخصوص نشانات لگا کر اپنی بات خاموشی سے دیگر لوگوں تک پہنچاتے۔ کسانوں کی منصوبہ بندی کے یہ کامیاب طریقے جاگیرداروں کے لئے پریشانی اور مشکلات کا باعث بنتے جارہے تھے۔ لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود کسانوں کی یہ تحریک وقتی طور پر تو کامیابیوں سے تو آگے بڑھتیں لیکن وہ اپنے اثر کو دیرپا بنیادوں پر قائم نہ رکھ سکتے کیونکہ ان کا مقابلہ نہایت طاقتور ریاست سے تھا جس کو بادشاہ، فوج اور کلیسا کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور بادشاہ اور پادری جس وقت چاہتے اس وقت عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو اشتعال دے کر ان مزاحمتی کسانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیتے۔

کسانوں کی چوتھی بڑی تحریک ۱۶۳۵ء میں سامنے آئی۔ کسانوں کی اس تحریک کے پس پشت ان کی تباہ ہوتی ہوئی معاشی صورتحال تھی۔ سولہویں صدی کی ابتدائی پانچ دھائیاں یورپ میں تباہی و بربادی اور افراتفری کا نیا باب رقم کرنے کا باعث بنی تھیں۔ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء کا عرصہ یورپ میں تیس برس کی خانہ جنگیوں کا زمانہ تھا۔ تقریباً یورپ کی تمام ریاستیں باہمی طور پر لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدل میں مصروف تھیں۔ جنگوں کے باعث جہاں ایک طرف وسائل کا بے دریغ ضیاع ہو رہا تھا وہیں عوام اور غریب محنت کشوں کے حالات ان معاشی مشکلات کے باعث مزید ابتر ہوتے چلے گئے۔ ان جنگوں میں شمالی یورپ کی عظیم سلطنتوں سویڈن اور ڈنمارک سمیت فرانس، جرمنی اور پولینڈ تک کے علاقے بھی متاثر ہوئے۔ ان ریاستی جنگوں کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے اندر بھی اختلافات عروج پر پہنچ گئے اور ان تمام تر بھیانک صورتحال نے ہولی رومی ریاست کے علاقوں کو بھی بڑی بری طرح متاثر کیا اور کسانوں نے ایک بار پھر ان علاقوں میں بغاوت کر دی۔ اس بار بغاوت کا محور گریز (Graz) کا علاقہ تھا۔ یہ وہ قصبہ تھا جو کہ ترکوں کے ویانا پر حملہ کے دوران ایک اہم مرکز کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ علاقہ ترکوں کے حملوں کے باعث اکثر غیر یقینی

کیفیت کا شکار رہتا تھا۔ اس بغاوت کی وجہ کسانوں پر اچانک عائد کیا جانے والا اضافی ٹیکس تھا جو کہ ان خدشات کی بنیاد پر عائد کیا جا رہا تھا کہ عثمانی خلیفہ محمود اوّل (۱۷۵۴ء۔۱۷۳۰ء) ایک مرتبہ پھر ان علاقوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ کسانوں نے جب اضافی ٹیکس کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کو کچلنے کے لئے سرکاری فوج اور مقامی جاگیرداروں کو استعمال کیا گیا۔ رومی ریاست کے اس علاقے میں اکثریتی آبادی کا تعلق قدامت پرست عیسائیت (Orthodox Christianity) سے تھا لیکن گریز کے علاقے میں ان قدامت پرست عیسائیوں کے ساتھ ساتھ پروٹسٹ عیسائیت کا اثر ونفوذ بھی قائم ہونا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام تر اختلافات کے باوجود عیسائیت کے تمام تر فرقے کسانوں کی تحریکوں کی یک آواز ہو کر مخالفت کر رہے تھے۔ گریز کی کسان بغاوت میں بھی یہی ہوا۔ کسانوں کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے جہاں جاگیردار اپنی طاقت وقوّت کا بھرپور استعمال کر رہے تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے بھی ان کی تحریک کو خلاف مذہب قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف لوگوں کو اکسانے کی بھرپور کوشش کی۔ پادریوں کے فرمودات کے مطابق کسانوں کی ان بغاوتوں کو کچلنا مذہبی فریضے میں شامل تھا۔

کسانوں کی پانچویں بڑی تحریک ۱۷۱۳ء میں سامنے آئی۔ اس تحریک کی منفرد بات یہ تھی کہ گزشتہ تمام تحریکیں براہ راست بادشاہ کے خلاف نہ تھیں بلکہ یہ تحریکیں بنیادی طور پر مقامی جاگیرداروں کے خلاف ہوتی تھیں جو کہ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس کی وصولی کے لئے استحصالی طریقے اپناتے تھے۔ اس لئے کسان ان تحریکوں میں براہ راست حدف کا نشانہ بھی ان جاگیرداروں کو ہی بناتے تھے اور ان جاگیرداروں کے خلاف شنوائی کے لئے رومی بادشاہ کو عرضیاں پیش کرتے تھے۔ کسی حد تک ان کا خیال یہ تھا کہ ان کا بادشاہ تو ان پر مہربان ہے اور استحصال اور ظلم کے ذمہ دار یہ مقامی جاگیردار ہیں۔ اسی خوش فہمی کی بنیاد پر کسانوں کو نہ کبھی انصاف مل سکا تھا اور نہ ہی ان کے مسائل حل ہو سکے تھے۔ لیکن ۱۷۱۳ء کی اٹھنی والی تحریک براہ راست بادشاہ کے خلاف تھی۔ اس تحریک کے پس پشت محرک بھی ترک حملوں کا خوف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بغاوت کے تین دیگر محرکات بھی تھے۔ اوّل تو یہ کہ اس علاقے میں طاعون (Plaque) کی ایک بڑی وبا ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۳ء مین پھیلی لیکن اس کے سدّ باب کے لئے کوئی اقدامات نہ کئے جس کی وجہ سے بہت سی ہلاکتیں ہوئی۔ دوسری وجہ اس علاقے میں گذشتہ کچھ عرصے سے فصلوں کا اچھا نہ

ہونا تھا جو کہ کسانوں میں بے چینی اور پریشانی کا باعث تھا۔لیکن اس کسان بے چینی کی تیسری اہم وجہ حکومت کا شراب اور گوشت کی خریداری اور استعمال پر ٹیکس کا لگایا جانا تھا۔ اس اضافی ٹیکس نے غریب عوام اور کسانوں میں پہلے ہی سے پائی جانے والی بے چینی میں مزید اضافہ کر دیا اور مارچ ۱۷۱۳ میں کسانوں میں بے چینی اور مزاحمت کے واضح اثرات نظر آنے لگے۔

تحریک ۲۱ مارچ کو اس وقت پھوٹ پڑی جب ٹیکس کی وصولی پر تعینات آفیسر جیکب بینڈل (Jacob Bandel) نے قصبے تولمن (Tolmin) کے چھوٹے تاجروں کے تجارتی مال کو اس بناء پر ضبط کرلیا کہ اس پر حکومت کی طرف عائد کیا جانے والا اضافی ٹیکس ادا نہیں کیا گیا۔ چھوٹے تاجروں کے احتجاج پر ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ کیونکہ تاجروں نے یہ مال کسانوں اور محنت کشوں سے ادھار لیا تھا اور خریدے گئے مال کی ادئیگی کاشتکاروں کو اس مال کی فروخت کے بعد کرنا تھی۔اس لئے کسانوں کو یہ فکر اور پریشانی لاحق ہوگئی کہ اگر یہ مال سرکاری خزانے میں ضبط کرلیا گیا اور گرفتار تاجر رہا نہ ہوئے تو پھر انہیں ادائیگی کون کرے گا؟اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے کسانوں نے بھی ضبط شدہ مال کی واپسی اور تاجروں کی فلفور رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ کسانوں نے متحد ہو کر ٹیکس اکٹھا کرنے والے عملہ پر حملہ کر دیا اور سڑکوں پر ٹیکس کی وصولی کے لئے بنائے گئے مراکز توڑ پھوڑ دئے اور گرویزا (Gorizia) کے قصبے پر حملہ کر کے جیل سے اپنے گرفتار ساتھیوں کو آزاد کرالیا اور اپنا ضبط شدہ مال واپس حاصل کرلیا۔اس کھلی بغاوت پر سزا دینے کے لئے سرکاری فوج حرکت میں آئی اور کئی مزاحمتی کسانوں اور دیگر محنت کشوں کو ہلاک کر کے ریاست نے بدلہ لیا۔لیکن کسانوں نے اگلے ماہ یعنی اپریل ۱۷۱۳ء میں دوبارہ بغاوت کر دی اور ۲۰ مزاحمتی کسانوں پر مشتمل کونسل نے تقریباً ۲۵۰۰ مربع کلومیٹر کے علاقے میں دوبارہ مزاحمتی تحریک کھڑی کر دی،تحریک اب وادی سوا (Soca Valley) سے لے کر ویاوا وادی(Vipava Valley) تک پھیل گئی۔سرکاری فوجوں نے ایک بار پھر کاروائی کی اور کسانوں کو اذیتیں دے کر تحریک کو دبا دیا لیکن تین ہفتوں بعد تحریک مئی ۱۷۱۳ء کو ایک بار دوبارہ سامنے آ گئی اور اس بار کسانوں نے اپنے مطالبات صرف نئے عائد کردہ ٹیکسوں کی واپسی تک محدود نہ رکھے بلکہ اپنے مطالبات میں ایک بار پھر اس بات پر زور دیا کہ حکومت تمام استحصالی ٹیکس واپس کرے اور جاگیرداری نظام کا فوری خاتمہ کیا جائے۔

اس بار چونکہ بغاوت کا دائرہ کار زیادہ وسیع تھا۔ اس لئے مقامی جاگیرداروں کو اس بغاوت کو کچلنے کے لئے ایک بار پھر ریاستی فوج کی مدد کے لئے درخواست دینا پڑی۔ جون ۱۷۱۳ء میں سرکاری فوجوں نے بڑی بے دردی سے کاروائی کرتے ہوئے کسانوں کی اس تحریک کا خاتمہ کیا جس میں گیارہ کسانوں کو سرعام سزائے موت دی گئی جبکہ ۱۸۰ کو طویل قید کی سزا سنائی گئی۔ جبکہ بقیہ مزاحمتی کسانوں پر جرمانے عائد کر کے انہیں علاقہ بدر کرنے کے احکامات جاری کئے گئے۔ اس طرح چار ماہ تک جاری رہنے والی کسان تحریک کو ریاستی تشدد کے زور پر دبا دیا گیا۔

۱۷۱۳ء کی اس کسان تحریک کے بعد کسانوں کی کوئی بڑی مسلح مزاحمتی تحریک تو سامنے نہ آئی لیکن ان کا احتجاج کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔ ان احتجاجات کے نتیجے میں کسانوں کو کوئی بڑی کامیابی اور سہولت تو حاصل نہ ہوئی لیکن کسی حد تک جاگیروں کے ظلم سے نجات ملی۔ لیکن کسانوں کی تحریک کی کامیابی کی صورت اس وقت نکلی جب ۱۸۱۰ میں ہولی رومی کے خاتمے کے نتیجے میں سامنے آنے والی آسٹرو ہنگرین بادشاہت (Austro Hungarian Empire) نے بالآخر کسانوں کے احتجاجات کے نتیجے میں ۱۸۴۸ میں اس علاقے سے جاگیرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کیا، جس سے کسانوں کے مسائل کا کافی حد تک آزالہ ہو سکا۔ حکومت نے جاگیرداروں سے لی گئی زمین کے عیوض انہیں معاوضہ ادا کیا۔

لیکن اس علاقے کے پیداواری رشتوں میں انقلابی اور حقیقی بنیادی تبدیلی اس وقت آئی جب دوسری جنگ عظیم میں مارشل ٹیٹو کی قیادت میں عوام نے نازی جرمن اور فاشسٹ اٹلی کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ کیا۔ جرمنی اور اٹلی کی شکایت کے بعد اس علاقے میں یوگوسلاویہ کی عوامی سوشلسٹ ریاست کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس نظام کے قائم ہوتے ہی تمام وسائل پر عوام کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تمام زمینیں اور ریاست کے تمام وسائل پر تمام لوگوں کے مساوی حقوق تسلیم کئے گئے اور اس طرح استحصال نظام کے خاتمے کا کام تکمیل کو پہنچا۔

مارشل ٹیٹو چونکہ خود ایک نیشنلسٹ اور سوشلسٹ خیالات رکھنے والے سیاسی رہنما تھے اس لئے انہوں نے جرمنی اور اٹلی کے خلاف اپنی مزاحمتی تحریک کو اکٹھا کرنے کے لئے اس کو ان تاریخی بنیادوں پر کھڑا کرنے کی کوشش جو کہ گذشتہ ۴۰۰ سال سے اس علاقے میں برپا تھی۔ مارشل ٹیٹو نے اپنی مزاحمتی تحریک کو ۱۵۷۳ء کے کسان تحریک کے ہیرو متیجا گوبے سے منصوب کر کے اسے متیجا

گوبے برگریڈ کا نام دیا۔ اس کے اس اقدام کے پس پشت اپنی عوام کو یہ پیغام دینا تھا کہ اس علاقے کے لوگ پہلی مرتبہ جبر، ظلم اور فاشزم کے خلاف احتجاج نہیں کرر ہے بلکہ اس کی ایک طویل تاریخ ہے اور جرمن نازیوں کے خلاف احتجاج اسی تاریخی احتجاج کی ایک کڑی ہی ہے۔ مارشل ٹیٹو نے بعدازاں کسان تحریکوں کے چارسو سالہ ریکارڈ کو سرکاری طور پر محفوظ کرنے کے لئے انتظامات کیئے اور ملک کے تمام علاقوں سے ریکارڈ اکٹھا کر کے آرکیائیز (Archives) میں محفوظ کرنے کا انتظام کیا گیا اور آج بھی اس تحریک کی ۴۰۰ سالہ تاریخ پر ۲۷۰۰۰ تاریخی نوادرات کا ریکارڈ ۱۹۹۱ میں یوگوسلاویہ سے الگ ہونے والی ریاست سلووینیا (Slovenia) کے دارالحکومت لبیانا (Ljubljana) میں بڑے اہتمام سے محفوظ ہے جہاں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے محقق ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مارشل ٹیٹو نے اس ریکارڈ کو مزید عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے ۱۹۷۳ میں ان تمام تاریخی دستاویزات کی مکمل کیٹلاگ بنوا کر اس کو شائع کرایا تا کہ لوگوں کو ان دستاویزات کے بارے میں تفصیلی آگاہی حاصل ہو سکے۔ مارشل ٹیٹو کے دور میں ان تمام محلات اور قلعوں کو جو کہ ہولی رومی بادشاہت اور آسٹرو ہنگرین بادشاہت کے دور میں جاگیرداروں کی رہائش گاہیں رہی تھیں ان تمام کو عجائب خانوں میں منتقل کر دیا گیا اور ان عجائب گھروں میں عوامی تاریخ سے وابستہ دستاویزات، تصاویر اور دیگر اشیاء رکھی گئی ہیں، ان ہی میں سے برگز کے عجائب گھر میں کسان تحریکوں کی تاریخ سے وابستہ متعلقہ

ریکارڈ کو محفوظ رکھا ہے۔ مارشل ٹیٹو کے سوشلسٹ دور میں ملک کے کئی علاقوں اور تاریخی مقامات کے ناموں کو ان عظیم کسان رہنماؤں کے ناموں سے منصوب کیا گیا جنھوں نے ۴۰۰ سال تک کسان تحریکوں میں حصّہ لیا۔ تا کہ عوام کو تاریخ سے آگہی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے کئی شہروں میں کسان تحریکوں کے رہنماؤں کے مجسمے بھی نصب کئے گئے تا کہ لوگوں کا تاریخ سے ناتا نہ ٹوٹے۔ اس لئے آج بھی یوگوسلاویہ کے حصّے بکھرے ہو جانے کے باوجود ان کسان تحریکوں کو سابقہ یوگوسلاویہ کا مشترکہ تاریخی ورثہ تصور کیا جاتا ہے اور سربیا، کروشیا اور سلووینیا میں ان تاریخی واقعات پر تحقیق کا سلسلہ رکا نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر حکومتیں عوامی ہوں تو پھر وہ تاریخ کر مسک نہیں کرتیں بلکہ تاریخ میں عوامی جدوجہد اور استحصالی طبقوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے تا کہ عوام کا رشتہ اپنی تاریخ سے برقرار

رہے اسی لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ تاریخ نویسی کے کام کو ہمیشہ عوامی نکتہ نظر سے ہی مرتب کرنا چاہئے، تاریخ کے دریچوں میں ہمیشہ عوامی جدوجہد کو جھلکنا چاہے۔ تاریخ صرف بادشاہوں، امراء اور اشرافیہ کی نہیں لکھی جانی چاہئے بلکہ تاریخ میں عوامی جدوجہد کے واقعات کا ذکر بھی ہونا چاہئے تاکہ یہ احساس مزید مستحکم ہو کہ یہ عوام ہی ہیں جو کہ تاریخ میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں اور یہ عوام ہی ہیں جو کہ تاریخ بدلنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

## حوالہ جات


Oto Luthar, The Land Between, Peter Lang, Frankfurt, 2008

Janko Prunk, A Brief History of Slovenia, Zalozba Grad, Ljubljana, 2008.

Fran Zwitter, The Slovenes and Habsburg Monarchy, Ljubljana, 1966.

Situla- Razprave Narodnega Muzeja, Catelogue of Archives of Peasants Uprising, Ljubljana, 1973.

Michel Mollat and Philipple Wolff, The Popular Revolutions of the Late Middle Ages, George Allen and Unwin Ltd, London, 1973.

Jozo Tomasevich, Peasants, Politics and Economic Change in Yugoslavia, Stanford, California, Oxford University Press, 1955.

Hildermeier Manfred and Catt Cathleen, 'Agrarian Social Protest, Populism and Economic Development', Social History, Vol 4 No. 2 (May, 1979), pp. 319-332.

T. Shanin, 'The Nature and Logic of Peasant Economy', Journal of Peasant Studies, 1 (1973), pp. 63-80.

John Georgeoff, 'Nationalism in the History Textbooks of Yugoslavia and Bulgaria', Comparative Education Review, Vol 10, No. 3 (Oct 1966), pp. 442-450.

Peter F. Sugar, 'The Nature of the Non-Germanic Societies Under habsburg Rule', Slavic Review, Vol. 22, No. 1 (March, 1963), pp. 1-30.

# تحقیق کے نئے اُفق

## (تبصرۂ کتب)

### فلسفۂ تاریخ، نوآبادیات اور جمہوریت

مصنف: اشفاق سلیم مرزا

پبلشر: سانجھ لاہور، صفحات: ۲۴۰

**تبصرہ ڈاکٹر مبارک علی**

اردو میں زیادہ تر کتابیں یا تو مذہبی موضوعات پر چھپتی ہیں یا تو شاعری افسانے اور ناول۔ کم کتابیں فلسفہ، سوشیولوجی، علم شہریت یا علم آثارِ قدیمہ پر مارکیٹ میں نظر آتی ہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تو اس میں بھی تحقیق کے بجائے رومانوی قسم کے قصے کہانیاں لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں۔

اشفاق سلیم مرزا کی کتاب 'فلسفۂ تاریخ' میں فلسفہ اور تاریخ کے بارے میں سنجیدہ مضامین ہیں۔ جرمن فلسفی ہیگل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو سمجھنا مشکل ہے اور پھر سمجھ کر اسے بیان کرنا اور بھی مشکل ہے۔ اس نے خصوصیت سے فلسفۂ تاریخ پر جو لکھا ہے اس کے اثرات اس کے بعد آنے والوں پر چھائے ہوئے ہیں وہ تاریخ کو روح کی دریافت اور اس کی ترقی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ مارکس نے اس کو روح کی جگہ طبقاتی جدوجہد کے تاریخی عمل کا اہم جز قرار دیا ہے۔

ہیگل ہیرو اور اس کے کردار کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ فطرت کے مقاصد کو پورا کر کے اپنی توانائی کھو کر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے سیزر جب فطرت کے منصوبوں کو پورا کر لیتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔ نپولین کو سینٹ ہلینا کے جزیرے میں قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ اس دلیل کو ہٹلر پر بھی لاگو کیا جا سکتا ہے اور یہ ہی ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اشفاق سلیم مرزا نے پاکستان کی تاریخ نویسی پر بھی اہم سوالات اٹھائے ہیں جن میں خاص

طور سے دوقومی نظریہ اور موجودہ دور میں صوفیا کی تعلیمات کا معاملہ بھی شامل ہے۔

۱۸۵۷ء کے بارے میں ان کے خیالات برطانوی دور کے نقطۂ نظر سے ملتے ہیں کہ جنہوں نے اسے غدر قرار دیا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ ان پر ہونے والے مظالم کے بارے میں لکھے۔ جب ساورکر نے 'پہلی جنگِ آزادی' کے نام سے کتاب لکھی تو اس پر پابندی عائد کر دی گئی آزادی کے بعد برصغیر کے مؤرخوں نے اس موضوع پر جو تحقیق کی ہے اس سے اس واقعے کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً اس میں کسانوں کی بغاوتیں ہیں، دلت لوگوں کی مزاحمت ہے اور عام لوگوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات ہیں۔

حال ہی میں ایک مؤرخ نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ اس میں کوئی دس لاکھ لوگوں کو قتل کیا گیا یا پھانسی پر چڑھایا گیا۔ دہلی کے قریب جنگلوں میں درختوں پر لاشیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں سو سالہ اور ڈیڑھ سو سالہ ہونے والے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں اس پر بہت نئی تحقیق سامنے آئی ہے۔

# پاکستان کے زرعی مسائل
# اور
# کسان تحریک

یہ رپورٹ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے سیکریٹری امورِ محنت چوہدری فتح محمد نے پارٹی کی کانفرنس منعقدہ یکم و دو فروری ۱۹۷۵ء میں پیش کی۔

# کسان تحریک

کسان کمیٹی کی تنظیم کی ابتداء برصغیر پاک و ہند میں اس وقت سے ہی شروع ہو چکی تھی جب اس حصے میں ترقی پسند خیالات پھیلنے شروع ہوئے تھے مگر اس کی باقاعدہ مرکزی تنظیم پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا کسان سبھا کے نام سے قائم ہوئی جس کی قیادت میں ہر صوبے میں تنظیم کو پھیلانے اور کسانوں، مزارعوں، کھیت مزدوروں اور دیہاتی دستکاروں کے حقوق کے حصول کے لیے جاگیرداری کے خاتمے، بیدخلی بند کرانے، بیگار نذرانے اور جرمانے ختم کرانے، اجرتوں میں اضافے اور ٹیکسوں میں کمی اور انگریز سامراج سے جلد از جلد آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد تیز کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور کچھ ہی عرصے میں ہر صوبے میں اس تنظیم نے مؤثر کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

قیام پاکستان کے وقت یہ تنظیم پنجاب میں 'پنجاب کسان کمیٹی' سندھ میں 'سندھ ہاری کمیٹی' اور صوبہ سرحد میں 'سرحد کسان جرگہ' کے ناموں سے قائم تھی۔ اپنے اپنے صوبوں میں کسانوں کی جدوجہد میں راہنمائی کرنے کی وجہ سے خاصی متعارف ہو چکی تھی۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے بعض مقامات پر کسانوں کی بیدخلی اور ان پر ہونے والے ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد میں کامیاب لڑائیاں لڑ چکی تھی مگر تبادلہ آبادی کی وجہ سے بہت سے غیر مسلم کسان کارکنوں کی نقل مکانی کر جانے سے پاکستان کے ان صوبوں میں کسان تنظیم انتشار کا شکار ہو گئی اور ختم ہو کر رہ گئی۔

پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۷ء کے آخری حصہ میں از سرِ نو ان صوبوں میں موجود کسان کارکنوں سے رابطہ قائم کیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے سرگرم کسان کارکنوں کا اجلاس ہوا جس میں دادا فیروز الدین کی قیادت میں ان صوبوں میں پھر سے کسان تنظیم کو منظم کرنے کا فیصلہ ہوا چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء میں ضلع لائل پور تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں چک نمبر ۴۰۵ ج۔ب میں پنجاب کانفرنس ہوئی جس میں صوبے بھر کے کسان کارکنوں نے شرکت

کی اس کانفرنس میں پنجاب کسان کمیٹی کی پھر سے بنیاد رکھی گئی نیز اس کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ ملک سے جاگیرداری کے خاتمے، مزارعوں کی بیدخلیوں کو بند کرانے اور ان سے بیگار جرمانے اور نذرانے وغیرہ لینے کے خلاف جدوجہد کرنے 'بٹے اُتے ادھوادھ ونڈ کرانے' اور مہاجرین کی آبادکاری کے لیے کام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس طرح 'سندھ ہاری کمیٹی' اور 'سرحد کسان جرگہ' نے اپنے اپنے صوبوں میں کوششیں شروع کردیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کی تنظیم جلد ہی قائم ہوگئی مگر سرحد کسان جرگہ اپنی باقاعدہ تنظیم نہ بنا سکا البتہ کسان کارکن صوبے کے مختلف علاقوں میں کسان جرگہ کی تنظیم قائم کرنے کے ساتھ ساتھ کسانوں کی جدوجہد میں رہنمائی کرتے رہے۔

پنجاب کسان کمیٹی کے فیصلے کے مطابق جب پنجاب کے ہر ضلع میں کسان تنظیم قائم ہونے لگی اور کسان کارکنوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جاگیرداری کے خاتمے بیگار جرمانے اور نذرانے ختم کرانے اور 'بٹے اُتے ادھوادھ ونڈ کرانے' کے لیے جلسے میٹنگیں شروع کیں تو اس کا بہت ہی اچھا اثر ہوا جگہ جگہ مزارعوں نے بیگار دینے، نذرانوں اور جرمانوں کی ادائیگی سے انکار کردیا اور فصل کی بٹائی کھیت میں کرنے پر اصرار کیا۔ جب مالک کھیت پر بٹائی کے لیے تیار نہ ہوتا تو کسان 'کسان کمیٹی' کے جھنڈے تلے جلسہ کرتے اور خود بٹائی کرکے اپنا حصہ لے جاتے اور مالک کا حصہ کھیت ہی میں چھوڑ دیتے، یہ تحریک تیزی سے پھیلی اور ملتان، مظفرگڑھ، ڈیرہ غازی خاں، میانوالی اور دوسرے اضلاع تک چلی گئی۔ اس تحریک کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے مزارعوں میں اجتماع جدوجہد کا شعور پیدا ہوا کسان کمیٹی کی قیادت پر اعتماد بڑھا اور کسان کمیٹی گاؤں گاؤں بننے لگی جس سے گھبرا کر جاگیرداروں اور وڈیروں نے ۵۰-۱۹۴۹ء میں مزارعوں کو بیدخل کرنے کی مہم شروع کی مگر کسانوں میں جدوجہد کا شعور آچکا تھا اور انہیں اپنی جدوجہد پر اعتماد بھی تھا اس لیے انہوں نے بیدخلیوں کے خلاف جلسے جلوس شروع کردیے اور ایک دوسرے کی مدد کرکے بیدخلیوں کا مقابلہ کیا اور اپنی زمینوں کے قبضے چھوڑنے سے انکار کردیا۔ کئی مقامات پر تصادم ہوئے۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ مقدمات بنائے گئے، پولیس استعمال کی گئی، کسان کارکنوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے اور گرفتاریاں کی گئیں، کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے اور کئی گرفتار بھی کی گئیں مگر ان کاروائیوں کے باوجود کسان تحریک دبائی نہ جاسکی اور بالآخر حکومت نے مجبور ہوکر ۲ مئی ۱۹۵۰ء کو بیدخلیوں کی روک تھام کے لیے ایک

آرڈی ننس جاری کر دیا جس کی رو سے زمینداروں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ مزارعہ کو صرف اسی شکل میں بیدخل کر سکیں گے جب وہ عدالت میں یہ ثابت کر دیں کہ ذیل کی شرائط میں سے کسی ایک کی مزارعہ نے خلاف ورزی کی ہے۔

'مزارعہ بٹائی دینے سے انکار کرے یا زمیندار کی مرضی کے مطابق زمین کاشت نہ کرے یا زمین کو علاقائی رواج کے مطابق کاشت نہ کرے اور خراب کرے یا عدم ادائیگی لگان کی تحریک میں حصہ لے یعنی کسان کمیٹی کا ممبر بنے۔'

چنانچہ اس آرڈی ننس سے کسانوں میں ہمت پیدا ہوئی اور کسان تنظیم تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور سارے پنجاب میں متعارف ہوگئی اور ملتان، لائل پور، گوجرانوالہ، ساہی وال اور کسی حد تک میانوالی کے دیہات میں بھی کسان کمیٹیوں کی تنظیم قائم ہوگئی اور ان کی جدوجہد زیادہ منظم طریقے سے ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے بیگار، جرمانے اور نذرانے ممنوع قرار دیے گئے وہ جاگیریں جن کو نقدی کی شکل میں سرکاری خزانے سے رقم ادا کی جاتی تھی ختم کر دی گئیں موروثی مزارعین کے ایک حصہ کو جو مالیہ کے برابر یا اس سے کم مالکوں کو لگان ادا کرتے تھے بلا معاوضہ مالک قرار دے دیا گیا اور جو جنس کی صورت میں مالکوں کو لگان ادا کرتے تھے وہ جس قدر پیداوار کا حصہ اپنے پاس رکھتے تھے اتنے حصے کے مالک قرار دے دیے گئے اور ان موروثی مزارعین جو کچھ نقد کچھ جنس کی شکل میں ادا کرتے تھے لگان کا ۲۰ گنا ادا کرنے کے بعد مالک قرار دے دیا گیا۔ آئندہ کے لیے موروثیت کا حق ختم کر دیا گیا۔ ان زرعی اصلاحات میں سب سے اہم یہ بات تھی کہ پیداوار میں مزارعہ کا حصہ ۶۰ فیصد اور مالک کا حصہ ۴۰ فیصد قرار دیا گیا عدم ادائیگی کی تحریک میں حصہ لینے کی بنا پر بیدخل کیے جانے کی شق ختم کر دی گئی مگر صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد میں چونکہ پنجاب کے مقابلے میں تنظیم کمزور تھی اس لیے ان دونوں صوبوں میں مزارعین کے حقوق کے متعلق جو قانون بنائے گئے وہ بیدخلی کے خلاف تحفظ نہ دے سکے۔ پنجاب میں پہلی بار مزارعوں کو بیدخلی سے تحفظ کا حق حاصل ہوا اور پیداوار میں اس کے حصہ کے تناسب میں اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسانوں میں خود اعتمادی کا پیدا ہونا ضروری تھا اور ان کا کسان کمیٹی کی جدوجہد پر بھروسہ کرنا بھی قدرتی بات تھی لیکن حکومت اسے کیسے گوارا کرتی چنانچہ دولتانہ حکومت نے کسان تحریک کو کمزور کرنے اور اس میں پھوٹ ڈالنے کی خاطر مسلم لیگ کی زیر قیادت کسان کمیٹی کی تنظیم بنائی اور اس کا ایک اخبار بھی

جاری کیا۔مگر مسلم لیگ کی یہ تنظیم دیرپا ثابت نہ ہوسکی اور وہ اپنے منصوبے میں ناکام ہوگئی اور یہ تنظیم بالآخر ختم ہوگئی۔

دولتانہ وزارت کی زرعی اصلاحات سے پیدا شدہ صورتِ حال اور مہاجرین کی عارضی مستقل آبادکاری کی اسکیم پر غور کرنے اور کسان کمیٹی کی تنظیم کو پھیلانے اور اس کی جدوجہد پر نئے حالات میں غور کرنے کے لیے ۱۴۔۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو پنجاب کے سرگرم کسان کارکنوں کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۴۔۵ ستمبر ۱۹۵۲ء کو گوجرانوالہ میں پنجاب کسان کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں مجوزہ پروگرام اور آئین وضوابط پیش کر کے منظوری لی جائے جو ۱۴۔۱۵ر جولائی کو لاہور میں کسان کارکنوں کی میٹنگ میں تجویز ہوا تھا گوجرانوالہ کانفرنس میں پہلی دفعہ پنجاب بھر کے کسان کارکنوں کے علاوہ عام کسانوں نے شرکت کی اس کانفرنس میں زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کرانے، بیدخلی بند کرانے اور عارضی مستقل بندوبست کے تحت مہاجر کسانوں کو متبادل رقبے دیے بغیر بیدخلی ممنوع قرار دینے اور جاگیرداری کے خاتمے کے لیے جدوجہد کا پروگرام بنایا گیا۔اس کانفرنس میں سندھ اور صوبہ سرحد سے بھی مندوبین نے شرکت کی۔اس کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کسان کمیٹی کی تنظیم پاکستان کی سطح پر قائم کی جائے اور اس کے لیے باقی صوبوں کی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا جائے چنانچہ اس کانفرنس کے فیصلوں کی روشنی میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں جلسے، کانفرنسیں شروع کی گئیں اور عارضی مستقل بندوبست کے سبب بے مالک مہاجر کسانوں کی جو بیدخلیاں شروع ہوگئی تھیں اور ساتھ ہی متروکہ اراضی کے سابقہ مزارعوں کی بیدخلی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ان بے دخلیوں کو روکنے کے لیے گوجرانوالہ، لائل پور اور ملتان میں زوردار تحریک چلی جس کے نتیجے میں مجبور ہوکر حکومت نے یہ اصول تسلیم کرلیا کہ متبادل رقبے دیے بغیر کسی مزارعہ کو بیدخل نہ کیا جائے اور اس مقصد کے لیے سرکاری قابل کاشت اراضی جو پہلے ٹنڈر پر دی جاتی تھی مہاجر مزارعوں اور غیر مسلم رقبہ کے سابقہ مزارعوں اور چھوٹے مالک مہاجر کسانوں کو جو تین ایکڑ سے کم رقبے کے مالک تھے اور کسی کے مزارعہ تھے ۸ر ایکڑ سے ½۱۲ر ایکڑ تک دینے کا اعلان کیا اور اس طرح ایک لاکھ ایکڑ سے زائد رقبہ دس گنا اور بیس گنا مالیہ کا بطور لگان پر دے دیا گیا جو بعد میں مزارعین کو ۱۹۶۲ء میں بطور ملکیت دے دیا گیا۔

جون ۱۹۵۴ء کو حکومت نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اس کی ہر قسم کی

سرگرمی پر پابندی عائد کردی گئی اور اس کے ساتھ کسان کمیٹی کی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں لگادی گئیں اور اس کے دفاتر سربمہر کردیے گئے یہ وہ وقت تھا جب ملک میں امریکی سامراج کا اثر ونفوذ بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور پاکستان امریکی سامراج کی عالمی حکمت عملی کا حصہ بن چکا تھا جس کے خلاف پاکستان کمیونسٹ پارٹی اور اس کی زیر قیادت پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، کسان کمیٹی طلباء اور دانشوروں کی تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین جنہوں نے امریکی سامراج کے اثر ونفوذ کے خلاف اور عوامی مطالبوں کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی اور اس جدوجہد کی پاداش میں جہاں اس کی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کردی گئیں وہاں سرگرم کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا جیلوں سے رہائی کے بعد کسان کارکنوں نے پھر سے کام شروع کردیا اگرچہ مرکزی تنظیم موجود نہ تھی مگر اس کے باوجود کام بدستور جاری رہا۔

۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت ۱۹۵۸ء میں انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا تمام سیاسی پارٹیاں انتخابی تیاریوں میں مصروف ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے کسان کارکنوں کو بھی کھلے بندوں کام کرنے کا موقع ملا اور ایک بار پھر جاگیرداری کے خاتمے، حد ملکیت کے تعین، بیدخلی بند کرنے، لگان کی وصولی ختم کرانے اور سرکاری الاٹ شدہ زمین کو ملکیت قرار دینے کے حق میں جدوجہد شروع کی گئی اور ۱۹۵۸ء تک اس کے حق میں فضا بن گئی محسوس ہوتا تھا کہ شاید ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے بعد جو بھی حکومت بنے گی اس کے لیے زرعی اصلاحات کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا ان جلسوں اور مظاہروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید انتخابات میں کامیاب ہونے والی حکومت امریکی سامراج کے ساتھ ان رشتوں کو برقرار نہیں رکھ سکے گی انہی اسباب کی بناء پر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کردیا گیا اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کردی گئیں اور ساتھ کمیونسٹ پارٹی کسان کمیٹی اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے رہنماؤں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ مگر اس کے باوجود مارشل لاء حکومت ریگولیشن نمبر ۶۴ کے ذریعے ۱۹۵۹ء میں زرعی اصلاحات کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس کی رو سے حد ملکیت ۱۵۰۰/۱ ایکڑ نہری ایک ہزار/۱ ایکڑ بارانی یا ۳۶۰۰۰ یونٹ جو بھی زیادہ ہو رکھنے کی اجازت دینے اور ۱۸۰۰۰/۱ یونٹ عزیز واقارب کے نام منتقل کرنے گھوڑی پالنے اور باغوں وغیرہ کے لیے ۱۵۰/۱ ایکڑ رکھنے کی اجازت دے دی گئی شکارگاہیں اور چراگاہوں کے رقبے اس کے علاوہ رکھنے کا حق دے کر عملاً زرعی اصلاحات کو بے اثر کردیا گیا مگر سب سے اہم بات یہ تھی کہ پہلی دفعہ پاکستان

میں حد ملکیت کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا اور یہ تاثر ختم ہو گیا کہ زمینداریاں اور وڈیرہ شاہی ابدی ہیں اور ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۵۹ء میں جیلوں سے رہا ہونے کے بعد پھر کارکنوں کے رابطے قائم ہوئے اور پھر سے سیاسی بحث مباحثہ شروع ہوا اور ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء کے تحت انتخابات ہوئے اور نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کا قیام عمل میں آیا اور مغربی پاکستان کی پہلی اسمبلی کے سامنے سرکاری زمین کے الاٹیوں نے حقِ ملکیت کے لیے بھوک ہڑتال کی جس کے نتیجے میں ان کو حقِ ملکیت دینے کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔

سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ہوئی تو پھر سے کسان کمیٹی کی تنظیمی سرگرمیاں جاری ہو گئیں اور جناب سی۔آر۔اسلم نے صوبہ سندھ، سرحد اور پنجاب کے کسان کارکنوں کے مشورے سے ۲۷۔۲۸/اپریل ۱۹۶۳ء کو مغربی پاکستان کسان کمیٹی کا کنونشن خانیوال ضلع ملتان میں بلایا جس میں سندھ، سرحد اور پنجاب کے تمام سرگرم کارکنوں نے شرکت کی اس کانفرنس میں عبوری دستور اور پروگرام منظور کیا گیا اس کانفرنس کے کھلے اجلاس عام میں مولانا عبدالحمید بھاشانی نے مشرقی پاکستان کسان سمتی کے صدر کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۶۳ء میں پنجاب، سندھ اور سرحد میں صوبائی کسان کمیٹی کی تنظیمی کمیٹیاں بنائی گئیں جن کے ذریعے ہر ضلع میں کسان کمیٹی کی ممبر شپ کرنے کے ساتھ ساتھ ضلع تک انتخابات کرانے کے پروگرام بنائے گئے نیز ملک سے جاگیرداری کا بلا معاوضہ خاتمہ، سرکاری زمین کی نیلامی بند کرانے اور بے زمین مزارعوں، ہاریوں، چھوٹے مالک کسانوں اور کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم کرانے مالیہ کی گذارہ یونٹ تک کے مالکان سے وصولی بند کرانے۔ پیشہ ورانہ ٹیکس کی منسوخی، دستکاروں کو رہائشی احاطوں کا حق ملکیت دینے کے مطالبات پر جدوجہد شروع کی۔ ۱۹۶۵ء تک پنجاب میں صرف کیمبل پور ہی ایسا ضلع تھا جہاں کسان کمیٹی کی تنظیم نہیں ہو سکی تھی باقی اضلاع میں ممبر شپ انتخابات اور منتخب ڈیلیگیٹوں پر مشتمل پنجاب ڈیلیگیٹ کسان کانفرنس یکم دو جولائی ۱۹۶۶ء کو ملتان شہر میں ہوئی جس میں صوبہ پنجاب کے زرعی مسائل کا جائزہ لیا گیا اور اس کانفرنس میں زرعی مسائل کے حل کے لیے ایک پروگرام منظور کیا گیا جس کو پمفلٹ کی شکل میں چھاپ کر تقسیم کیا گیا اس کانفرنس میں کسان کمیٹی کا آئین منظور ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ جاگیرداری کے بلا معاوضہ خاتمے۔ سرکاری زمین کی نیلامی بند کرا کر اسے

مزارعوں کھیت مزدوروں میں تقسیم کرانے۔ مالیہ گذارہ یونٹ کے مالکان کا منسوخ کرانے۔ پیشہ ورانہ ٹیکس کے خاتمے کے لیے پنجاب بھر میں مہم چلائی جائے جلسے جلوس کیئے جائیں، ہینڈ بل اور پوسٹر شائع کیے جائیں۔گاؤں گاؤں میٹنگیں کی جائیں زیادہ سے زیادہ کارکنوں کو تیار کیا جائے اور انہیں کسانوں میں کام کرنے کے لیے متحرک کیا جائے اس کانفرنس میں سندھ اور سرحد سے بھی مندوبین شریک ہوئے۔

۸۔ستمبر ۱۹۶۷ء کو مغربی پاکستان کسان کمیٹی کا ڈیلیگیٹ اجلاس لاہور میں ہوا جس میں پنجاب کے علاوہ صوبہ سندھ سے اور چند دوست بلوچستان سے شامل ہوئے اور مغربی پاکستان کسان کمیٹی کے انتخابات کے علاوہ آئین اور پروگرام منظور کیا گیا۔ماہ اپریل ۱۹۶۸ء کو موضع شاہ آباد ضلع پشاور میں صوبہ سرحد کسان جرگہ کانفرنس ہوئی جس میں صوبہ سرحد کسان جرگہ کا انتخاب ہوا پروگرام اور آئین منظور ہوا اس کانفرنس میں بھی جاگیرداری کے بلا معاوضہ خاتمے سرکاری زمین کی نیلامی ختم کرانے، زمین مزارعوں میں تقسیم کرنے اور بیدخلی بند کرانے کی جدوجہد کرنے کا فیصلہ ہوا۔اس سلسلے میں صوبہ سندھ میں بھی سندھ ہاری تنظیم قائم کی گئی مختلف اضلاع کے دوزے کیے گئے اور بیدخلی بند کرنے جاگیرداری کے بلا معاوضہ ختم کرنے اور زمین کا نیلام بند کرنے اور اُسے ہاریوں میں بلا معاوضہ تقسیم کرنے کے لیے میٹنگیں کی گئیں مگر تمام کوششوں کے باوجود مرکزی تنظیم نہ بن سکی۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں بلوچستان کا دورہ کیا گیا اور وہاں پر بھی کسان کمیٹی کی تنظیم بنانے کی کوشش کی گئی جو اس وقت نہ بن سکی لیکن رفقاء نے اس کام کو کرنے کے لیے اپنا ایک گروپ بنایا تاکہ بلوچستان کے دورے کے بعد تنظیمی کمیٹی بنائی جائے۔اس طرح مغربی پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں جہاں ہر ضلع اور ہر علاقہ میں کسان تنظیم قائم تھی کے ذریعے کسان کمیٹی کے پروگرام کی بنیاد پر ملک بھر میں مہم چلائی گئی۔اس طرح آہستہ آہستہ زمینداریوں کے بلا معاوضہ خاتمے سرکاری زمینوں کی نیلامی بند کر کے یہ زمین مزارعوں اور چھوٹے مالکوں میں تقسیم کرنے گذارہ یونٹ کے مالکوں کو مالیہ سے مستثنےٰ قرار دینے، پیشہ ورانہ ٹیکس کے خاتمے اور جیہڑا واہوے او ہو کھاوے کے حق میں فضا پیدا ہوئی، دیہاتوں، شہروں اور قصبوں میں جاگیرداری کے خاتمے کے لیے فضا ہموار ہو چکی تھی زرعی انقلاب کا ہر جگہ ذکر ہو رہا تھا۔ان حالات میں ۲۳۔مارچ ۱۹۷۰ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ

کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس مقصد کے لیے ۸ر فروری ۱۹۷۰ء کو پنجاب کسان کونسل کا اجلاس ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کے مقاصد کو عام کیا جائے اور کسانوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے ملک بھر میں جلسے جلوس میٹنگوں، ہینڈ بلوں، پوسٹروں کے علاوہ اخباری بیانات کے ذریعے گھر گھر اور ہر فرد تک پہنچانے کے لیے پروگرام بنایا گیا۔ چنانچہ ہر یونٹ اور کارکن نے ان ہدایات کے مطابق پروگرام بنالیا۔ لاکھوں کی تعداد میں ہینڈ بل، پوسٹر شائع کیے گئے جلسے جلوس اور میٹنگیں کی گئیں جگہ جگہ ماٹو لٹکائے گئے روزانہ بیانات اخبارات کو دیے گئے جس سے اس تاریخ ساز کانفرنس کے لیے فضا ہموار ہوئی پاکستان کے ان سیاسی و طبقاتی کارکنوں کے اس کام کی اہمیت اور افادیت کا اظہار ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۰ء کی عدیم المثال کسان کانفرنس کی شکل میں ہوا جو مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی کی صدارت میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد ہوئی جس میں کئی لاکھ کسانوں، مزدوروں، دانشوروں اور دوسرے محنت کش عوام نے حصہ لیا جو مغربی پاکستان کی سطح پر خیبر سے کراچی تک اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ مشرقی پاکستان کرشک سمتی (کسان کمیٹی) کے صدر مولانا بھاشانی کے علاوہ حاجی دانش اور مسیح الرحمٰن نے بھی شرکت کی۔ سرحد کسان جرگہ اور سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں اور پنجاب کی کسان و دانشور عورتوں کے علاوہ فیض احمد فیض جیسے ترقی پسند اور قابل فخر شاعر نے بھی شرکت کی اور اپنے کلام کو پیش کرنے سے قبل اس عظیم اجتماع پر اپنی حیرت اور دلی خوشی کا اظہار کیا۔

اس عظیم کانفرنس کا ہی نتیجہ تھا کہ ووٹ سمیٹنے والوں نے خواہ وہ پیپلز پارٹی تھی یا جماعت اسلامی 'کسانوں کو ½۱۲ ایکڑ زمین' دینے، جاگیرداری کے خاتمے، سرکاری زمین کی نیلامی بند کر کے مزارعوں کو دینے۔ 'مالیہ ½۱۲ ایکڑ تک ختم کرانے' کے نعروں کو اپنے انتخابی پروگراموں میں شامل کیا تھا۔ انتخابات کے فوری بعد ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۱ء کو خانیوالی ضلع ملتان میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کی سالگرہ کے طور پر کسان کانفرنس منعقد ہوئی اگرچہ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لیے پیپلز پارٹی ملتان کے علاوہ کئی ایسے افراد نے بھی کوششیں کیں جو اپنے کو انقلابی اور مزدوروں کسانوں کا ساتھی اور رہنما تصور کرتے تھے۔ مگر انتخابات کے ہنگاموں کے فوری بعد اور اس دوطرفہ مخالفت کے باوجود یہ کانفرنس اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہی اس کانفرنس میں ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسی دھوم دھام تو نہ تھی مگر اس میں دور دراز سے مزارع، کھیت مزدور، کسان اور

دستکار کثیر تعداد میں شریک ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی کا جادو اس کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے اس کانفرنس میں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ پاکستان کے کسان جاگیرداری کے بلا معاوضہ خاتمے کے بغیر اور سرکاری زمین نیلام کی بجائے معاوضہ تقسیم کرائے بغیر دم نہ لیں گے اور فیصلہ کیا گیا کہ کسان کمیٹی اس مقصد کے حصول کے لیے بیدخلی بند کرانے کے لیے جدوجہد جاری رکھے گی۔

کسان کمیٹی کی متواتر جدوجہد سے عوام بالخصوص کسانوں میں جاگیرداری کے خاتمے اور سرکاری زمین کی نیلامی بند کرانے اور بیدخلی روکنے کے لیے جو شعور اور احساس پیدا ہوا اس کا اظہار ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس میں ہو چکا تھا اور اس کے بعد خانیوال کسان کانفرنس کی کامیابی نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس سے کم کسی چیز کو قبول نہ کریں گے جس کے نتیجے میں یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو پیپلز پارٹی نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا جس میں حد ملکیت کو خاندان کی بجائے فی کس کی بنیاد پر مقرر کر کے جاگیرداری کو بدستور قائم رکھنے کی کوشش تو کی مگر زمین کو بلا معاوضہ مزارعوں میں تقسیم کرنے کے اصول کو پہلی بار تسلیم کر لیا گیا۔

دوسری بات جسے وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی وہ سرکاری زمین کی نیلامی بند کرنے کی تھی اسے مزارعوں، چھوٹے مالک کسانوں میں تقسیم کرنے کا اصول مان لیا گیا۔

کسان کمیٹی کی متواتر اور طویل جدوجہد ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان میں جاگیرداری کے بلا معاوضہ خاتمے کا اصول تسلیم کیا گیا اور سرکاری زمین کی نیلامی کو بند کر کے اسے کسانوں میں تقسیم کے اصول کو مان لیا گیا ہے مگر اس کے باوجود اب بھی جاگیرداری نظام بنیادی طور پر قائم ہے اور اس کے مکمل خاتمے کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت ہے جس کے لیے کسان کمیٹی کی جدوجہد جاری ہے۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۷۲ء کو نواب بہاول پور کی جاگیر کے علاقے اور پنجاب کے دور افتادہ دیہات چنی گوٹھ ضلع بہاول پور میں کسان کانفرنس ہوئی یہ پہلی کسان کانفرنس تھی جو اس علاقے میں جہاں آبادی منتشر تھی اور ذرائع رسل و رسائل بہت محدود تھے یہ کانفرنس اس لحاظ سے بہت کامیاب تھی کہ ان دقتوں کے باوجود مزارعین، کھیت مزدور اور دیہی دستکاروں کے علاوہ چھوٹے مالک کسان کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

اس کانفرنس میں بھٹو زرعی اصلاحات کو ناکارہ قرار دیا گیا اور اسے جاگیرداری نظام کو مختلف حیلے بہانوں سے قائم رکھنے کا ذریعہ قرار دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ستمبر ۱۹۷۲ء میں کبیر والا ضلع ملتان میں پاکستان کسان کمیٹی اور پنجاب کسان کمیٹی کی کونسلوں کے اجلاس بلائے جائیں جن میں زرعی اصلاحات کا جائزہ لے کر جدوجہد کے لیے طریقہ کار طے کیا جائے۔

۲۰۔ ستمبر ۱۹۷۲ء کو کبیر والا میں پاکستان کسان کمیٹی اور پنجاب کسان کمیٹی کی کونسلوں کا اجلاس ہوا جس میں زرعی اصلاحات کا جائزہ لینے کے بعد جدوجہد کے لیے پروگرام مرتب کیا گیا اور ۳۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پنجاب کسان کانفرنس وہاڑی میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا نیز اس میں پاکستان کسان کمیٹی اور پنجاب کسان کمیٹی کے انتخابات عمل میں آئے۔

۳۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پنجاب کسان کانفرنس وہاڑی ضلع ملتان میں ہوئی جس میں پنجاب بھر سے کسانوں نے گاڑیوں، بسوں اور جلوسوں کی شکل میں شرکت کی اور اس میں زرعی اصلاحات کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ ۱۰۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو سرائے عالمگیر میں کسان کانفرنس ہوئی یہ اس اعتبار سے کامیاب تھی کہ بارشوں کے باوجود لوگ دیہات سے آئے تھے اور انہوں نے نام نہاد زرعی اصلاحات کے ناکافی ہونے پر احتجاج کیا۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو پشاور میں کانفرنس ہوئی اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۴ کو کسان کانفرنس ٹانڈہ علاقہ حسن ابدال ضلع کیمبل پور میں ہوئی یہ علاقہ بہت ہی پس ماندہ اور دور افتادہ ہے اس علاقہ کی آبادی بہت ہی بکھری ہوئی ہے مگر اس کے باوجود یہ کانفرنس بہت ہی کامیاب رہی۔

## صوبہ سرحد کی کسان تحریک

صوبہ سرحد میں کسان تحریک کا آغاز پاکستان سے قبل ہی ہو چکا تھا خوانین کا استحصال کسانوں کی بے دخلیاں، پیداوار کی من مانی تقسیم اور بیگار اس تحریک کے اسباب بنے خوانین کسانوں سے نذرانے اور بیگار لیتے تھے۔ غلہ کی تقسیم بجائے کھیتوں کے اپنے کھلیانوں میں کرتے تھے اور جو ان کی پسند کے مطابق عمل نہ کرتا تھا اسے بیدخل کر دیتے تھے صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خانصاحب کی کانگریسی حکومت کے دوران کسانوں نے اپنے جرگے بنا کر احتجاج کیا مگر حکومت نے ان کی شنوائی نہ کی اور اس کے نتیجے میں کسان جرگہ کی تنظیم قائم ہوئی۔ صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں

یہ تحریک پھیلی لیکن اس تحریک کو اضلاع پشاور و مردان میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کسانوں نے نذرانے اور بیگاریں دینے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ پیداوار کا ڈھیر تیار ہونے پر کھیت میں بٹائی نصفی کی جائے۔ 'غلہ ڈھیری' ان کا نعرہ تھا، حکومت نے خوانین کی سرپرستی کی اور بہت سے کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں مگر اس کے باوجود تحریک نہ دبائی جاسکی اور ان کے مطالبات جزوی طور پر تسلیم کیے گئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بہت سے کارکن غیر مسلم ہونے کے سبب ترکِ وطن کر گئے اور اس کی وجہ سے تحریک میں جمود طاری ہو گیا لیکن جب ۱۹۴۸ء میں خوانین نے دھڑا دھڑ کسانوں کو بیدخل کرنا شروع کیا تو مختلف اضلاع میں کسانوں نے پھر متحد ہو کر جدوجہد کی لیکن وہ بے دخلیوں کو رکوانے اور پیداوار میں اپنا حصہ مقرر کرانے کا قانون نہ بنوا سکے۔

تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں ایک بڑا علاقہ واقع ہے جسے ہشت نگر کہتے ہیں یہ علاقہ کبھی بنجر تھا اور اسے آہستہ آہستہ مہمند قبیلے کے لوگوں نے اپنی محنت و مشقت سے قابل کاشت بنا کر لالہ زار کر دیا اور آج یہ علاقہ سب سے زیادہ زرخیز شمار ہوتا ہے اور یہاں کئی شوگر مل بن گئے ہیں۔ علاقے کا بیشتر رقبہ گنا پیدا کرتا ہے۔ خوانین نے دھڑا دھڑ ٹریکٹر خریدے تاکہ خود کاشت کریں اور اس لیے انہوں نے بڑے پیمانے پر کسانوں کی بیدخلیوں کے منصوبے پر عمل کرنا شروع کیا ان کے اس استحصال کا نشانہ مہمند کسان زیادہ بنے خوانین نے جن میں پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے اراکین نمایاں طور پر شامل تھے انجمن تحفظ حقوق کاشتکاراں و زمینداراں بنائی اور انتظامیہ کے تعاون سے کسانوں کی بیدریغ بے دخلیاں شروع کیں تو کسانوں نے بیدخل ہونے سے انکار کیا ان کے سامنے پیپلز پارٹی کا انتخابی نعرہ 'زمین کاشتکار کی' تھا۔ انہوں نے کئی جگہ بٹائی دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی ضرب کو زیادہ تر ان چھوٹے مالکوں نے محسوس کیا جو ناقابل گذارہ مقدار اراضی کے سبب ملازمتیں وغیرہ کرنے پر مجبور تھے اور خود کاشت نہ کرتے تھے وہ اپنے مفاد کے لیے ان ہی خوانین کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور ہوئے جن کی وہ کسان جرگہ میں شرکت کر کے ہمیشہ مخالفت کیا کرتے تھے۔ اب وہ کسانوں کے برعکس خوانین کے اتحادی بن گئے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں کسان جرگہ بے جان ہو گیا۔ خوانین کی جبریہ بیدخلی کے عمل کے نتیجے میں کئی جگہ تصادم کے واقعات ہوئے اور سب سے زیادہ سنگین تصادم موضع مندنی میں ہوا

جس میں خوانین کے مسلح نوکروں اور پولیس کے ہاتھوں بہت سے کسان مارے گئے اور زخمی ہوئے اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران صوبہ سرحد کے نئے ضلع سوات و مالاکنڈ وغیرہ میں خوانین نے جن میں پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی اور مسلم لیگ کے اراکین شامل ہیں نہایت بیدردی سے بہت سے کسان رہنماؤں اور کسانوں کو قتل کیا۔

سرحد کا کسان بھی پنجاب کے کسان کی طرح زمین مانگ رہا ہے وہ بھی اپنے جائز حقوق کے کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہے لیکن پنجاب کے کسان کی طرح اسے حق مزارعت کا تحفظ تک نہیں دیا گیا ہے اس کی بڑی وجہ کسان تحریک کی منظم طاقت کی کمی سے تعلق رکھتی ہے۔ سرحد کے کسانوں کو جو تازہ تجربہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خوانین خواہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں ان کے استحصال اور بیدخل کرنے کے لیے متحد ہیں اور انتظامیہ جو پبلک سرونٹس (عوام کے نوکر) کہلاتی ہے وہ کسانوں کے خلاف لٹیرے خوانین کا ساتھ دیتی ہے وخواہ وہ انتظامیہ پیپلز پارٹی کی زیر فرمان ہو یا نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی یا مسلم لیگ کی فرماں بردار ہو۔

قیام پاکستان کے بعد صوبہ سرحد میں کسان تحریک، کسان جرگہ کے نام سے ترقی پسند عناصر نے قائم کی اور اس کی کمیٹیاں بھی جگہ جگہ قائم ہوئیں لیکن حکومت کے تشدد اور ترقی پسند کارکنوں کی کمی کے باعث وہ زیادہ ترقی نہ کرسکیں اور خودرَو تحریک سے بڑھ کر منظم تحریک کی شکل اختیار نہ کرسکی۔ صوبہ سرحد میں بنوں، مردان، پشاور، سوات اور ضلع ہزارہ میں کہیں کہیں کسان جرگہ کے کارکن آج بھی موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صوبے میں تمام کسان کارکنوں اور سوشلسٹ کارکنوں کو مجتمع کرکے صوبہ کی سطح پر کسان جرگہ وجود میں لایا جائے۔ اور اس کے بعد صوبہ بھر میں کسان کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ جاگیرداری زرعی معیشت سے پسنے والے مزارعوں، کھیت مزدوروں اور زرعی معیشت سے وابستہ دوسرے محنت کشوں کو اس نظام کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرایا جاسکے اور ملک کو ترقی کی راہ پر ڈالا جاسکے۔ صوبہ سرحد میں کسانوں کے بنیادی مطالبات پاکستان کے باقی صوبوں کی طرح وہی ہیں کہ جاگیرداری زرعی نظام کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور پچاس ایکڑ فی خاندان سے زائد تمام اراضی کو بلا معاوضہ قومی ملکیت میں لے کر اس کے اصل وارثوں مزارعوں، کھیت مزدوروں، چھوٹے مالک کسانوں میں ازسرِ نو تقسیم کیا جائے اور زراعت کو کوآپرٹیو کی بنیاد پر منظم کیا جائے ان کے فوری مطالبات یہ ہیں کہ کسانوں کی بیدخلیاں

بند کی جائیں اور نقد آور اجناس گنے، چقندر اور تمباکو کی معقول قیمتیں مقرر کی جائیں اور سرکار کے مقرر کردہ بورڈوں میں کسان جرگہ کو نمائندگی دی جائے آبپاشی کا مناسب انتظام کیا جائے گذارہ یونٹ سے کم مالکان کا مالیہ منسوخ کیا جائے۔ مصنوعی کھاد کی قیمتیں کم کی جائیں اور عمدہ بیج اور کرم کش ادویات انہیں سستے داموں مہیا کی جائیں۔

## بلوچستان کی زرعی معیشت

بلوچستان کی زرعی معیشت پاکستان کے باقی حصوں کے جاگیرداری زرعی نظام سے مختلف ہے اس کا تقریباً ۵۔ فیصد رقبہ ایسا ہے جس پر کاشت ہوتی ہے بقیہ رقبہ زیر کاشت نہیں بلکہ چراگاہوں پر مشتمل ہے۔ اس صوبے میں بٹائی کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ پاکستان کے باقی حصوں کی طرح بلوچستان میں مربوط نظام آبپاشی نہیں ہے صرف ایک نہر پٹ فیڈر حال ہی میں بنائی گئی ہے جس سے آبپاشی کی جاتی ہے اس سے آبپاش ہونے والے رقبے میں سے ٦۔ لاکھ ایکڑ رقبہ ابھی تک تقسیم نہیں ہوا ہے آبپاشی کا دوسرا طریقہ کاریز کا ہے جو ایک قسم کے کنوئیں کی صورت ہے باقی زیر کاشت رقبہ بارانی ہے جس کا انحصار بارش پر ہے اس طرح اس صوبے میں زرعی معیشت اور چرواہی معیشت دونوں بیک وقت موجود ہیں۔

بلوچستان میں مزارعوں کے حقوق کا قانون تعین ابھی تک نہیں ہوا ہے اور نہ ہی اس کا قانونی حصہ پیداوار میں مقرر ہے۔ بیگار اور سرداری ٹیکس بدستور مزارعوں اور دوسرے محنت کش طبقات سے لیے جاتے ہیں۔ بلوچستان میں زرعی نظام کی مخصوص صورت یہ ہے کہ کچھ سال پہلے تک اراضی قبائل کی مشترکہ ملکیت ہوا کرتی تھی قبیلہ کے سردار کو اس کے انفرادی حصہ پیداوار کے علاوہ ایک مخصوص حصہ پیداوار اس کے سماجی منصب یعنی سرداری کے پیش نظر بطور خرچہ دیا جاتا تھا۔ اراضی کا وہ حصہ جو اس کے منصب کے پیش نظر سردار کو ملتا تھا اس کی ملکیت تصور ہوتا تھا مگر وہ یہ کسی اور کو منتقل نہیں کر سکتا تھا اور اس کے مرنے یا اپنے منصب سے علیحدگی کی صورت میں یہ اراضی نئے سردار کی ملکیت قرار پاتی تھی۔ استحصالی طبقاتی سماج چاہے وہ کسی دور کا بھی کیوں نہ ہو اس میں طاقتور دوسروں کی نسبت زیادہ پیداوار پر قبضہ کرنے پر قادر رہا ہے۔ چنانچہ یہ بلوچستان میں ہوا وہاں کے سرداروں اور بااثر افراد نے اپنے قبیلے کی مشترکہ اراضی پر قبضہ کر لیا۔

بلوچستان کی کثیر آبادی آج بھی بھیڑ بکریاں پالتی ہے جہاں تک زرعی معیشت کا تعلق ہے اس کی صورت کچھ اس طرح ہے کہ سرداروں نے اپنی اراضی ایک مقررہ شرح پر ایسے افراد کو دی ہوئی ہے جو 'لٹ بند' کہلاتے ہیں یہ لٹ بند اس اراضی کو مزارعوں سے کاشت کراتے ہیں ان مزارعوں کو 'شت بزگر' کہا جاتا ہے۔ 'لٹ بند' مالک کا حصہ پیداوار ادا کرنے کے بعد اور ۱/۴ یا ۱/۲ 'شت بزگر' کو دے کر بقیہ حصہ پیداوار سالم لے جاتا ہے گویا بلوچستان کی زرعی معیشت میں 'سردار' 'لٹ بند' 'شت بزگر' تین طبقے ہیں۔ مالک کی حیثیت غیر حاضر زمیندار کی ہے جو نہ زمین پر کوئی خرچ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اور ذمے داری قبول کرتا ہے وہ صرف 'لٹ بند' سے اپنے حصے کی پیداوار لے جاتا ہے سردار بارانی علاقوں میں ۱/۶ سے ۱/۱۰ تک اور آبپاش علاقوں میں ۱/۳ و ۱/۴ تک حصہ پیداوار لے جاتا ہے سردار کو رواج کے مطابق حصہ پیداوار دینے کے بعد جو باقی پیداوار بچے اس میں سے ۱/۴ یا ۱/۶ شت بزگر کو دے کر باقی تمام پیدوار لٹ بند لے جاتا ہے۔ لٹ بند زمین مزارعہ سے کاشت کراتا ہے اور اس کی حیثیت ایک طرح مالک کی ہے سوائے اس کے کہ وہ زمین کو فروخت نہیں کر سکتا۔ زرعی معیشت کی اصل پیداوار قوت یہی شت بزگر یعنی مزارعہ ہے جو پس ماندہ ہے اور استحصال کا شکار ہے اس وقت صرف لٹ بند طبقہ ہی ایسا ہے جو اپنے حقوق کا احساس رکھتا ہے اور سردار کے حصہ پیداوار دششک، کو ختم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے جبکہ یہ گروہ خود بھی بہت بڑا استحصالی ہے اور اس کی خوشحالی اور سماجی حیثیت 'شت بزگر' یعنی مزارعوں کی لوٹ کا براہ راست نتیجہ ہے۔

بلوچستان میں سب سے بڑا کام شت بزگر یعنی مزارعوں میں بیداری پیدا کرنے اور انہیں منظم کرنے کا ہے تاکہ سرداری نظام کے خاتمے کے ساتھ ان مزارعوں دشت بزگر، کو بھی زمین کا مالک بنایا جا سکے۔

کسان کمیٹی کے بلوچستان میں زرعی معیشت کو ترقی دینے کی طرف لے جانے کے لیے مندرجہ ذیل مطالبات ہیں جن کو مزارعین کی منظم جدوجہد سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ سرداری نظام کا مکمل خاتمہ اور ان کے ہر قسم کے حقوق و مراعات کا خاتمہ۔

۲۔ ۵۰/ ایکڑ فی خاندان کے علاوہ تمام اراضی کو قومی ملکیت میں بلا معاوضہ لے کر شت بزگروں یعنی مزارعوں بے مالک لٹ بندوں میں خود کاشت کی بنیاد پر از سرِ نو تقسیم۔

۳۔ کوآپریٹو کی بنیاد پر زرعی معیشت کی تنظیم۔
۴۔ مزارعوں دشت بزگروں، کا حصہ پیداوار میں زرعی اصلاحات کے مطابق دوسرے صوبوں کے برابر مقرر کرانا۔
۵۔ مزارعوں دشت بزگروں، کی بے دخلیاں قطعی بند کرانا۔
۶۔ بیگار نذرانے اور دیگر سرداری ٹیکسوں کو ختم کرانا۔
۷۔ چرواہی معیشت کو کوآپریٹو کی بنیاد پر منظم کرانا۔ مویشیوں کی بہتر نسل کی ترویج دلانا اور ڈیری فارموں کے قیام۔
۸۔ آبپاشی کے بہتر نظام کی فراہمی کا بندوبست کرانا۔

بلوچستان کی پس ماندہ معیشت کو ترقی دینے اور مزارعوں (شت بزگروں) کی خوشحالی کے لیے کسان کمیٹی کی تنظیم لازمی ہے۔ بلوچستان میں کسانوں کی تحریک کی کوئی روایات نہیں ہیں اس لیے ضروری ہے کہ سوشلسٹ کارکن اور جمہوریت پسند عناصر ان کو منظم کرنے کی طرف توجہ دیں۔ چونکہ بلوچستان کی آبادی منتشر ہے اس لیے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے تاہم وہاں کے پڑھے لکھے اور ترقی پسند نوجوانوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ان کو منظم کرنے میں دلچسپی لیں۔

## سندھ کے زرعی مسائل اور ہاری تحریک

صوبہ سندھ میں جاگیرداری زرعی نظام خاصی بھیانک شکل میں موجود ہے اور اس صوبے کی زیر کاشت اراضی کا بیشتر حصہ وڈیروں کی ملکیت میں ہے چھوٹے مالک اور درمیانے مالک بہت کم رقبے کے مالک ہیں۔ صوبہ سندھ کے وڈیروں کی زمینیں ہاری یعنی مزارعے کاشت کرتے ہیں جن کا زرعی اصلاحات سے پہلے پیداوار میں بہت کم حصہ تھا اور بیگار، نذرانے اور دوسرے جاگیری ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ اب بھی ہاریوں کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا وہ اکثر وڈیروں کے مقروض رہتے ہیں۔

سندھ میں قیام پاکستان کے بعد گدو اور کوٹری کے مقامات سے نہریں نکالی گئی ہیں اور اس طرح کئی لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت آیا ہے اور اس زیر کاشت رقبے کا کافی حصہ فوج اور سول کے بڑے افسروں کو انعام واکرام میں تقسیم کیا گیا ہے جس سے وڈیروں کا نیا طبقہ وجود میں آ گیا ہے۔

اسی طرح صوبہ سندھ میں یو پی، حیدر آباد اور دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے مہاجروں نے کلیموں پر وسیع قطعہ اراضیات حاصل کیے ہوئے ہیں ان کلیمنٹوں کی اکثریت غیر حاضر زمینداروں کی ہے جو شہروں میں آباد ہیں ان کی اراضیات پر قیام پاکستان سے پہلے غیر مسلم وڈیروں کے تحت ہاری زمینیں کاشت کرتے تھے اور اب بھی وہی ہاری خاندان ان زمینوں کو کاشت کرتے ہیں ان ہاری خاندانوں کا خیال تھا کہ قیام پاکستان کے بعد اور غیر مسلم وڈیروں کے ترک وطن کے بعد ان کے قبضے کی زمینیں انہیں مل جائیں گی لیکن غیر مسلم وڈیروں کی جگہ اب کلیمنٹ وڈیرے آ گئے ہیں جس کے نتیجے میں ان زمینوں کے ہاری خاندان یہ محسوس کرتے ہیں کہ کلیمنٹوں کو اراضی کا مالک بنانے سے ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے جب سکھر کے مقام سے نہریں تعمیر کی گئیں تو اس وقت انگریزوں نے کچھ زمینیں غیر سندھیوں کو دی تھیں اور اب نئی زمینیں زیر کاشت آنے کے بعد بہت سے غیر سندھی خاندان سندھ میں جا کر بطور مزراعے ان زمینوں پر کاشتکار بن گئے ہیں۔

اس صورتِ حال نے سندھی وڈیروں اور مفاد پرست عناصر کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ سندھی اور غیر سندھی کی تفریق کو ہوا دے کر ہاریوں کی تحریک کو جو وڈیرہ شاہی کے ظلم اور جاگیرداری کے خلاف متحد ہو کر جدوجہد کا راستہ اختیار کر رہی تھی تفریق پیدا کریں اور انہیں آپس میں لڑائیں یہ صورتِ حال خود کسان تحریک کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہاریوں کو منظم ہونے کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

یہاں کا بنیادی مسئلہ جاگیرداری زرعی نظام کو توڑنے اور ۵۰ ۔ ایکڑ فی خاندان سے زائد تمام اراضی کو قومی ملکیت میں لے کر بلا معاوضہ ہاریوں چھوٹے مالک کسانوں کھیت مزدوروں میں ازسرِ نو گذارہ یونٹ کی بنیاد پر تقسیم کرنے اور زراعت کو کوآپریٹو کی بنیاد پر منظم کرنے کا ہے اور ہاریوں کے فوری مطالبات بیدخلیوں کو روکنے اور ان کو بیگاروں، نذرانوں سے نجات دلانے، کھاد سستے داموں فراہم کرنے کا ہے۔

سندھ کے ہاریوں کھیت مزدوروں دستکاروں اور جو مالک نہیں ہیں انہیں اپنے رہائشی احاطہ جات کی ملکیت دلانا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل ہاریوں کی سماجی حیثیت رعیتی غلاموں سے کسی طرح بہتر نہ تھی وڈیروں

کے مظالم کے خلاف ہاری تحریک کمیٹی کے نام سے قائم ہوئی لیکن وڈیرہ شاہی کی مضبوط گرفت کے پیش نظر وہ ہاریوں کی منظم تحریک کی صورت اختیار نہ کرسکی۔ قیام پاکستان کے بعد ہاری کمیٹی کے نام سے حیدر بخش جتوئی عبدالقادر اور دوسرے ترقی پسند عناصر نے کام کیا جس سے سندھ کے بعض علاقوں میں ہاریوں میں بیداری پیدا ہوئی ۱۹۶۳ء میں خانیوال کسان کنونشن میں اس صوبے کے ہاری لیڈر بھی شامل ہوئے اور پاکستان کسان کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ کسان کارکنوں کی کوشش کے باوجود یہاں ہاریوں کی تحریک آگے نہ بڑھ سکی اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پرانے ہاری لیڈر اور کارکن خاموش ہیں لیکن بعض علاقوں میں نوجوان ہاری کارکن تحریک کو منظم کرنے میں مصروف ہیں۔

سندھ کے ہاری کارکنوں سوشلسٹ ورکروں اور ترقی پسند عناصر کو اکٹھا کر کے ہاری تحریک کی تنظیم کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں بھی بنیادی سوال جاگیرداری زرعی نظام سے ہاریوں چھوٹے مالکوں کھیت مزدوروں کو نجات دلانے کا ہے اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہاں کے تمام ہاری ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شعوری اور منظم جدوجہد نہ کریں۔

# زرعی مسائل

برصغیر کے عوام نے طویل جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی اس جنگ آزادی کا مقصد برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کے پیدا کردہ جاگیردار و زمینداری نظام کو ختم کر کے معاشی آزادی حاصل کرنا تھا تاکہ ملک کی اکثریت کو افلاس جہالت اور تہذیبی پس ماندگی سے نجات دلائی جاسکے۔ پاکستان کو آزاد ہوئے ستائیس سال گزر چکے ہیں مگر ابھی تک جاگیرداری و زمینداری نظام ختم نہیں ہوسکا کیونکہ انگریز سامراج نے اپنے دور اقتدار میں جو زمینداروں وڈیروں اور سرداروں کا طبقہ پیدا کیا تھا آزادی کے وقت اقتدار اسی کے ہاتھ منتقل ہوا۔ جب سے یہی طبقہ جاگیردارانہ نظام کو اب تک قائم رکھے ہوئے ہے۔

اگرچہ ملک میں تین بار زرعی اصلاحات ہوچکی ہیں مگر جاگیردارانہ نظام جوں کا توں قائم ہے جس کے طفیل ہمارے کاشتکار اور کسان چھوٹے مالک اور کھیت مزدور جو ملک کی آبادی کا اسی ۸۰۔فیصد ہیں تعلیم اور طبی امداد جیسی بنیادی ضروریات سے محروم، جدید طریقہ کاشت سے ناآشنا ہیں افلاس اور غربت میں مبتلا ہیں۔ دیہات کی آبادی توہمات اور گروہ بندیوں مذہبی و نسلی تعصبات میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب بھی ملک اناج کی قحط سے دوچار ہے اور ہم دس سے پندرہ ٹن غلہ باہر سے منگوانے پر مجبور ہیں۔ زمین کا بڑا حصہ ان زمینداروں اور وڈیروں کے قبضے میں اب بھی ہے اور کروڑوں انسان زمین سے محروم ہیں جو مزارعوں کھیت مزدوروں اور دستکاروں کی حیثیت سے زندگی بسر کررہے ہیں دیہات کے محنت کش عوام اس جاگیرداری نظام کے خلاف متواتر جدوجہد کرتے چلے آئے ہیں اور اس جدوجہد کی پاداش میں انہیں حکومت کے ظلم و جبر کا نشانہ اکثر بننا پڑا ہے۔ جیلوں اور جھوٹے مقدمات کی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں مگر ان کی جدوجہد جاری ہے جس کے نتیجے میں حکومت تین بار مجبور ہوئی کہ زرعی اصلاحات نافذ کرے۔ پہلی بار دولتانہ وزارت نے پنجاب میں ۱۹۵۲ء میں زرعی اصلاحات نافذ کیں یہ

زرعی اصلاحات مزارعوں کے حصے اور حقوق کاشت وغیرہ کے تعین تک ہی محدود تھیں اس میں زمینداروں کی حد ملکیت کا تعین شامل نہیں کیا گیا تھا یہ اصلاحات کسان کمیٹی کی زبردست جدوجہد کے نتیجے میں عمل میں آئی تھیں ان زرعی اصلاحات میں مندرجہ ذیل اقدامات کیے گئے۔

## دولتانہ زرعی اصلاحات

۱۔ جاگیریں منسوخ کی گئیں ان جاگیروں کے ختم ہونے سے سرکاری خزانے میں ۱۲۔لاکھ روپے کی بچت ہوئی جو سرکار خزانے سے سالانہ نقد جاگیرداروں کو ادا کرتی تھی۔

۲۔ وہ موروثی مزارعین جو مالکوں کو مالیہ کے مساوی یا اس سے کم بطور لگان ادائیگی کرتے تھے ان کو بلا معاوضہ مالک قرار دیدیا گیا ایسے مزارعین کے پاس ساڑھے تین لاکھ ایکڑ اراضی تھی۔

۳۔ وہ موروثی مزارعین جو پیداوار کا مقررہ حصہ بطور لگان ادا کرتے تھے انہیں زمین کے صرف اس قدر حصے کا مالک قرار دیا گیا جس قدر وہ پیداوار کا حصہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ ایسے مزارعین کے پاس سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ تھا۔

۴۔ وہ موروثی مزارعین جو کچھ نقد اور کچھ پیدوار کا حصہ بطور لگان ادا کرتے تھے وہ مالیہ کا بیس گنا معاوضہ مالکوں کو ادا کر کے مالک قرار دیے گئے ایسے مزارعین کے پاس تین لاکھ چالیس ہزار ایکڑ رقبہ تھا۔

۵۔ جاگیرداری ٹیکسوں بیگار اور نذرانے وغیرہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

۶۔ آبیانہ اور دوسرے سرکاری واجبات میں نصف اور پیداوار میں مزارعوں کا ساٹھ فیصد اور مالکوں کا چالیس فیصد حصے کی حد مقرر کر دی گئی۔

۷۔ پنجاب ٹیننسی ایکٹ کے ذریعے زمیندار کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ وہ ذیل کی تین باتوں میں سے کوئی ایک عدالت میں ثابت کیے بغیر مزارعہ کو بیدخل نہیں کر سکتا۔

الف۔ بٹائی پر حاصل کردہ اراضی اس مقصد کے لیے استعمال نہ کرے اور نا قابل کاشت بنا دے۔

ب۔ بٹائی پر دی ہوئی زمین کو علاقائی رواج کے مطابق کاشت نہ کرے۔یا

ج۔ مزارعہ زمین کے ملک کا حصہ ادا نہ کرے۔

## ایوبی زرعی اصلاحات

دوسری زرعی اصلاحات مارشل لاء کے دورِ حکومت میں ۱۹۵۹ء میں ریگولیشن نمبر ۶۴ کے ذریعے نافذ کی گئیں ان زرعی اصلاحات میں پہلی دفعہ حد ملکیت کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا جس کے لیے کسان کمیٹی متواتر جدوجہد کرتی آئی تھی ان زرعی اصلاحات کے تحت یہ اقدامات کیے گئے۔

۱۔ حد ملکیت ۵۰۰۔ ایکڑ نہری یا ۱۰۰۰۔ ایکڑ بارانی یا ۳۶۰۰۰۔ یونٹ جو بھی زیادہ ہو مقرر کی گئی۔

۲۔ ۱۸۰۰۰۔ یونٹ اپنے عزیز و اقارب کو دینے کی اجازت دی گئی۔

۳۔ ۱۵۰۔ ایکڑ نہری باغوں، چراگاہوں کے نام پر رکھنے کی اجازت دیدی گئی۔

۴۔ گھوڑی پال، گائے پال، شکار گاہوں کا رقبہ حکومت کی مرضی سے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

ان زرعی اصلاحات کے تحت ۷۲۳۔ بڑے زمینداروں سے صرف ۱۹۰۷۸۳۔ ایکڑ اراضی حاصل ہوئی جس میں سے ۱۱۴۷۸۰۷۔ ایکڑ اراضی بنجر اور غیر آباد تھی۔ ۸۴۶۵۴/۱ ایکڑ دریا بُرد ۵۹۳۳۷۔ ایکڑ پتھریلی اور باقی ماندہ سیم و تھور کی وجہ سے نا قابلِ کاشت تھی۔ ان میں سے صرف ۵۰۵۴۹۰۔ ایکڑ زیر کاشت تھی۔ اس رقبہ کی قیمت آٹھ روپے بیس پیسے فی یونٹ مقرر کی گئی تھی جس کا معاوضہ ۵۹۵۷۲۸۸۔ روپے مقرر کیا گیا تھا اور سود اس کے علاوہ تھا۔

ان زرعی اصلاحات میں زمینداروں نے جو رقبہ چھوڑا وہ اس قدر ناقص تھا کہ مارکیٹ میں اس کی قیمت -/۸ روپے فی یونٹ سے بھی کم تھی۔ اس وجہ سے زرعی اصلاحات سے حاصل کردہ رقبے میں سے ۴۵۱۲۲۶۔ ایکڑ فروخت ہی نہ ہو سکا۔ حکومت نے اس کی قیمت پہلے -/۲۰ روپے یونٹ مقرر کی تھی بعد میں کم کر دی گئی مگر اس کے باوجود رقبہ فروخت نہ ہو سکا۔

جن مزارعین کو ان زرعی اصلاحات کے تحت زمین دی گئی تھی ان میں سے جو مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے اقساط پابندی سے ادا نہ کر سکتے تھے بیدخل کر دیے گئے۔ ایسے مزارعین کی تعداد ۷۵۹۳۔ ہے ان سے جو رقبہ واپس لیا گیا تھا اس کی تعداد ۹۸۷۲۴۔ ایکڑ ہے ان زرعی اصلاحات میں مزارعین کی بے دخلی کے متعلق جو قوانین صوبوں میں پہلے سے رائج تھے وہ برقرار رکھے گئے۔

ان زرعی اصلاحات کے تحت مالکان کو جو رقبے رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اس کے علاوہ لینڈ کمیشن نے ۶۶ بڑے زمینداروں کو ۲۳۱۱۵۵۔ ایکڑ رقبہ حد ملکیت سے زائد اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دیدی۔ نیز لینڈ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں حیدر آباد، خیر پور اور کراچی ڈویژنوں میں

گذارہ یونٹ ۱۲۔ ایکڑ نہری اور باقی حصوں میں ساڑھے بارہ ایکڑ نہری قرار دیا۔

ان زرعی اصلاحات سے ہماری زرعی معیشت میں کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ بڑے زمیندار اور وڈیرے اپنے رقبہ جات مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے پاس رکھنے میں قادر تھے۔ ان زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کی ذمے داری صرف نوکرشاہی کی تھی۔ ملک میں طبقاتی تنظیموں اور بالخصوص کسان کمیٹی کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی مارشل لاء کے تحت ممانعت تھی ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جاگیرداروں نے گمنام انتقالات پرانی تاریخوں میں کرا لیے اس طرح بیشتر رقبے زرعی اصلاحات کی زد سے محفوظ کر لیے مگر ان سب کے باوجود ان اصلاحات سے ملکیت کے تقدس کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جاگیردار طبقہ کی اقتدار پر گرفت کمزور ہوئی اور سرمایہ دار طبقہ اقتدار پر غالب آ گیا اور جاگیردار طبقہ اقتدار میں سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ ذیلی اتحادی کی حیثیت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

چونکہ ان زرعی اصلاحات سے یہ تاثر ختم ہو گیا کہ جاگیرداری ابدی شے ہے اور اسے ختم نہیں کیا جا سکتا اس لیے زمینداروں اور وڈیروں نے اپنے رقبے اپنے خاندان کے افراد کے نام منتقل کرانے شروع کر دیے اور ان کا یہ عمل تیز ہو گیا ملک میں سیاسی عمل کے شروع ہوتے ہی جاگیرداری زرعی نظام کے خلاف جدوجہد شروع ہو گئی اور اس کے نتیجے میں کسانوں مزدوروں دانشوروں حتیٰ کہ ملک، کے سب ہی طبقوں کو احساس ہو گیا کہ ملک سے اس فرسودہ زرعی نظام کو ختم کیے بغیر ترقی اور خوشحالی کے خواب پورے نہیں ہو سکتے۔ اور یہ نظام ہماری ترقی کا سب سے بڑا دشمن ہے چنانچہ کسان کمیٹی کی مسلسل جدوجہد اور ترقی پسند کارکنوں کی کوششوں سے جب ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس منعقد ہوئی تو پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ ملک کے تمام حصوں سے محنت کش عوام نے بھرپور حصہ لیا جس سے ملک کا کوئی طبقہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بورژوا پارٹیوں اور بالخصوص جماعت اسلامی جیسی رجعتی پارٹی کو بھی انتخابات میں عوام کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے منشور اور پروگرام میں زمین کی حد ملکیت کا تعین کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

زرعی انقلاب کا یہ احساس ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی بنیاد بنا اور پیپلز پارٹی جیسی بورژوا جماعت نے جاگیرداری کے خاتمے، گذراہ یونٹ تک کے مالکوں کو مالیہ کی معافی۔ سوشلزم آوے ہی آوے۔ جیہڑا واہوئے اوراوہوای کھاوے کے بڑھ چڑھ کر نعرے دیے اور اس طرح عوام سے ووٹ لینے میں کامیاب ہو گئی۔

## بھٹوزرعی اصلاحات

اقتدار میں آنے کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت نے یکم مارچ ۱۹۷۲ء کوزرعی اصلاحات کا اعلان کیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ حدملکیت ۱۲۰۰۰۔یونٹ یا ۱۵۰ / ۱ ایکڑ نہری فی کس، ٹریکٹر یا ٹیوب ویل رکھنے کی صورت میں مزید ۲۰۰۰۔یونٹ رکھنے کی اجازت ہوگی اور اس طرح ۱۴۰۰۰۔یونٹ فی کس رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ اگر کسی وجہ سے زمیندار اپنی زمین کسی وارث کو نہیں دے سکا تو وہ اب بھی حکومت کی اجازت سے دے سکتا ہے۔

۳۔ بڑے افسروں کو انعام میں دی گئی زمین میں سے ۱۰۰ / ۱ ایکڑ اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی گئی۔

۴۔ فوجی افسروں کو دی گئی اراضیات ان اصلاحات سے مستثنےٰ اقرار دی گئیں۔

۵۔ سرکاری اراضی کی نیلامی بند کر کے مزارعوں اور چھوٹے مالکوں کو قیمتاً دینے کا اعلان کیا گیا۔

۶۔ بیج، مالیہ، آبیانہ بذمہ مالک بقیہ اخراجات نصف نصف اور مالک و مزارعہ کا حصہ پیداوار میں نصف نصف قرار دیا گیا۔

۷۔ پنجاب ٹیننسی ایکٹ جو مزارعین کی بے دخلی سے متعلق ہے دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کر دیا گیا۔

۸۔ ایک ترمیم کے ذریعے حکومت نے یہ حق حاصل کر لیا کہ جن زمینداروں کے ساتھ زرعی اصلاحات میں بے انصافی ہوئی ہو اس کی وہ تلافی کر سکتی ہے۔

۹۔ مزارعہ زمیندار کے خلاف ناجائز رقبہ رکھنے کے خلاف شکایت کر سکے گا جو درست ثابت ہونے پر ۵۰۰۔روپے انعام کا حقدار ہوگا اور بصورتِ دیگر ۱۰۰۔روپے جرمانہ یا پندرہ دن قید کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

## بھٹو اصلاحات پر سرسری نظر

الف۔ ان زرعی اصلاحات میں پہلی دفعہ جاگیرداری کو بلا معاوضہ ختم کرنے کا اصول تسلیم کر لیا گیا جس کے لیے ابتدا سے کسان کمیٹی کی جدوجہد جاری تھی ان اصلاحات میں حدملکیت

بجائے خاندان کے فی کس کی بنیاد پر مقرر کی گئی ہے جس سے جاگیرداروں کو تمام زمین اپنے پاس رکھنے کا موقعہ فراہم کیا ہے جو پہلے ہی اپنے کنبے کے افراد کے نام اراضی منتقل کرا چکے تھے۔

ب۔ ایسے زمینداروں کو جن کے رقبے ان اصلاحات سے متاثر ہو سکتے تھے بعد میں حکومت کی اجازت سے انتقالات کا موقعہ دے کر انہیں اپنے رقبے محفوظ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

ج۔ ۱۵۰۔ایکڑ نہری ۱۲۰۰۰/یونٹ فی کس مقرر کر کے عملاً ۱۵۰۔ایکڑ سے زائد کا تعین کیا گیا ہے جو گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے۔ٹریکٹر یا ٹیوب ویل رکھنے کی صورت میں ۲۰۰۰۔یونٹ کی اجازت دے کر عملاً حد ملکیت ۱۴۰۰۰۔یونٹ مقرر کر دی گئی ہے کیونکہ ایسا کوئی زمیندار نہیں جس کے پاس ٹریکٹر یا ٹیوب ویل نہ ہو۔

ذیل میں ایک گوشوارہ اوسط پروڈیوس انڈیکس یونٹ مختلف اضلاع اقسام آبپاش وغیر آبپاش کی تفصیل کے ساتھ دیا جاتا ہے اور جس میں ۱۴۰۰۰۔یونٹ رکھنے کی صورت میں ہر ضلع میں آبپاش وغیرہ آبپاش اراضی رکھنے کا جو حق حکومت نے دیا ہے وہ بھی دکھایا گیا ہے۔

**گوشوارہ حد ملکیت بروئے پروڈیوس انڈیکس یونٹ**

| | آبپاش (چاہی ونہری) سندھ میں توڑ نہری (فلو) | | | | غیر آبپاش (سندھ میں لفٹ یعنی جھلاری نہری) | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| نام ضلع | آبپاش رقبے کے اوسط یونٹ | بارہ ہزار یونٹوں کا رقبہ ایکڑوں میں | دو ہزار یونٹ کا رقبہ ایکڑوں میں | چودہ ہزار یونٹ کا رقبہ ایکڑوں میں | غیر آبپاش رقبہ کے اوسط یونٹ | بارہ ہزار یونٹوں کا رقبہ ایکڑوں میں | دو ہزار یونٹوں کا رقبہ ایکڑوں میں | چودہ ہزار یونٹوں کا رقبہ ایکڑوں میں |
| سرگودھا | ۵۸ | ۲۰۷ | ۳۵ | ۲۴۲ | ۲۶ | ۴۶۲ | ۷۷ | ۵۳۹ |
| ساہی وال | ۵۷ | ۲۱۲ | ۳۵ | ۲۴۷ | ۲۲ | ۵۴۵ | ۹۱ | ۶۳۶ |
| لائل پور | ۶۲ | ۱۷۷ | ۳۱ | ۲۰۸ | ۲۶ | ۴۲۶ | ۷۷ | ۵۳۹ |
| جھنگ | ۵۵ | ۲۱۸ | ۳۶ | ۲۵۴ | ۳۰ | ۴۰۰ | ۶۶ | ۴۶۶ |
| ملتان | ۵۰ | ۲۴۰ | ۴۰ | ۲۸۰ | ۲۰ | ۶۰۰ | ۱۰۰ | ۷۰۰ |

| | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| مظفر گڑھ | ۳۱ | ۳۸۷ | ۶۶ | ۴۵۳ | ۱۳ | ۹۲۳ | ۱۵۴ | ۱۰۷۷ |
| بہاول پور | ۵۰ | ۲۴۰ | ۴۰ | ۲۸۰ | ۱۷ | ۷۰۶ | ۱۱۸ | ۸۲۴ |
| راولپنڈی | ۸۳ | ۱۴۴ | ۲۴ | ۱۶۸ | ۲۰ | ۶۰۰ | ۱۰۰ | ۷۰۰ |
| اٹک | ۷۳ | ۱۶۴ | ۲۸ | ۱۹۲ | ۳۱ | ۳۸۷ | ۶۶ | ۴۵۳ |
| میانوالی | ۳۱ | ۳۸۷ | ۶۶ | ۴۵۳ | ۱۸ | ۶۶۸ | ۱۱۱ | ۷۷۸ |
| لاہور | ۸۴ | ۱۴۳ | ۲۴ | ۱۶۷ | ۲۱ | ۵۷۶ | ۹۵ | ۶۷۱ |
| مردان | ۷۳ | ۱۶۴ | ۲۸ | ۱۹۶ | ۲۴ | ۵۰۰ | ۸۳ | ۵۸۳ |
| بنوں | ۴۶ | ۲۶۱ | ۴۴ | ۳۰۵ | ۱۸ | ۶۶۷ | ۱۱۱ | ۷۷۸ |
| پشاور | ۸۱ | ۱۴۸ | ۲۵ | ۱۷۳ | ۳۲ | ۳۷۵ | ۲۳ | ۴۳۸ |
| ہزارہ | ۷۷ | ۱۵۶ | ۲۴ | ۱۸۰ | ۲۰ | ۶۰۰ | ۱۰۰ | ۷۰۰ |
| کوئٹہ پشین لورالائی سبی | ۵۱ | ۲۳۵ | ۳۹ | ۲۷۴ | ۱۶ | ۷۵۰ | ۱۲۵ | ۸۷۵ |
| لاڑکانہ | ۳۲ | ۳۷۵ | ۶۳ | ۴۳۸ | ۲۱ | ۵۷۶ | ۹۵ | ۶۷۱ |
| نواب شاہ | ۲۵ | ۴۸۰ | ۸۰ | ۵۶۰ | ۱۷ | ۷۰۶ | ۱۱۸ | ۸۲۴ |
| ٹھٹھہ | ۲۲ | ۵۴۵ | ۹۱ | ۶۳۶ | ۱۷ | ۷۰۶ | ۱۱۸ | ۸۲۴ |
| سکھر | ۳۰ | ۴۰۰ | ۶۶ | ۴۶۶ | ۲۰ | ۶۰۰ | ۱۰۰ | ۷۰۰ |

اس گوشوارے کے مشاہدے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں کوئی ضلع ایسا نہیں ہے جس کے زمینداروں کو ۱۴۰۰۰۔ یونٹ اراضی رکھنے کا حق دیا جائے اور اسے ۱۵۰/ ایکڑ نہری یا ۳۰۰۔ ایکڑ بارانی رقبہ میسر آئے چونکہ سندھ کے وڈیرے ۱۴۰۰۰۔ یونٹ کے مقابلے میں ۴۴۶۔ ایکڑ نہری سے لے کر ۶۳۶۔ ایکڑ نہری تک رکھ سکتے ہیں اور لفٹ نہری ۶۷۱۔ ایکڑ سے لے کر ۸۷۵۔ ایکڑ فی کس رکھ سکتے ہیں اس طرح پنجاب میں ۱۶۷/ ایکڑ نہری سے لے کر ۴۳۵۔ ایکڑ نہری فی کس اور بارانی ۴۵۳۔ ایکڑ سے لے کر ۱۰۷۷۔ ایکڑ فی کس رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سرحد میں ۱۷۳۔ ایکڑ آبپاش سے لے کر ۳۰۵۔ ایکڑ آبپاش فی کس اور بارانی ۴۳۸۔

ایکڑ سے لے کر ۸۷۷/ ایکڑ فی کس رکھ سکتے ہیں۔ بلوچستان میں ۲۷۴/ ایکڑ آبپاش اور بارانی ۸۷۵/ ایکڑ فی کس رکھ سکتے ہیں۔

د۔ ان اصلاحات کی رُو سے سرکاری زمین قیمتاً تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جبکہ سرکاری اراضی کو قیمتاً دینے کا کوئی جواز نہیں اور نہ مزارعین خرید سکتے ہیں۔

ر۔ اگرچہ ان اصلاحات کی رُو سے مالیہ، آبیانہ اور بیج مالک کے ذمے قرار دیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ مزارعہ کا پیداوار میں نصف حصہ مقرر کر دیا گیا ہے جبکہ پنجاب میں وہ ۱۹۵۲ء کی اصلاحات کی رُو سے ۶۰ فیصد حصے کا حقدار چلا آ رہا تھا۔ آبیانہ، مالیہ اور بیج کی مراعات کا اعلان تو کر دیا گیا ہے مگر اس پر عملدرآمد عملاً نہیں ہو رہا اور اس کی وجہ سے مالک مزارعوں کو بے دخلی بھی کر رہے ہیں۔

ز۔ حکومت نے مالکان کے ساتھ بے انصافی کی تلافی کا جو حق حاصل کیا ہے اس سے حکومت کا مقصد مخالف زمینداروں کو سیاسی رشوت دینا اور حکومت کی پارٹی کے ساتھ شامل زمینداروں کی ان اصلاحات میں آنے والی اراضی کو مستثنیٰ قرار دینا بھی ہے۔

س۔ سندھ میں بیشتر ہاری مقاطعہ پر زمین کاشت کرتے ہیں اور مقاطعہ ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ کسی مقاطعہ دار کو حق مزارعت حاصل نہیں اور نہ ہی یہ حق مقاطعہ دار کے ذیلی کاشتکار ہاری کو حاصل ہے۔ پنجاب میں مقاطعہ داری، ٹھیکہ داری یا مستاجری کے نام سے رائج ہے ان اصلاحات میں مقاطعہ داروں یا ٹھیکیداروں اور مالکان کے مابین کسی قسم کے حقوق کا تعین نہیں کیا گیا اور وہ مزارعہ نہیں ہے اور اس کے ذیلی کاشتکار مزارعہ کی حیثیت بطور مزارعہ تسلیم نہیں کی گئی اس طرح ایسے رقبوں پر یہ دونوں وڈیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

ش۔ ان اصلاحات میں کمپنیوں اور غیر ملکی پٹہ داروں کو دی گئی اراضی کا کوئی ذکر نہیں وسیع سرکاری اراضیات ان کمپنیوں اور افراد کے نام پٹہ پر چلی آ رہی ہیں۔

ص۔ ان اصلاحات میں تشخیص مالیہ کا ذکر نہیں اور اسے جوں کا توں قائم رکھا گیا ہے آمدنی مالیہ کی تشخیص کی بنیاد قرار نہیں دی گئی اور نہ ہی گذارہ یونٹ تک کے مالکان کو مالیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

ض۔ ان اصلاحات میں دیہات کی انتہائی پس ماندہ اور کثیر آبادی کھیت مزدوروں دست کاروں

کا کوئی ذکر نہیں اور ان کو نہ روزگار کی ضمانت اور نہ ان کے حقوق کا تعین اور نہ ہی ان کے اوقات کار مقرر کیے گئے ہیں۔

## حکومت کے اعلانات کی روشنی میں بھٹو زرعی اصلاحات

پورے ملک میں ان زرعی اصلاحات کے تحت اب تک ۲۳۲۳۔ مالکان ایسے ہیں جو ان . اصلاحات سے متاثر ہوئے ہیں اور ان سے کل ۸۸۰۷۵۷/۱ ایکڑ رقبہ حاصل ہوا ہے جو کل ملکیتی رقبے کا ۱۰۳۔ فیصد ہے اس رقبہ میں سے ۴۲۲۲۷۲۔ ایکڑ رقبہ ۵۰۵۸۴۔ مزارعوں میں تقسیم ہوا ہے اور بقیہ رقبہ ۴۵۸۴۸۵/۱ ایکڑ ہے جو بیشتر نا قابل کاشت ہے۔

پنجاب میں کل ۲۵۰۱۲۶۔ ایکڑ رقبہ حاصل ہوا ہے جس میں سے ۱۶۰۹۳۹۔ ایکڑ ۳۰۶۰۸ مزارعوں کو تقسیم کیا گیا اور بقایا ۹۱۸۷ا۔ ایکڑ غیر آباد اور نا قابل کاشت ہے۔ سندھ میں کل ۲۵۱۲۳۸۔ ایکڑ رقبہ حاصل ہوا اور اس میں سے ۱۰۹۹۳۷۔ ایکڑ ۸۵۱۹۔ مزارعین میں تقسیم ہوا بقایا رقبہ ۱۴۱۳۰۱۔ ایکڑ نا قابل کاشت ہے۔ صوبہ سرحد میں کل رقبہ ۱۳۴۱۴۵۔ ایکڑ حاصل ہوا جس میں سے ۱۲۵۰۵۱۔ ایکڑ ۹۴۲۹۔ مزارعین میں تقسیم ہوا بقایا رقبہ ۹۰۹۴۔ ایکڑ غیر آباد ہے جو محکمہ جنگلات کے سپرد کیا گیا۔ بلوچستان میں کل رقبہ ۲۲۵۲۴۸۔ ایکڑ حاصل ہوا جس میں سے ۲۶۳۴۵۔ ایکڑ ۱۹۶۸۔ مزارعین میں تقسیم ہوا اور بقایا رقبہ ۲۱۸۹۰۳۔ ایکڑ غیر تقسیم ہے جو غیر آباد ہے۔

شکارگاہوں اور پٹ فیڈر کینال سے حاصل کردہ رقبہ کا تین سال سے پروپیگنڈا تو کیا جارہا ہے اور شکارگاہوں سے حاصل کردہ ۱۵۴۰۸۴/۱ ایکڑ اور پٹ فیڈر کینال سے ۶۰۰۰۰۰۔ ایکڑ رقبہ ابھی تک تقسیم نہیں ہوا۔ پٹ فیڈر کا رقبہ تو سرکاری اراضی ہے جس کو زرعی اصلاحات کا فرضی کارنامہ قرار دے کر عوام کو دھوکہ دیا جارہا ہے۔ ایوب دور کی زرعی اصلاحات میں حد ملکیت اور دیگر مراعات کے علاوہ سلطان احمد چانڈیو کو ۱۲۳۳۸۱۔ ایکڑ رقبہ زائد رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، موجودہ اصلاحات کے تحت سلطان احمد سے صرف ۵۶۰۰۰۔ ایکڑ رقبہ حاصل کیا گیا ہے اور اس طرح اس کے پاس ایوبی اصلاحات پنجاب کے جاگیرداروں کے پاس ایوبی اصلاحات کی حد ملکیت سے زائد لاکھوں ایکڑ رقبہ اب بھی موجود ہے۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ کے بیان کے مطابق پنجاب میں ۵ لاکھ ایکڑ رقبہ ایسا ہے جو ایوبی اصلاحات کے وقت سے بڑے زمینداروں کے قبضے

میں چلا آرہا ہے۔

ان زرعی اصلاحات کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میر جعفر خاں آف خیر پور نے اپنے کل ملکیتی رقبہ ۴۰۴۵۴/ ایکڑ کا اعلان نامہ لینڈ کمیشن کو پیش کیا تھا لیکن لینڈ کمیشن نے اسے ۳۰۸۲۳۵/ ایکڑ رقبہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیدی اور بقیہ ۱۳۲۳۶۱/ رقبہ میں سے صرف چھ ہزار ایکڑ رقبہ تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس حاصل کردہ رقبہ میں سے اب بھی ۹۰۳۵۹/ ایکڑ اسی کے پاس بدستور موجود ہے۔ اسی طرح جمالدار خاں وزیر مملکت کے پاس صرف تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ۲۰ مربع اراضی ہے جس میں سے اصلاحات کے تحت ایک مرلہ بھی حاصل نہیں کیا گیا۔ ایسی بے شمار مثالیں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں موجود ہیں۔

ان زرعی اصلاحات کے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ملک میں جاگیرداری نظام اپنی سابقہ حیثیت میں اب بھی بدستور قائم ہے زمین کا بیشتر حصہ بڑے جاگیرداروں، وڈیروں اور خوانین کے قبضہ میں بدستور موجود ہے۔ دوسری طرف مزارعوں، کھیت مزدوروں کی کثیر آبادی اب بھی بے زمین ہے اور جوان جاگیرداروں کے ظلم و جبر کا بدستور شکار ہے۔

## آبیانہ

پاکستان کی تقریباً ۷۰ فیصد اراضی کی آبپاشی کا ذریعہ نہری پانی ہے، ملک میں جزوی طور پر زیر زمین آبی وسائل ٹیوب ویل اور کنوؤں سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ نہری علاقے پاکستان کے زرخیز ترین اور گنجان آباد علاقے ہیں اس لیے ہماری زرعی معیشت میں نہری نظام بڑی اہمیت رکھتا ہے جن علاقوں میں زیر زمین پانی پینے اور کاشت کے قابل نہیں۔ وہاں نہری پانی کی حیثیت آبِ حیات سے کم نہیں ہے مگر اس پانی کی تقسیم کے طریقہ کار میں بڑی بدنظمی ہے۔ ضرورت کے مقابلے میں پانی کی کمی اور گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ابتداء میں جب نہریں بنی تھیں اس وقت ایک کیوسک پانی ۳۵۴/ ایکڑ یا ۲۴۶ کیوسک پانی ایک ہزار ایکڑ کے لیے مقرر کیا گیا تھا لیکن گذشتہ سالوں میں ان علاقوں میں زیر کاشت رقبہ میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس عرصے میں نہروں کے پانی کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور نہ ہی کسی نہر یا راجباہ کو چوڑا کیا گیا ہے۔

محکمہ نہار کسی موگہ یا راجباہ میں مقررہ مقدار پانی مسلسل مہیا کرنے کی ذمے داری نہیں لیتا اور وہ اپنی اس ذمے داری سے اپنے کو بری الذمہ سمجھتا ہے۔ موگوں اور راجباہوں پر پانی کی مہیا کردہ مقدار کی درست پیمائش کے لیے کوئی پیمانہ یا میٹر بھی نصب نہیں ہے جس سے پانی کی سپلائی کا درست اندازہ ہو سکے۔ پانی کی تقسیم کی بدنظمیوں کی وجہ سے اکثر کسانوں کے باہمی قتل ہوتے ہیں اور کسانوں کی لڑائی و جھگڑوں کے باعث عملہ نہر کی ناجائز آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور کسانوں کی تنظیم میں رکاوٹ کا باعث ہے اور اس سے پیداوار کی کمی کی صورت میں نتیجہ ظاہر ہوتا ہے ایک طرف کاشتکاروں کو ضرورت کے مطابق پانی نہیں ملتا تو دوسری طرف آبیانہ میں مسلسل اضافہ کیا جا تا رہا ہے ۱۹۴۹ء سے اب تک آبیانہ کی شرح میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے جو ذیل کے گوشوارہ سے ظاہر ہے۔

## آبیانہ فی ایکڑ

| جنس | ۱۹۴۸ | ۱۹۴۹ | ۱۹۵۵ | ۱۹۵۹ | ۱۹۶۵ | ۱۹۶۸ | ۱۹۶۹ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| نیشکر | ۷ء۷۵ | ۱۱ء۰۰ | ۱۲ء۰۰ | ۲۰ء۰۰ | ۲۴ء۰۰ | ۲۸ء۸۰ | ۳۲ء۱۶ |
| کپاس | ۳ء۵۶ | ۵ء۲۵ | ۶ء۲۵ | ۹ء۵۰ | ۱۱ء۲۰ | ۱۳ء۶۰ | ۱۵ء۶۴ |
| گندم | ۲ء۸۹ | ۴ء۲۵ | ۵ء۲۵ | ۶ء۰۰ | ۷ء۲۰ | ۸ء۸۰ | ۹ء۱۲ |
| چارہ | ۱ء۷۹ | ۲ء۵۰ | ۲ء۵۰ | ۳ء۵۰ | ۴ء۸۰ | ۵ء۶۰ | ۶ء۶۴ |
| ترقیاتی ٹیکس فی روپیہ | --- | --- | ۰ء۱۳ | ۰ء۲۵ | ۰ء۳۵ | ۰ء۳۵ | ۰ء۳۵ |

اس گوشوارے سے ظاہر ہے کہ صرف آبیانہ ہی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ ترقیاتی ٹیکس جو ۱۹۵۵ء میں ۱۳ء پیسے فی روپیہ تھا وہ ۱۹۶۵ء میں ۳۵ء پیسے فی روپیہ ہو گیا۔ اسی طرح لوکل ریٹ ۴۹۔۱۹۵۸ء میں ۱۲½ ۔روپے فی سینکڑہ تھا اب ۵۵ روپے فی سینکڑہ ہو گیا اس طرح جہاں آبیانہ ترقیات ٹیکس اور لوکل ریٹ میں اضافہ ہوا ہے وہاں نہری پانی میں کمی واقع ہوئی ہے اور اس کے حصول میں مشکلات پیدا ہوتی جاتی ہیں اس سال صورتِ حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی ہے کیونکہ نہری پانی کی سپلائی ۳۰ سے ۴۰ فیصد رہ گئی جس سے ان علاقوں کی حالت تشویشناک حد تک خراب ہے جہاں پینے کے لیے بھی نہری پانی ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس صورتِ حال سے مستقل طور

پر عہدہ برآ ہونے کے لیے حسب ذیل اقدامات ضروری ہیں۔

۱۔ جن علاقوں کا پانی قابل کاشت ہے وہاں حکومت خود ٹیوب ویل لگا کر پانی مہیا کرے اور جن علاقوں میں زیر زمین پانی نا قابل کاشت ہے اس کے لیے فاضل پانی مخصوص کر کے کمی پوری کی جائے۔

۲۔ پانی کی منصفانہ تقسیم کے لیے موگوں پر میٹر نصب کیے جائیں۔

۳۔ آبیانہ پانی کی مہیا کردہ مقدار کے مطابق مقرر کیا جائے اور گذارہ یونٹ تک کے مالکان کو آبیانہ سے مستثنےٰ قرار دیا جائے۔

۴۔ ترقیاتی ٹیکس اور لوکل ریٹ ختم کیے جائیں۔

۵۔ پانی کی باقاعدہ سپلائی کے انتظام کے لیے ہر سطح پر نمائندہ کمیٹیاں بنائی جائیں جس میں کسان کمیٹی کے نمائندے شامل کیے جائیں۔

## سیم۔تھور

سیم اور تھور کا مرض ملک کی قابل کاشت اراضی کو بڑی تیزی سے ضائع کر رہا ہے اس کی پیداواری صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے جس سے پیداوار میں کمی واقع ہونے سے بیشتر کسان خاندان کی گذر اوقات خطرے میں پڑ گئی ہے پاکستان میں اس وقت تک ایک کروڑ ایکڑ رقبہ سیم سے ناکارہ ہو چکا ہے اس طرح ایک کروڑ بارہ لاکھ ایکڑ رقبہ جزوی طور پر متاثر ہے اس کے علاوہ پچاس لاکھ ایکڑ رقبہ تھور سے ناکارہ ہو چکا ہے اس طرح دو کروڑ باسٹھ لاکھ ایکڑ رقبہ کلی یا جزوی طور پر نا قابل کاشت ہو چکا ہے اگرچہ انسدادی کاروائیوں پر بے تحاشہ روپیہ صرف کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اتنا رقبہ قابل کاشت نہیں بنتا جس قدر ضائع ہو جاتا ہے اگر ایک لاکھ ایکڑ رقبہ سالانہ درست کیا جاتا ہے تو اسی قدر سالانہ ضائع بھی ہو جاتا ہے اسکارپ کے علاقوں میں ۶۵۷۱ ٹیوب ویل نصب ہو چکے ہیں مگر بیشتر ٹیوب ویل بدانتظامی کی وجہ سے ناکارہ ہو گئے ہیں۔ پاکستان جیسا غریب ملک اربوں روپے ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے سب سے بہتر، سستا اور زود اثر طریقہ سیم نالیاں بنانا ہے جن پر کم خرچ آتا ہے اور مقامی افرادی قوت استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔

اسکارپ کے علاقوں میں ٹیوب ویل سے پانی دینے کے عوض کسانوں پر آبیانہ دو گنا کر دیا گیا

ہے جو سراسر ناانصافی ہے کیونکہ یہ علاقے تو پہلے ہی سے سیم تھور سے متاثر ہیں اور پیداوار کم ہوتی ہے ان علاقوں کے کسانوں سے دوگنا آبیانہ وصول کرنا ان پر ناقابل برداشت بوجھ ہے جو فوری طور پر ختم کیا جانا ضروری ہے۔

اکثر لوگوں نے اپنے ذاتی ٹیوب ویل لگا رکھے ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے گو ان ٹیوب ویلوں سے ان کے مالکوں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے مگر ان سے پیداوار میں اضافہ اور سیم وتھور کے خاتمے میں بھی مدد ملتی ہے مگر ان ٹیوب ویلوں کو وقت پر بجلی مہیا نہیں کی جاتی اگر کنکشن دیے جاتے ہیں تو ایم۔سی۔جی کی شکل میں مقررہ رقم ماہوار وصول کی جاتی ہے۔ ڈیزل بہت مہنگا ہونے کی وجہ سے اخراجات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں ان سب مسائل کو فوری حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ سیم پر قابو پانے کے لیے سیم نالیاں جلد از جلد بنائی جائیں۔

۲۔ ٹیوب ویلوں کو بجلی کے کنکشن فوری طور پر دیے جائیں اور جن کو کنکشن دیے گئے ہیں انہیں باقاعدگی سے بجلی مہیا کی جائے۔

۳۔ سکارپ کے علاقوں میں دوگنا آبیانہ کی وصولی بند کی جائے۔

۴۔ ایم۔سی۔جی کی وصولی ختم کی جائے۔

## بینکنگ اور قرضہ جات

موجودہ زمانے میں زرعی معیشت کو ترقی دینے کے لیے جہاں زمین کا کسان کی اپنی ملکیت ہونا اہمیت رکھتا ہے وہاں کاشت کے لیے جدید آلات کشاورزی اچھے اور عمدہ بیجوں اور کافی مقدار میں کھاد کا استعمال بھی ضروری ہے مگر ہمارے ملک میں فرسودہ جاگیرداری رشتے اور کاشت کے دقیانوسی طریقے اب بھی موجود ہیں گو سرمایہ دارانہ رشتوں کی نشوونما کے ساتھ جدید طریقہ کاشت اچھے بیج، کھاد و کرم کش دوائیوں کے استعمال کا احساس کسانوں میں پیدا ہوا ہے اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی قیمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ عام کسانوں کی قوتِ خرید سے باہر ہیں۔ اگرچہ دیہات میں بینکنگ تیزی سے بڑھ رہی ہے حکومت نے زرعی بینک اور دوسرے بینکوں کو زرعی مقاصد کے لیے اجازت دے رکھی ہے مگر اس کا مقصد منافع خوری ہے۔ زرعی بینک دس فیصد اور دوسرے بینک تیرہ فیصد سود در سود وصول کرتے ہیں جو کسانوں کی قوت سے باہر

ہے۔ کھاد پر جو قرض صرف چھ ماہ کے لیے دیا جاتا ہے ایک بوری پر -/۵ روپے سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ بڑے قرضے صرف زرعی بینک دیتا ہے دوسرے بینک نہیں دیتے۔ دیہات کی کوآپریٹو سوسائٹیاں تو محض نام کے لیے رہ گئی ہیں حالانکہ انہیں درست طریقے سے منظم کیا جائے تو کسانوں سے قریب ہونے کی وجہ سے بہ آسانی ان کی ضروریات پوری کر سکتی ہیں۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویلوں کے لیے قرضوں پر آٹھ سو اور پانچ سو روپے بطور اسٹامپ ڈیوٹی ادا کرنی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ ضمانت بھی دینی پڑتی ہے اس طرح زراعت میں اس وقت جو بینکاری کی جارہی ہے وہ پاکستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں کسانوں کے زبردست استحصال کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اس لیے جدید طریقہ کاشت کو رواج دینے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پر فوری عمل کیا جانا ضروری ہے:

۱۔ زرعی قرضوں پر حد ملکیت کی پابندی ختم کی جائے۔
۲۔ زرعی ترقیاتی بینک کی طرح باقی بینکوں پر بھی ٹریکٹر، ٹیوب ویل اور دیگر آلات کشاورزی کی خرید کے لیے ضرورت کے مطابق قرضے جاری کرنے کی پابندی لگائی جائے۔
۳۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کو بینک کی سطح پر زرعی قرضے جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔
۴۔ زرعی قرضوں پر شرح سود صرف ۲½ فیصد مقرر کی جائے اور سود در سود کی وصول بند کی جائے۔
۵۔ زرعی قرضوں پر اسٹامپ ڈیوٹی ختم کی جائے۔

## ٹریکٹر، کیمیاوی کھاد اور کرم کش ادویات

آج کے ترقی یافتہ دور میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پرانے طریقوں ہل اور بیلوں کی بجائے مشینوں سے پیداوار میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور انسانی محنت بھی کم ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے ابھی تک ملک میں لوہے اور فولاد کا کوئی کارخانہ نہیں لگ سکا جس سے ملک میں ٹریکٹر تیار ہوتے اور سستے اور کم داموں پر کسانوں کو ملتے۔ اس وقت ٹریکٹر درآمد کر کے کسانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں جس پر کثیر زر مبادلہ خرچ ہونے کے علاوہ یہ اتنے گراں ہیں کہ انہیں صرف خوشحال زمیندار ہی خرید سکتے ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ملک میں پبلک سیکٹر میں ٹریکٹر تیار کیے جائیں تاکہ ملک کی ضرورت پوری ہو سکے اور کسانوں کو سستے داموں مل سکیں۔

کھاد کے کارخانے ملک میں موجود ہیں جو نجی ملکیت میں ہیں اور کثیر منافع خوری کی وجہ سے

کھاد کی قیمت بہت زیادہ ہے اس لیے عام کسان کھاد کے مناسب استعمال سے گھبراتا ہے کیونکہ وہ اس کی قوت خرید سے باہر ہے اور پیداوار متاثر ہوتی ہے اس لیے کھاد کے کارخانے قومی ملکیت میں لیے جائیں اور سستے داموں کھاد فراہم کی جائے۔

کرم کش دواؤں کی قیمت بہت زیادہ ہے اور نجی کمپنیوں کے ذریعے مہیا کی جاتی ہیں۔ دواؤں کے استعمال کی مشینیں اول تو میسر ہی نہیں اور اگر ہوتی ہیں تو بہت گراں ہیں اس لیے ضروری ہے کہ کرم کش ادویات اور ان کے استعمال کی مشینیں اور دوائیں حکومت خود تیار کرے اور ان کی سپلائی بھی خود کرے۔

## اشتمال اراضی

اشتمال اراضی کا مقصد تو مالکوں کے بکھرے ہوئے زمین کے ٹکڑوں کو یک جا کرنا ہے تا کہ کاشت کرنے کی آسانی فراہم ہو مگر اس اسکیم سے بڑے زمیندار اور با اثر افراد و انتظامیہ سے مل کر چھوٹے کسانوں کی زرخیز زمینیں حاصل کرنے اور انہیں ناقص زمینیں دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نیز اس سے بڑے زمینداروں کو اپنے مزارعین کو بیدخل کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے کیمبل پور، ہزارہ اور دوسرے اضلاع میں جہاں مزارعین پشت ہاپشت سے قابض چلے آرہے ہیں اشتمال کے بہانے بیدخل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس اسکیم کے مطابق حصہ داروں کی اکثریت کا متفق ہونا ضروری ہے مگر کسانوں کی پس ماندگی سے فائدہ اٹھا کر بڑے زمیندار اثر ورسوخ سے مقامی انتظامیہ کے ساتھ مل کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح چھوٹے کسانوں اور مزارعوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوا ہے لڑائی جھگڑے فساد اور مقدمہ بازی جاری ہے جس کے نتیجے میں پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اس لیے اس اسکیم کو موجودہ حالات میں ختم کر دینا چاہیے۔

## گندم

پاکستان گندم کے قحط سے دوچار ہے حکومت کے ماہرین کے مشوروں اور اس کے مشیروں کی ریڈیو پر پندونصائح اور پروپیگنڈے سے اس قحط کو کم نہیں کر سکتے۔ اور حکومت کے ملک کو خود کفیل بنانے

کے وعدے اور اعلانات پر کوئی فرد یقین کرنے کو تیار نہیں اس سال پندرہ لاکھ ٹن گندم درآمد کی جا رہی ہے جس پر چار ارب روپے سے زیادہ زرمبادلہ خرچ کرنا پڑے گا اور باہر سے ایک سو بیس روپے من کے حساب سے گندم خریدنی پڑ رہی ہے۔ پاکستان میں زمین وافر بھی ہے اور زرخیز بھی۔ اور افرادی قوت بھی موجود ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ابھی تک ہم خود کفیل نہیں ہو سکے۔ اس کا واحد اور بنیادی سبب تو یہ ہے کہ پاکستان میں ابھی تک جاگیرداری نظام موجود ہے ملک کی کثیر اراضی چند خاندانوں کے قبضے میں ہے اور بیشتر آبادی زمین سے محروم ہے اور مزارعین و کھیت مزدوروں کی حیثیت میں ان زمینوں پر محنت کرتی ہے۔ جب مزارعہ کو یہ معلوم ہے کہ وہ کسی وقت بھی بیدخل ہو سکتا ہے۔ کھیت مزدور اور مزارعہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی پیدا کردہ جنس اس کی اپنی نہیں تو وہ پیداوار کو بڑھانے میں کیوں دلچسپی لے اور جب چھوٹے مالک اور بے زمین کسان موجودہ قائم سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے استحصال سے اتنے کمزور ہو گئے ہوں کہ وہ کھاد اور اچھے بیج خریدنے کی قوت ہی نہ رکھتے ہوں تو وہ کیسے جدید طریقہ کاشت اور اعلیٰ بیج اور کھاد استعمال کر کے پیداوار کو بڑھا سکتے ہیں۔ دوسری طرف زمیندار جو بڑی زمینوں پر قابض ہیں اور پیداواری عمل سے بے تعلق بھی ہیں اس کی پیداوار بڑھنے پر خود قدرت نہیں رکھتے وہ زمین کے پیداواری عمل کو روکے ہوئے ہیں موجودہ جاگیرداری نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر پیداوار کو نہیں بڑھایا جا سکتا اس لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ پچاس ایکڑ سے زائد زمینداریاں بلا معاوضہ ختم کر کے تمام زمین قومی ملکیت میں لے لی جائے اور مزارعوں، چھوٹے مالکوں اور کھیت مزدوروں میں گذارہ یونٹ کے حساب سے خود کاشت کے اصول پر تقسیم کر دی جائے۔
۲۔ تمام قابل کاشت اراضی مزارعوں، کھیت مزدوروں میں بلا معاوضہ کوآپریٹو فارموں کی شکل میں تقسیم کر دی جائے۔
۳۔ چھوٹے کسانوں کو کوآپریٹو فارموں میں رضا کارانہ طور پر منظم کیا جائے۔
۴۔ پانی کی فراہمی کا انتظام ضرورت کے مطابق فوری کیا جائے۔
۵۔ کھاد، کرم کش ادویات، ٹریکٹر اور دوسرے مشینی اوزار کے کارخانے قومی ملکیت میں لیے جائیں اور بنا کر سستے داموں فراہم کیے جائیں۔

۶۔ زرعی قرضوں پر سود بند کیا جائے۔

۷۔ گندم اور دوسری اجناس کی قیمت پیداواری لاگت کے تناسب سے مقرر کی جائے۔ ان اقدامات کے بغیر حکومت کے پیداوار بڑھانے اور خودکفیل ہونے کے تمام اعلانات افسانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اس لیے ملک کو قحط سے بچانے کے لیے افسانے سنانے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لے کر ان بنیادی اقدامات پر فوری عمل کیا جائے۔

## چاول

حکومت نے چاول پیدا کرنے والے علاقوں کو مخصوص کر رکھا ہے۔ ان علاقوں سے باہر چاول اور مونجی لے جانے پر پابندی ہے اس مخصوص علاقے میں ایک سے دوسرے ضلع میں لے جانے پر بھی پابندی ہے اور اس علاقے کی تمام دھان چھڑنے کی مشینیں فصل آنے کے وقت سربمہر کر دی جاتی ہیں اور حکومت ایسے کارخانوں کو چاول چھڑنے کی اجازت اور لائسنس دیتی ہے جو دھان چھڑنے کے بعد حکومت کو چاول سپلائی کریں یا ایسے ڈیلروں کے دھان چھڑیں جو حکومت کو چاول سپلائی کرتے ہیں۔

حکومت چاول ڈیلروں کے ذریعے خریدتی ہے جو دھان عام منڈی سے خرید کر حکومت کو چاول سپلائی کرتے ہیں ثابت چاول جو حکومت کو دیتے ہیں اس کا دس فیصد حصہ وہ عام کھلی منڈی میں ملک کے کسی حصے میں فروخت کر سکتے ہیں اور ٹوٹہ چاول حکومت کی اجازت سے کھلی منڈی میں فروخت کر سکتے ہیں اس طرح ڈیلروں کو چاول پر اجارہ داری حاصل ہوگئی ہے اور وہ دھان کو اپنے مرضی سے کم قیمت پر خریدنے پر قادر ہو گئے ہیں اور کسانوں کا بے پناہ استحصال کرتے ہیں۔ حکومت ڈیلروں سے نوے روپے من چاول خریدتی ہے اور بیرون ملک چار سو روپے من رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کے ذریعے فروخت کرتی ہے اور خود اپنی اجارہ داری سے کئی گنا منافع کماتی ہے یوں ڈیلر اور حکومت دونوں مل کر کسانوں کی لوٹ کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ حکومت چاول کے ساتھ مونجی (دھان) کی قیمت مقرر کرے اور ڈیلروں کے ذریعے خریدنے کا سلسلہ بند کرے۔

۲۔ حکومت خود دھان خرید کر چاول کی چھڑائی کرے۔

۳۔ حکومت چاول برآمدی قیمت کے مطابق اندرون ملک قیمت مقرر کرے اور اس کے تناسب سے دھان کی قیمت مقرر کی جائے۔

۴۔ ڈیلروں کو کھلی منڈی میں چاول فروخت کردہ مقدار کا دس فیصد اور ٹوٹا کی فروخت کی سہولت دینے کی بجائے پیدا کرنے والے کسانوں کو دی جائے۔

## گنا اور چقندر

نقد آور اجناس میں گنا اور چقندر چینی کی پیداوار کے لیے دو بنیادی فصلیں ہیں۔ حکومت نے شوگر ملوں کے گردونواح کے علاقے کو شوگر ایریا قرار دے رکھا ہے اور کاشت کاروں پر پابندی ہے کہ وہ اپنی تمام تر فصل شوگر ملوں کو مقررہ نرخوں پر فروخت کریں اس لیے گنا پیدا کرنے والے اپنی ضرورت کے لیے گڑ یا شکر نہیں بنا سکتے۔ شوگر ملوں کے مالکان گنے کی فصل کو ملوں تک لانے کے لیے کوئی سہولت مہیا نہیں کرتے ذرائع رسل ورسائل خراب ہونے کی وجہ سے گنے کو شوگر ملوں تک لانے کے لیے کسانوں کو اخراجات بار برداری بہت اٹھانے پڑتے ہیں اور انہیں بچت بہت کم ہوتی ہے اور چھوٹے مالکوں کو بے حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب گڑ اور شکر کے بھاؤ کم ہوں تو مل مالکان بااثر لوگوں کا گنا شوگر ایریا کے باہر سے خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ چھوٹے مالک اور مزارعے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں اور تنگ آ کر اپنی فصل سستے داموں دلالوں کو دے دیتے ہیں۔ گیٹ پر گنا لانے والوں کے لیے کوئی سہولت نہیں ہوتی رات بھر کسان اپنے ریڑھے اور گڈے سردی میں لیے پڑے رہتے ہیں۔ کین بورڈ اور چقندر بورڈ موجود ہوتے ہوئے بھی ان کی مشکلات کا کوئی ازالہ نہیں کیا جاتا ان مسائل کے حل کے لیے حسب ذیل پروگرام پر عمل کیا جائے۔

۱۔ چینی کی پیداوار میں اضافے کے لیے گنا پیدا کرنے والے علاقوں میں چینی کے کارخانے حکومت خود لگائے۔

۲۔ شوگر ملوں کی انتظامیہ اور گنے کے کاشت کاروں کے نمائندوں پر مشتمل کمیٹیاں بنائی جائیں جو انتظام کریں۔

۳۔ گنے کی قیمت آٹھ روپے من مقرر کی جائے اور چقندر کی قیمت کا بھی تعین کیا جائے۔

۴۔ شوگر ایریا میں رسل ورسائل کی سہولت کے لیے سڑکیں تعمیر کی جائیں۔

۵۔ ملوں کے گیٹ پر کسانوں کے کینٹین اور سردے سے بچنے کے لیے شیڈ تعمیر کیے جائیں اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۶۔ مل انتظامیہ پر پابندی ہو کہ وہ ایریا کے کسانوں کی تمام فصل وقت پر اٹھائے۔

۷۔ کسانوں کو شوگر ایریا میں اپنی فصل کا ۱/۴ حصہ ذاتی استعمال کے لیے گڑ بنانے کی اجازت دی جائے۔

۸۔ چقندر کی قیمت فی من مقرر کی جائے

## تمباکو

چند برس پہلے تک ہمارے ملک میں صرف دیسی تمباکو ہی کاشت ہوتا تھا مگر سرمایہ دارانہ معیشت کے فروغ سے ملک میں سگریٹ کے کارخانوں کا قیام بھی عمل میں آیا ہے اور درجنیا تمباکو بھی کاشت ہونے لگا ہے۔ اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تمباکو کے کاشت کاروں کو بے حد پریشانیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ان کی اس مجبوری سے کہ وہ تمباکو کو ایکسائز ڈیوٹی کی وجہ سے کہیں اور نہیں لے جاسکتے اس لیے تمباکو اونے پونے دام ان کمپنیوں کے پاس بیچنا پڑتا ہے۔ اور کمپنیاں تمام فصل بھی خریدنے کی پابند نہیں ہیں وہ خریداری بند کر کے کاشت کاروں کی بقیہ فصل کو ضائع کر دیتی ہیں۔ اگر چہ تمباکو بورڈ موجود ہے مگر اس میں نمائندے بڑے زمینداروں کے ہیں اور کمپنیاں ان کا تمباکو اچھے داموں خرید لیتی ہیں اور بقیہ کاشتکار پریشان حال پھرتے ہیں۔ تمباکو بورڈ کے نمائندے تمباکو پیدا کرنے والے علاقوں کی نمائندگی نہیں کرتے اس لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ تمباکو کی قیمت مقرر کی جائے۔

۲۔ تمباکو بورڈ میں ان کسانوں کو نمائندگی دی جائے۔ جو تمباکو پیدا کرنے والے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ کمپنیوں کو پابند کیا جائے کہ وہ کسانوں کی تمام پیداوار خرید کریں اور خریداری بند نہ کریں۔

## کپاس

کپاس نقد آور ہی فصل نہیں بلکہ زرمبادلہ کمانے اور ملکی صنعتوں کو خام مال مہیا کرنے کی فصل بھی

ہے۔ کپاس بعض علاقوں میں کسانوں کی بنیادی فصل ہے جس سے وہ سال بھر کے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ گذشتہ سال کے سیزن کے آخری دنوں میں یکلخت بھاؤ گر گئے اور کسانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا اس سال بھی گذشتہ سال کی چار لاکھ گانٹھیں فاضل پڑی ہیں جنہیں برآمد نہیں کیا جاسکا۔ دھاگے اور سوتی کپڑے کی صنعت بھی بحران کا شکار ہوگئی ہے اگرچہ حکومت نے فصل کی کاشت کے وقت کسانوں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ کپاس کی کم از کم قیمت اسی (۸۰) روپے من ہوگی اور اگر اس سے کم ہوئی تو حکومت خود منڈی سے کپاس کی خریداری کرے گی مگر اس سال سارا سیزن بھاؤ ساٹھ (۶۰) روپے سے پچھتر (۷۵) روپے فی من تک رہا مگر حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق خریداری نہیں کی۔ جننگ فیکٹریوں کے مالکان نے باہمی پول کر کے کم قیمت پر کپاس خریدی اور بعض جگہ وٹہ لگا کر قیمت اور بھی کم کردی۔ ٹیکسٹائل ملوں کے مالک کاٹن کارپوریشن کی انتظامیہ سے مل کر بھاؤ گراتے ہیں اس صورتِ حال سے کپاس کے کاشت کاروں کا بددل ہونا لازمی ہے جس سے آئندہ سال کپاس کی پیداوار اور بھی کم ہو جائے گی زرمبادلہ پر اس کا بڑا اثر پڑے گا اس لیے اس صورتِ حال کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ حکومت ٹیکسٹائل ملوں کو قومی ملکیت میں لے اور کپاس براہِ راست کسانوں سے خرید کرے۔

۲۔ کپاس کی کم از کم قیمت سو (۱۰۰) روپے من مقرر کرے اور خود جننگ کر کے ملکی ضروریات سے زائد پیداوار کو خود ہی برآمد کرے۔

## کوآپریٹو فارمنگ

دو سال قبل حکومت نے مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے نام سے ایک اسکیم جاری کی تھی جس کے تحت ہر ضلع میں ایک ایک علاقہ مخصوص کر کے ان میں سبھی محکموں کے ملازمین کو پروجیکٹ انتظامیہ کے دائرہ اختیار میں دے دیا اور کروڑوں روپے اس پروگرام پر خرچ کیا گیا ہے مگر دو سال کے عرصہ میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

حکومت نے حال ہی میں نئی اسکیم کوآپریٹو فارمنگ قائم کرنے کے لیے جاری کی ہے جس کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت ہر طرح سے کروڑوں روپے خرچ کرے گی اور صوبائی حکومتیں

اس مقصد کے لیے الگ وزارتیں بنائیں گی۔ جہاں تک اس اسکیم کا تعلق ہے اس کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ کوآپریٹو فارمنگ اجتماعی کاشت کاری کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ پیداوار میں اضافہ کرنے کا ترقی یافتہ طریقہ بھی ہے مگر کوآپریٹو فارمنگ کے قیام کا پیداواری رشتوں سے گہرا تعلق ہے جب تک ملک میں جاگیردارانہ سماج کے نجی پیداواری رشتے یعنی زمین کی نجی ملکیت موجود ہے مشینی کاشت اور کوآپریٹو فارمنگ اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کوآپریٹو فارمنگ اور مشینی کاشت کو رواج دینے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ زرعی نظام کو بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے اور تمام زمین مزارعوں، کھیت مزدوروں میں تقسیم کر دی جائے۔ اور پھر انہیں کوآپریٹو فارمنگ میں منظم کیا جائے یہ حقیقت ہے کہ سویٹ یونین، چین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں زرعی معیشت کو ترقی دینے کے لیے کوآپریٹو فارموں اور مشینی کاشت سے پہلے زمین کو قومی ملکیت میں لے کر از سرِ نو تقسیم کیا گیا تھا۔

پاکستان میں تین بار زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں لیکن اس کے باوجود جاگیرداری نظام کا خاتمہ نہیں ہوا۔ پاکستان کی زرعی معیشت بحران کا شکار ہے اور اناج کے قحط سے دوچار ہے اس لیے اس اسکیم کی کامیابی اور ملک کی زرعی ترقی کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ تمام زمین قومی ملکیت میں لے کر از سرِ نو مزارعوں، کھیت مزدوروں اور چھوٹے مالک کسانوں میں خود کاشت کی بنیاد پر تقسیم کر کے پھر ان کو کوآپریٹو فارموں میں منظم ہونے کی ترغیب دی جائے اس طرح کوآپریٹو فارموں کو منظم ہونے کے بعد مشینی کاشت شروع کی جائے۔ ورنہ مجوزہ کوآپریٹو فارمنگ کی اسکیم کا وہی حشر ہوگا جو مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام یا اس سے پہلے دیلج ایڈ پروگرام کا ہوا ہے۔

## طبی امداد

دیہات کی اسی (۸۰) فیصد آبادی طبی امداد سے بالکل محروم ہے دیہات میں اگر کہیں چھوٹی موٹی ڈسپنسری موجود بھی ہے تو اس میں ڈاکٹر نہیں ہیں۔ پرائیوٹ ڈاکٹروں کی سہولت بھی دیہات میں میسر نہیں ہے بے شمار جانیں طبی امداد وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں کسی مریض کو بڑے ہسپتال تک لانے کے لیے اول تو انتظام ہی دقت سے میسر آتا ہے اگر کوئی مریض کسی نہ کسی طرح پہنچ جائے تو داخلے کے انتظار میں ہی جان دے دیتا ہے اور پھر داخلہ مل جائے تو سفارش یا

رشوت کے بغیر کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا جبکہ ان بڑے ہسپتالوں کے اخراجات کا بوجھ ان غریب عوام کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن ان بڑے ہسپتالوں سے استفادہ بڑے زمیندار، سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے افراد کرتے ہیں۔ اس تشویشناک صورتِ حال کا تدارک بہت ضروری ہے اس لیے:

۱۔ دیہات میں دس ہزار کی آبادی کے لیے ایک ہسپتال قائم کیا جائے اور ان میں ڈاکٹر مہیا کیے جائیں۔ ڈاکٹروں کو دیہات ڈسپنسریوں کی طرف راغب کرنے کے لیے انہیں بہتر سہولتیں دی جائیں۔

۲۔ دور افتادہ علاقوں میں بڑے ہسپتال قائم کیے جائیں۔

۳۔ تمام ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا انتظام حکومت خود سنبھالے۔

۴۔ دیہی علاقوں سے مریضوں کو بڑے ہسپتالوں میں پہنچانے کے لیے ایمبولینس گاڑیوں کا انتظام کیا جائے۔

## حیوانات

زرعی پیداوار کا انحصار آج بھی مویشیوں پر ہے۔ ملک کی دودھ، گوشت کی ضرورت بھی ان ہی سے پوری ہوتی ہے مگر ان کی پرورش، نگرانی اور علاج کا کوئی بندوبست نہیں۔ قیمتی مویشی بیل، بھینسیں اور بھیڑ بکریاں لاتعداد بیماریوں کا شکار ہو کر بغیر علاج مر جاتی ہیں اول تو دیہات میں شفاخانے حیوانات نہ ہونے کے برابر ہیں اگر کوئی ہے بھی تو اس میں ڈاکٹر موجود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر دیہات میں جانا پسند نہیں کرتے بلکہ ضلعی ہیڈ کوارٹروں میں ہی رہتے ہیں اور وہیں سے تنخواہ لے لیتے ہیں حالانکہ ان کا کام ہی دیہاتی عوام کی خدمت کرنا ہے وٹرنری ریسرچ کے ادارے اول تو موجود نہیں اگر ہیں تو وہ صوبائی ہیڈ کوارٹروں میں واقع ہیں جہاں بیمار مویشیوں کو لانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے اس لیے:

۱۔ ملک کے دور افتادہ علاقوں میں وٹرنری ریسرچ ادارے کھولے جائیں۔

۲۔ ہر یونین کونسل میں کم از کم ایک شفاخانہ حیوانات قائم کیا جائے اور اس میں ڈاکٹر تعینات کیا جائے۔

۳۔ نسل کشی کے لیے ہر شفاخانہ میں اچھی نسل کے سانڈ، بھینسے رکھے جائیں۔

## تعلیم

دیہات میں جو اسکول قائم ہیں ان کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے شہروں میں اعلیٰ طبقوں کے لیے چیفس کالج، پبلک اور ماڈل اسکولوں کی صورت میں شاندار عمارات تعمیر کی گئی ہیں اور دوسری طرف دیہی اسکولوں کی کچی اور نیم پختہ عمارتیں ہیں جن میں ضرورت کے مطابق کمرے ہیں اور نہ ضرورت کے مطابق فرنیچر اور سائنس وغیرہ کا دوسرا سامان، اکثر اسکولوں میں اساتذہ بھی کم ہیں۔

موجودہ حکومت نے جو تعلیمی پالیسی اختیار کی ہے اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ پہلے مڈل تک اور اس سال میٹرک تک مفت تعلیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کے مطابق اسکول کی فیس کے ایک یا دو روپے تو معاف ہو گئے مگر باقی فنڈز بدستور قائم رکھے ہیں داخلے کی فیسوں کتابوں کی قیمتوں اور ہوسٹلوں کے اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ دور افتادہ علاقوں کے لوگ اور غریب کسان کیسے یہ سارے اخراجات برداشت کر کے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے ہیں اور کیسے دیہات کا طالب علم قابلیت کے معیار کا مقابلہ ان طلبا سے کر سکے گا جو پبلک ماڈل اسکولوں اور کالجوں میں اور عام شہری اسکولوں میں پڑھتے ہیں جن کو تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ حکومت کے حکام کا یہ اعلان کہ اب داخلہ پبلک اور ماڈل اسکولوں اور کالجوں میں اہلیت کی بنیاد پر ملے گا دیہاتی غریب طالب علم ان افسروں کے بیٹوں کی قابلیت کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جبکہ دونوں کو ایک سی سہولتیں میسر نہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے دیہات کی آبادی میں تعلیم عام نہیں ہو سکی۔ آج بھی کروڑوں کی آبادی ان پڑھ ہے اس لیے تعلیم عام کرنے اور دیہات سے بے علمی اور جہالت کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ دیہات کے اسکولوں کی عمارات کو حکومت اپنی تحویل میں لے اور خود تعمیر کرائے۔

۲۔ دیہات کے اسکولوں میں ضروری سہولتیں فرنیچر اور دوسرا سامان مہیا کیا جائے۔

۳۔ ہر ایک دیہات میں پرائمری اسکول اور ہر دس ہزار کی آبادی پر ایک ہائی اسکول لڑکے اور لڑکیوں کے لیے قائم کیے جائیں اور تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

۴۔ ہر قصبہ میں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک ایک ڈگری کالج قائم کیا جائے۔

۵۔ دیہات کا اسٹاف تربیت یافتہ مقرر کیا جائے۔

۶۔ جب تک دیہات اور شہروں میں یکساں تعلیمی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں اس وقت اعلیٰ تعلیمی

اداروں میں داخلہ آبادی کے تناسب سے دیا جائے۔

## طبقاتی تجزیہ

ملکی زرعی معیشت کی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ دیہات میں طبقات اور طبقاتی رشتوں کو دیکھنا اور ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے تاکہ دیہات کی صف بندی کا اندازہ ہو سکے۔

## کھیت مزدور

زرعی معیشت پر انحصار رکھنے والی آبادی میں مظلوم ترین طبقہ کھیت مزدوروں کا ہے اس طبقے کی آبادی میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ مزارعے دستکار اور چھوٹے مالک کسان اس کی صفوں میں شامل ہوتے جا رہے ہیں اس وقت بھی اس کی آبادی پانچ چھ لاکھ خاندانوں کے قریب ہے۔ دیہات کی زندگی میں سب سے کٹھن زندگی اس طبقے کی ہے کیونکہ کھیت مزدور کہیں ماہوار تنخواہ پر کام کرتا ہے کہیں روزانہ محنت پر کام کرتا ہے کہیں سیزنل کام کرتا ہے اور کہیں ٹھیکہ پر کام کرتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں یہ طبقہ بے مالک ہے جو نہ مزارعہ ہے اور نہ ہی حصہ دار کی تعریف میں آتا ہے اس کے نہ اوقات کار کا تعین ہے اور نہ اسے کسی قانون کا تحفظ حاصل ہے یہ چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اس کی کوئی ملکیت بھی نہیں یہ صرف اپنی محنت بیچ کر گذر اوقات کرتا ہے اس کی اجرت اس مہنگائی کے دور میں بھی پچاس روپے ماہوار سے سوا سو روپے ماہوار تک ہے جس سے اپنے بال بچوں کا اور اپنا پیٹ بھرنا پڑتا ہے اس لیے یہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے یہ طبقہ ایک قسم کا دیہاتی پرولتاریہ ہے۔ اس کی آبادی بکھری ہوئی ہے اس لیے ابھی تک موثر کردار ادا نہیں کر سکا یہ طبقہ کسان کمیٹی کی بنیاد ہے اس کو کسان کمیٹی میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مندرجہ ذیل مطالبات پر تنظیم میں شامل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے:

۱۔ کام کی نوعیت کے مطابق کم از کم اجرتوں کا تعین کیا جائے۔

۲۔ کام کے زیادہ سے زیادہ اوقات کار کا تعین کیا جائے۔

۳۔ ملازمت کا تحفظ اور طبی امداد کی ضمانت دی جائے۔

۴۔ تہواروں کی چھٹی کے علاوہ ہفتہ میں ایک چھٹی دی جائے۔

۵۔ سرکاری زمین کم از کم گذارہ یونٹ ½۱۲ ایکڑ بلا قیمت دی جائے۔

٦۔ رہائش کے لیے احاطہ جات بلا قیمت دیے جائے۔

۷۔ سیری کی صورت میں اس کے حقوق اور پیداوار میں حصہ کا تعین کیا جائے۔

## دیہاتی دستکار

دیہات کے دستکاروں کا ذریعہ معاش دستکاری ہے یہ لوہار، ترکھان، حجام، درزی، جولاہا، کمہار، موچی وغیرہ پر مشتمل ہے یہ ایک جنس اپنی محنت کے معاوضہ کے طور پر حاصل کرتا ہے اس طبقے کو عرف عام میں سیپی بھی کہا جاتا ہے اس کی سیپ کی شرح آج سے چالیس سال پہلے مقرر ہوئی تھی آج تک اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ان کی گذر اوقات بمشکل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کام کے ساتھ خراس، کھڈی لگاتے اور بھیڑ بکری وغیرہ پالتے ہیں۔اور کہیں اُجرت پر بھی کام کرتے ہیں۔ان کی آبادی ساتھ لاکھ خاندانوں پر مشتمل ہے۔یہ طبقہ زرعی پیداوار میں بالواسطہ طور پر حصہ دار ہے اس کی زندگی بڑی کٹھن ہے چونکہ یہ خدمت اور محنت کرتا ہے اس لیے مالک کسان اسے کم تر انسان تصور کرتے ہیں یہ طبقہ معاشی وتہذیبی طور پر بہت پس ماندہ ہے یہ طبقہ بھی کھیت مزدوروں کی طرح کسان تحریک میں حصہ لے سکتا ہے اس طبقہ پر دیہات کے مالکوں کا خاصہ خوف بھی طاری رہتا ہے اس طبقہ کو کسان کمیٹی میں لانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے یہ طبقہ اپنے اوزاروں کی ملکیت کے علاوہ وہ کوئی ملکیت نہیں رکھتا بعض جگہ رہائش کے احاطوں کا بھی مالک نہیں ہے۔ اگر چہ صوبائی حکومت نے غیر مالکوں کو ۵ مرلے کے حساب سے احاطوں کو تقسیم کا پروپیگنڈا شروع کرر کھا ہے مگر عملاً صورتِ حال مختلف ہے اس اسکیم کے تحت ہر وہ آدمی ۵ مرلے کا حقدار ہے جس کے پاس پاکستان میں کسی جگہ کوئی ملکیت نہ ہو اور نہ ہی اس کے باپ، ماں، لڑکے، لڑکی، نانا، نانی، دادا، دادی کی جائیداد پاکستان کے کسی حصہ میں ہو اس طبقے کے حسب ذیل مطالبات ہیں:

۱۔ دستکاروں کی کم از کم اُجرت مقرر کی جائے۔

۲۔ سکنی احاطوں کی زمین کا مالک قرار دیا جائے۔

۳۔ گھریلو صنعتوں کے لیے قرضے بلا سود دے کر ان کو کوآپریٹو بنیادوں پر منظم کیا جائے۔

## مزارعہ

دیہات میں مزارعہ ایک قسم کا نیم پرولتاریہ طبقہ ہے کیونکہ اس کے پاس آلاتِ پیداوار مثلاً بیل، ہل وغیرہ اپنے ہیں۔ پاکستان میں اس طبقہ کی آبادی ۲۱ لاکھ خاندانوں یعنی ایک کروڑ پر مشتمل ہے مگر یہ گوٹھوں، بھینوں اور کاشتہ رقبہ پر آبادیوں کی شکل میں بکھرا ہوا ہے یہ طبقہ آبادی میں بڑا ہے اور قابل کاشت اراضی کا نصف رقبہ کاشت کرتا ہے یہ طبقہ زمین زمین کی کوئی ملکیت نہیں رکھتا بلکہ رہائشی احاطہ بھی اس کا نہیں ہے کیونکہ جہاں کہیں اسے زمین کاشت کے لیے مل جاتی ہے وہیں چلا جاتا ہے اس کی گذر بسر بہت مشکل سے ہوتی ہے یہ ہمیشہ مالک کا مقروض رہتا ہے یہ بہت پسا ہوا طبقہ ہے پاکستان میں اس طبقہ کی تنظیم کو خاص اہمیت دینے کی ضرورت ہے اس طبقہ کو شریک کیے بغیر جاگیرداری نظام کے خاتمے اور زرعی انقلاب کی جدوجہد ناممکن ہے۔ یہ طبقہ ابھی تک مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ پوری طرح منظم نہیں ہے اس طبقہ کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ جس زمین کو وہ کاشت کرتا ہے اس کا اسے مالک ضرور بننا ہے اس لیے بیدخلی کے خلاف ہے مزاحمت کی خواہش رکھتا ہے اور زمین کا مالک بننا چاہتا ہے مگر درست طبقاتی شعور نہیں رکھتا۔ اس طبقہ کو کسان کمیٹی کی تنظیم میں لانا ہمارا اولین فرض ہے اس طبقہ کو تنظیم میں شریک کرنے کے لیے حسب ذیل مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔

۱۔ جاگیرداری زمینداری کا خاتمہ کر کے زمین مزارعوں، کھیت مزدوروں میں بلا معاوضہ تقسیم کی جائے۔

۲۔ بیدخلیاں قطعی بند کی جائیں۔

## ۱/۲ ۱۲ ایکڑ تک کے مالکان

دیہات کا یہ طبقہ جو چند کنال سے لے کر ۱/۲ ۱۲ ایکڑ تک کا مالک ہے یہ طبقہ مالی طور پر مزارعوں سے زیادہ خوشحال نہیں ہے۔ اپنی زمین کے علاوہ دوسروں کی زمین لے کر کاشت کرتا ہے اور بمشکل اپنی گذر کرتا ہے مگر اسے اپنے مالک ہونے کا احساس ہے اس لیے اپنے کو مزارعوں، کھیت مزدوروں اور دستکاروں سے برتر سمجھتا ہے اس کی تعداد دس لاکھ خاندان ہے ماسوائے چند اضلاع کے کسی جگہ زیادہ تعداد نہیں۔ اس کی خواہش خوشحال کسان بننے کی رہتی ہے مگر اکثر مقروض رہتا

ہے اور دن بدن مزارعوں کھیت مزدوروں کی صفوں میں شامل ہو رہا ہے یہ کسان کمیٹی کی بنیاد ثابت ہوسکتا ہے اور اس میں سرگرم کردار ادا کرسکتا ہے اس کی بیحد خواہش زمین حاصل کرنے کی ہے اس کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ زیادہ اثر نہ مالکوں کا قبول کرتا ہے نہ انتظامیہ کا۔ قدرے آزاد ہے ہمیں اس طبقے کے لیے سرگرمی سے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کسان تنظیم کا ممبر ہے اس کے لیے ہمیں یہ مطالبے اٹھانے چاہئیں۔

۱۔ چھوٹے مالک کسانوں کو سرکاری اراضی معاوضہ دی جائے۔

۲۔ جاگیرداری ختم کر کے فاضل اراضی چھوٹے مالک کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

۳۔ چھوٹے مالک کسانوں کو مالیہ اور آبیانہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

## ۱۵/۱ ایکڑ کے مالکان

دیہات کے ۱۲½/۱ ایکڑ سے ۱۵/۱ ایکڑ تک مالکان پر یہ طبقہ مشتمل ہے یہ ایک قسم کا چھوٹا مالک کسان ہے یہ طبقہ ہمیشہ مزید زمین بٹائی، ٹھیکہ متاجری یا مقاطعہ پر حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے رقبے کے علاوہ مزید رقبہ حاصل کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرے تاکہ قرض اتار سکے اور زندگی میں آسودگی آئے اور خوشحال کسان طبقہ میں شامل ہو جائے جب اس کی یہ خواہش کم آمدنی سے پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو یہ کسان کمیٹی میں شامل ہوکر زمین حاصل کرنے کی جدوجہد کرسکتا ہے اس پر اوپری طبقوں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومت کی مشینری سی زیادہ خوفزدہ ہوتا ہے یہ ہماری دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ ہے اس کی تعداد ۲۲ سے ۲۳ لاکھ خاندانوں پر مشتمل ہے جو سوا کروڑ کے قریب ہوتی ہے اس طبقہ کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہیے اور اسے کسان کمیٹی میں منظم کرنا چاہیے اس کی آبادی ہر جگہ ہے اس طبقہ کو حسب ذیل مطالبات کی بنیاد پر منظم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جاگیرداری کا بلا معاوضہ خاتمہ کر کے فاضل اراضی چھوٹے مالک کسانوں کو مفت تقسیم کی جائے۔

۲۔ سرکاری اراضی بلاقیمت چھوٹے مالک کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

۳۔ مالیہ۔ آبیانہ چھوٹے مالک کسانوں کا ختم کیا جائے۔

## ۱۲½ ایکڑ کے مالکان

یہ طبقہ ۱۵/ ایکڑ سے زائد اور ۱۲½/ ایکڑ سے کم کا مالک ہے اگرچہ یہ طبقہ اپنی گزر بسر اپنی ہی زمین پر کر لیتا ہے مگر اس کی ضروریات زندگی مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔ اس کی خواہش ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو ٹیکسوں کا بوجھ کم ہو اس طبقہ کو مندرجہ ذیل مطالبات پر متحرک کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جاگیرداری کا خاتمہ کر کے فاضل اراضی اور تمام سرکاری اراضی گذارہ یونٹ سے کم کے مالکان میں بلاقیمت تقسیم کی جائے۔

۲۔ گذارہ یونٹ تک کے مالکان کو مالیہ اور آبیانہ سے مستثنےٰ قرار دیا جائے۔

۳۔ کھاد کی قیمت کم کی جائے۔ سستی تعلیم مہیا کی جائے۔

## ۱۲½/ ایکڑ سے ۲۵/ ایکڑ تک کے مالکان

یہ طبقہ ۱۲½/ ایکڑ سے ۲۵/ ایکڑ تک کے مالکان پر مشتمل ہے اس کی تعداد سات (۷) لاکھ خاندانوں پر مشتمل ہے یہ طبقہ خوشحال کسانوں کا ہے خرچ اخراجات کے بعد کچھ بچت بھی کر لیتا ہے جس سے مزید زمین خریدنے یا کسی دوسرے کاروبار کے لیے تگ و دو میں لگا رہتا ہے تاکہ امیر کسانوں کے طبقے میں شامل ہو جائے مگر مہنگائی اور دوسرے اخراجات کی وجہ سے ناکام رہتا ہے یہ طبقہ مجموعی طور پر تذبذب کا شکار ہے اس تنظیم یا جماعت کے ساتھ جانا چاہتا ہے جہاں اسے ذاتی وقار یا مالی فائدہ حاصل ہو۔ ہماری تحریک میں اگر شامل نہیں ہوتا تو مخالفت بھی نہیں کرتا اس کا کچھ حصہ مشترکہ مسلوں پر ساتھ بھی دے دیتا ہے عام طور پر غیر جانبدار رہنے کا رجحان رکھتا ہے اور پیسے کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ تحریک مضبوط ہو تو اس سے متاثر ہوتا ہے ہمیں اس طبقہ کو دشمن نہیں بنانا چاہیے بلکہ کسان کمیٹی میں شامل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

## ۲۵/ ایکڑ سے ۵۰/ ایکڑ تک کے مالکان

یہ طبقہ تعداد میں بہت کم ہے لیکن اثر و رسوخ کے لحاظ سے بہت زیادہ مؤثر ہے یہ ہمارا ساتھی کم بنتا ہے مگر سیاست پر گفتگو زیادہ کرتا ہے کسان کمیٹی کا اتحادی بنتا لیکن مجموعی طور پر مخالفت بھی نہیں کرتا اگر کسان تحریک مضبوط ہو تو اس میں شامل ہونے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور تحریک کمزور

ہوتو دور بھاگ جاتا ہے اسے تحریک کا مخالف نہیں بنانا چاہیے۔

## ۵۰/ایکڑ سے زائد کے مالکان

۵۰/ایکڑ اراضی سے زائد رقبے کے مالکان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے جو کل مالکان کا دو(۲) فیصد ہے ہماری کسان تحریک کا دشمن نمبر؟؟......؟؟ جاگیرداری زرعی نظام کا محافظ اور سامراج کا دوست یہی طبقہ ہے۔ایک کروڑ پندرہ لاکھ ایکڑ کا مالک ہے اس طبقہ کو ختم کیے بغیر کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے۔

دیہات کے طبقاتی تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دیہات میں کسان کمیٹی کی بنیاد کھیت مزدور، دستکار، چھوٹے مالک کسان جو گذارہ یونٹ سے کم کے مالک ہیں جن کی آبادی کم و بیش ساڑھے تین کروڑ ہے جس کو متحد و منظم کر کے ہی جاگیرداری کے خلاف جدوجہد کی جاسکتی ہے۔

آج پاکستان میں کسان کمیٹی کو کمزور کرنے اور انتشار پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مختلف ناموں سے تنظیمیں سامنے آرہی ہیں مثلاً انجمن کاشت کاراں، کسان تنظیم، کسان کونسل، کسان بورڈ اور پیپلز کسان کمیٹی یہ ایسی جماعتیں ہیں جن کا مقصد بنیادی طور پر کسان کمیٹی کو کمزور کرنا ہے۔ان میں کسان بورڈ جماعت اسلامی نے بنایا ہوا ہے جس کی غرض ہی یہ ہے کہ جاگیرداری کا تحفظ کیا جائے اور کسانوں کو جدوجہد سے روکا جائے انجمن کاشت کاراں، زمینداروں اور مالکوں کی تنظیم ہے جس کا مقصد اپنی اجناس کے اچھے بھاؤ حاصل کرنا اور کسانوں کو ساتھ لے کر حکومت سے سودے بازی کرنا ہے۔یہ تنظیمیں کسان تحریک میں رکاوٹ ہیں اور بنیادی مسائل کو حل نہیں کرسکتیں۔

# زرعی انقلاب

پاکستان کے معاشی نظام کی پستی کا بنیادی سبب پاکستانی جاگیرداری زرعی نظام ہے جس کو ڈھائے بغیر نہ تخلیقی محنت آزاد ہوسکتی ہے اور نہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ دیہات کی اسی (۸۰) فیصد آبادی غربت اور افلاس سے نجات پاکر خوشحال زندگی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ زرعی انقلاب کو برپا کرنے کی محرک قوت کھیت مزدور، مزارعے، ہاری بے مالک کسان اور چھوٹے مالک کسان ہیں جو دیہات کے سب سے نچلے اور پسے ہوئے محنت کش طبقے ہیں۔ دیہات کے محنت کشوں کی یہ وسیع آبادی طبقاتی شعور سے لیس ہوکر جاگیرداری زرعی نظام کو ختم کرنے کی منظم جدوجہد سے ہی یہ فریضہ انجام دے سکتی ہے یہ وسیع آبادی تہذیبی پس ماندگی کا شکار ہے اور بکھری ہوئی ہے ان کو بیدار کرنے کا کام دقت طلب اور صبر آزما بھی ہے لیکن اس کام کے کیے بغیر پاکستان کا سماج آگے نہیں بڑھ سکتا۔

دیہات کے ان طبقوں کو ان کے فوری مطالبات کی بنیاد پر منظم کرکے اس فرسودہ جاگیرداری نظام کے خاتمے کی طرف آگے بڑھایا جاسکتا ہے اس لیے کسان کارکنوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ بیدخلیوں کو بند کرانے، اجناس کے مناسب دام حاصل کرنے ٹیکس اور مالیہ اور آبیانہ کے بوجھ سے نجات پانے سستے داموں کھاد اور عمدہ بیج اور دوسری سہولتوں کی حصول کی جدوجہد میں انہیں منظم کریں۔

اس جاگیرداری نظام نے ہماری دیہاتی زندگی کو اقتصادی اور سماجی فرق مراتب کے درجنوں طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے جو بنیادی طور پر مفاد اور مسائل ایک رکھتے ہوئے بھی وقتی ضرورتوں کے تحت ٹکراتے رہتے ہیں جو کسان کمیٹی کی تنظیم میں رکاوٹ اور الجھنوں کا باعث بنتے ہیں اس لیے کسان کارکنوں، دوستوں اور ہمدردوں کو شعوری طور پر رائے عامہ کو اس طرح تیار کرنا چاہیے کہ قومی اور طبقاتی مفاد کو ذاتی اور وقتی مفاد پر ترجیح دی جائے تاکہ منظم جدوجہد اور ملک میں رائج

فرسودہ جاگیرداری زرعی نظام کوختم کرنے کے لیے دیہات کی کثیر آبادی کوتیار کیا جاسکے۔

اس نظام کوختم کر کے آزادی حاصل کرنے کی اس جدو جہد میں سارے پاکستان کے محنت کش عوام یعنی کھیت مزدوروں، دستکاروں، مزارعوں اور گذارہ یونٹ سے کم کے مالک کسانوں کو کسان تحریک میں منظم کرنے اور اس کے ساتھ شہروں کے محنت کش طبقوں مزدوروں انقلابی دانشوروں کے تعاون سے اس تحریک کو زیادہ موٴثر بنایا جاسکتا ہے۔

پاکستان کا انقلاب عبارت ہے پاکستان کے عوام کی سامراج سے آزادی اور سرمایہ داری اور جاگیرداری زرعی نظام کے خاتمے سے۔ اس لیے پاکستان میں زرعی انقلاب کے لیے جہاں دیہات کے کسانوں، کھیت مزدوروں، چھوٹے مالک کسانوں کو منظم اور متحد کر کے اپنے حقوق کی جدو جہد کے لیے تیار کرنا ہے وہاں اس کسان تحریک کو اور اس جدو جہد کو شہروں کے محنت کش طبقوں کی سامراج اور سرمایہ دار دشمن تحریک اور جدو جہد کا حصہ بنانا بھی ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے صرف دیہات کے عوام اپنی جدو جہد میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس جاگیرداری نظام کوختم کرتے ہوئے انقلاب کا راستہ اختیار کیا جائے۔ جس کی منزل سوشلزم سے عبارت ہے جس سے پاکستان اور پاکستان کے عوام کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کسان کمیٹی کی تنظیم انتھک اور مسلسل اور باشعور جدو جہد کا تقاضہ کرتی ہے اس لیے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے ترقی پسندوں اور سچے انقلابیوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے کسان کمیٹی کی جدو جہد میں شامل ہوں۔ انتھک اور مسلسل جدو جہد کریں تا کہ جاگیرداری زرعی نظام کوختم کر کے زرعی انقلاب کی تکمیل کی جاسکے۔ کسان کمیٹی زندہ باد، کسانوں، مزدوروں اور انقلابی دانشوروں کا اتحاد زندہ باد۔

# ضمیمہ

پنجاب کی صوبائی حکومت نے اپنے بجٹ برائے سال ۷۶-۱۹۷۵ء میں تشخیص آبیانہ کا پرانا طریقہ منسوخ کر کے نیا طریقہ تشخیص اپنایا ہے اور اس تبدیلی سے آبیانہ کی مد میں حکومت نے ۷ کروڑ روپے کا اضافہ کر لیا ہے۔ تشخیص آبیانہ کا پرانا طریقہ تھا کہ جتنا رقبہ آبپاش ہو اس پر آبیانہ تشخیص کیا جاتا تھا اور آبیانہ کی شرح مختلف اجناس کے لیے مختلف تھی۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک آبیانہ کی شرح میں تین گنا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ اور چونکہ آبیانہ کی شرح میں اضافہ کسانوں کی قوت برداشت سے باہر تھا اور کسانوں میں بے چینی کا باعث بن سکتا تھا اس لیے حکومت نے آبیانہ کی تشخیص کے پرانے طریقے کو بدل کر نیا طریقہ تشخیص رائج کیا ہے اور اس طرح کسانوں پر سات کروڑ روپے سالانہ آبیانہ بڑھا دیا ہے۔ نئے طریقہ تشخیص کے اپنانے کا واحد مقصد شرع آبیانہ کے اضافہ کو اخفا کرنا ہے۔

آبیانہ کی تشخیص کا جو نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی رو سے آبیانہ کی شرح فی ایکڑ مندرجہ ذیل درجوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

۱۔ (الف) سالانہ نہری علاقوں اور سرکاری ٹیوب ویل سے آبپاش ہونے والے علاقوں میں ۱۲½/۱ ایکڑ سے کم اراضی کے مالکان سے آبیانہ -/۱۵ روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے وصول کیا جائے گا۔

(ب) ۱۲½/۱ ایکڑ اور اس سے زائد اراضی کے مالکان سے انہی علاقوں میں -/۲۵ روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

۲۔ (الف) اسکارپ کے علاقوں میں جہاں نہری پانی کے ساتھ سرکاری ٹیوب ویلوں کا پانی مہیا کیا جاتا ہے ۱۲½/۱ ایکڑ سے کم اراضی کے مالکان سے بیس (۲۰) روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

(ب) اور انہی علاقوں میں ۱۲½ ایکڑ اور اس سے زائد رقبے کے مالکان سے تیس (۳۰) روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

۳۔ (الف) ششماہی نہر کے علاقوں میں ۱۲½ ایکڑ سے کم اراضی کے مالکان سے آٹھ (۸) روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

(ب) اور انہی علاقوں میں ۱۲½ ایکڑ اور اس سے زائد اراضی کے مالکان سے بارہ (۱۲) روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

۴۔ منظور شدہ باغات کے مالکان سے چالیس (۴۰) روپے فی ایکڑ ششماہی کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔

صوبائی حکومت نے آبیانہ کی تشخیص کا نیا طریقہ اختیار کر کے اپنی آمدنی میں آبیانہ کی مد میں ۷ کروڑ کا اضافہ کر لیا ہے۔ چھوٹے مالک کاشت کاروں کے لیے نیا طریقہ تشخیص آبیانہ نے ناقابل برداشت حد تک بوجھ بڑھ گیا ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی اور پاکستان کسان کمیٹی نے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ ۱۲½ ایکڑ تک کے مالکان سے آبیانہ کی وصولی ختم کی جائے اور حکومت اپنی آمدنی کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پچاس ایکڑ سے زائد رقبہ کے مالکان کی شرح آبیانہ میں اضافہ کرے۔ نیز ۵۰ ایکڑ تک کے مالکان سے پندرہ (۱۵) روپے فی کاشتہ ایکڑ کے حساب سے آبیانہ وصول کیا جائے۔ ۱۲½ ایکڑ تک کے مالکان اراضی اس رعایت کے حقدار ہیں کیونکہ ان کی اراضی اتنی کم ہے کہ اس کی پیداوار سے وہ بمشکل اپنے خاندان کا گزارہ کر سکتے ہیں۔

## تاریخ سے مکالمہ

# پروفیسر فرانسس روبنسن

انٹرویو: زمان خان

---

سوال: آپ کی تاریخ میں دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟

جواب: جہاں تک مجھے یاد ہے میں شروع ہی سے مورخ تھا۔ مجھے شروع سے ہی یہ لگا کہ دنیا کو سمجھنے کے لئے یہ بہترین طریقہ ہے، بہترین ذریعہ ہے، وقت گذارنے کا بہت ہی عمدہ طریقہ۔ یہ میرے لئے بہت ہی ذاتی مسئلہ ہے، مگر بہت ہی اہم کام ہے لوگوں کے ساتھ ملنا، دوسروں کو سمجھانا، دوسرے وقتوں میں انسان ہونا کیسا تھا دوسرے وقتوں میں انسان کیسے تھے، دوسری جگہوں پر۔ میرے خیال میں اپنی انسانیت کے بارے میں جاننا اور دور حاضر میں اچھے طریقہ سے رہنا۔ یہ بھی بہت عزت افزائی ہے کہ طلبا کو تاریخ پڑھائی جائے، ان کے دماغ مختلف دنیا کے لئے کھولے جائیں، جس کے بارے میں ان کو علم نہیں تھا، اور انہیں علم حاصل کرتے دیکھنا، خوش ہونا اور پھر ان سے سبق سیکھنا اور پھر ان نتائج کو، سبق کو استعمال کرنا۔ اور یقیناً تاریخ کے بارے میں لکھنا بہت بڑا اعزاز ہے، بہت بڑی خوشی ہے، ماضی کو سمجھنے کے لئے ڈھانچہ بنانا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مجھے بہت لطف دیتا ہے جیسے کہ اس سے میری انا کی تسکین ہوتی ہے لیکن یہ شائد دوسروں کے لئے بھی سود مند ہو۔

سوال: آپ کو کس نے متاثر کیا؟

جواب: مجھے تین لوگوں نے متاثر کیا جو مجھے کیمبرج میں پڑھاتے تھے Walter Ullman نے متاثر کیا، جو medievalist تھے، ایک بہت ہی ذہین آدمی تھے، اصلی ہندوستانی Anil Seal جس نے مجھے جنوبی ایشیا کی دنیا میں دھکیلا، لیکن متاثر کرنے والوں میں سب سے اہم شخصیت Peter Brown کی تھی جس نے میری تعلیمی زندگی کو بڑھانے

میں بہت اہم کردار ادا کیا، جس کا شمار آج کی دنیا میں پانچ بڑے مورخین میں ہوتا ہے، وہ پچھلے تیس سالوں سے Princeton میں پڑھا رہا ہے، جس نے خود late antique histroy کو تخلیق کیا۔ جو کہ بہت بڑا تخیل ہے، جس کا تخیل بہت بڑا ہے، وسیع ہے، وہی ایک بہت بڑا دانشور اور فراخدل شخص ہے۔

سوال: آپ کی برصغیر میں دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟

جواب: میں نے ایک ایسی جگہ پڑھا جسے میں Imperial village of Willengton کہنا پسند کروں گا۔ جہاں والنگٹن کے نام سے چیر قائم ہے۔ جس کا جب انتقال ہوا تو میں چھوٹا تھا، جوان تھا مگر اس کی بیوی لیڈی ولنگٹن ابھی زندہ تھی جو کہ فالسیٔ، ہلکے ارغوانی رنگ کا لباس پہن کر چرچ کی ضیافتوں کا افتتاح کرتی تھیں۔ مگر گاوں کے ہر آدمی کا کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان سے تعلق تھا یا اس نے ہندوستان میں ملازمت یا کام کیا تھا سو وہاں پرانے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے رہتے تھے، مقامی چرچ کا آرگن بجانے والا پہلے کلکتہ کیتھیڈرل کا آرگن بجاتا تھا۔ میرے پریپ سکول چلانے والے کا تعلق آٹھویں گورکھا رائفلز سے تھا۔ میرے بچپن کی دوست کا دادا ہندوستان کی خفیہ ایجنسی کا آخری ڈائریکٹر تھا۔ میں اس سے مسلسل ملتا تھا، جس گھر میں، میں رہتا تھا وہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے بنایا تھا، مجھے گھر کے باغ سے ہندوستانی روپیہ ملتے تھے، سو اس لحاظ سے ہندوستان کا انتخاب بالکل صحیح تھا۔

جب میں کیمبرج پڑھنے گیا تو میں قرون وسطی کی اطالوی شہر ریاستوں پر ریسرچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، میں نے اطالوی زبان بھی سیکھ لی تھی اور اٹلی کے کئی چکر بھی لگا چکا تھا، اور زیادہ وقت گذارنے کے لئے تیار تھا۔ جب میں پڑھائی کے تیسرے سال میں تھا تو میں نے اپنی ریسرچ کی رہنمائی کے لئے ایک شخص ڈھونڈا جس کا نام Walter Ullman تھا، میں یہ چاہتا تھا کہ کسی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر، کئی سال تک تحقیق کروں۔ میں اپنے نگران Anil Seal کے پاس گیا، وہ میری بات کو فوراً سمجھ گیا اس نے مجھے کہا کہ اگر واپس آ کر تم میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہو تو میں کم از کم ایک سال کے لئے تمہیں فوراً ہندوستان بھیج سکتا ہوں۔ میں نے فوراً ارادہ بدل لیا کیونکہ میرے لئے

ہندوستان میں کام کرنا عام بات تھی، گو میں ہندوستان کبھی نہیں گیا تھا، جب کہ اٹلی انوکھا ،نرالا exotic تھا۔ ہندوستان کی طرف تبدیلی آسان تھی۔

سوال: سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حادثاتی تھا؟

جواب: ہاں حادثاتی۔

سوال: پھر آپ ہندوستان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

جواب: یقیناً ہندوستان اور پاکستان میرا دوسرا گھر ہے۔

سوال: کیا آپ اپنی کتاب Seperatism among the Indian Muslims پر نظر ثانی کرنا پسند کریں گے، خاص کر بنگلہ دیش کے قیام کے بعد؟

جواب: بنگلہ دیش کے قیام کے بعد میرا جواب ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ علیحدگی کی دلیل یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں علیحدگی، یا علیحدگی کا پتہ یا سیاست میں علیحدگی کا پلیٹ فارم، برطانوی راج کے وقت، ایک مخصوص گروپ نے کھولا تھا اور آگے بڑھایا تھا سو منٹو مورلے اصلاحات تک علیحدگی کے مفادات کو ہوا دینے والی یو پی کی اردو بولنے والی اشرافیہ تھی۔ جب آپ 1920 اور 1930 کی دہائی میں پہنچتے ہیں، درحقیقت اس وقت بہت کم لوگ علیحدگی کے حامی تھے۔ وہ جاگیرداروں اور بائیں بازو کی حمایت کرتے تھے۔ برطانوی راج کی سیاست میں علیحدگی کا پلیٹ فارم 1937 کے بعد قابل عمل ہوا۔ سو یہ حقیقت کہ پاکستان، بنگلہ دیش میں تقسیم ہو گیا اور پاکستان صرف مغربی پاکستان بن گیا، میرے لئے کوئی حیرانگی کی بات نہیں ہے۔

سوال: کیوں؟

جواب: کیونکہ آپ کو اس بات کو دیکھنا چاہئے کہ ایک مخصوص سیاسی قوت حرکت میں ہے۔ ایک موقع پر پرانے سرکاری نوکر پیشہ لوگ اور دوسرے موقع پر جاگیردار اشرافیہ نظر آتی ہے۔ اور پھر آزادی سے چند سال قبل اس اشرافیہ کو مسلمان عوام کی کثیر تعداد کی حمایت حاصل تھی۔ یہ سیاست میں دلچسپی کا پرانا موضوع ہے۔ ایک خاص موقع پر مفادات کے اشتراک کے نتیجہ میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ یہ کوئی حیرانگی کی بات نہیں ہے کہ ایک خاص موقع پر ایک خاص قسم کے نئے سیاسی پلیٹ فارم، کچھ مخصوص مفادات کی حمایت سے معرض وجود

میں آ جائیں۔ درحقیقت بنگلہ دیش کا قیام ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدگی کے رجحان کی دلیل کا ہی تسلسل ہے۔

سوال: لیکن بنگلہ دیش کی علیحدگی کی تحریک میں مذہب کو بطور نعرہ استعمال نہیں کیا گیا تھا؟

جواب: بالکل نہیں۔ 1923 تک کے عرصہ میں مذہب کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کمیونٹی کا نظریہ تھا، مسلم کمیونٹی کو استعمال کیا گیا تھا، جو کہ بہت مضبوط تھی کیونکہ برطانیہ نے اسے دوسروں سے الگ مفادی گروہ کے طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ مخصوص گروہ، مثال کے طور پر مسلمان نوکری پیشہ طبقہ salariat اور ضلعی اور میونسپل بورڈ اور صوبائی کونسل میں دلچسپی رکھنے والوں نے مسلمانوں کے لیبل کو اپنے اور مسلمانوں کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کیا۔ یہ ہرگز مذہب کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ آپ کی حیثیت اور مفادات کو صوبائی کونسل اور زیادہ نوکریاں حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ یہی سارا عمل بنگلہ دیش کی تحریک میں دہرایا گیا۔ ٹھیک ہے نا۔

سوال: آپ محمد علی جناح کی آئین ساز اسمبلی میں گیارہ اگست والی تقریر کو کیسے دیکھتے ہیں، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا؟

جواب: میرے خیال میں درحقیقت یہی ان کا مقصد تھا۔ اور سارا عرصہ وہ یہی کہتے رہے مگر یہ بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں یہ نہ ہوسکا۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جناح کی قلابازی تھی اور یہ جناح کے پہلے والے خیالات سے مراجعت تھی؟

جواب: نہیں، بالکل نہیں۔ کوئی قلابازی نہیں تھی نہ ہی پہلے والے خیالات سے انحراف تھا۔ یہ ان کے پہلے خیالات کا تسلسل تھا، جس طرح کے قانون پسند وہ تھے۔ یہ ایک سیکولر آدمی کی طرح جنہوں نے خاص طرح کی زندگی گذاری، اس کا عکس تھا۔ ایک وکیل جس کو کہ وہسکی شراب پسند تھی۔ اس کو Craven-A کے سگریٹ پسند تھے۔ یہ تقریر ان کے پرانے خیالات ہی کی عکاسی تھی۔ یا تسلسل تھا جس کا اظہار انہوں نے ساری زندگی کیا تھا۔

سوال: پھر قرارداد مقاصد کو کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب: اس کا جواز یہ ہے کہ جب قرارداد مقاصد منظور کی گئی اس وقت جناح کا انتقال ہو چکا تھا۔
میرے خیال میں قرارداد مقاصد پاس کروانے میں لیاقت علی خان نے بہت زور لگایا۔ میں یہ کہوں گا کہ یہ مسودہ سازی کے کمال کا نمونہ ہے لیکن اس قرارداد سے تنزل کا اور پھسلن کا راستہ کھل گیا۔

سوال: آپ برصغیر کے حالات سے بہت باخبر ہیں آپ آج ریاست پاکستان کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: 1947 میں پاکستان کے قیام کے وقت اس کے پاس بہت ہی بے کار، کمزور پتے تھے تاہم اس کے حصہ میں دنیا کی بہترین فوج آئی۔ برطانوی انڈین فوج کا بہترین حصہ آیا۔ اس کے پاس ہندوستان کا بہترین نہری زمین کا حصہ آیا۔ اس کے پاس کچھ شوگر فیکٹریاں تھیں۔ مگر اس کی سب سے بڑی اور بنیادی پارٹی مسلم لیگ کی پاکستانی عوام میں جڑیں نہیں تھیں۔ اس کا کوئی قابل شناخت، مرکزی نظام نہیں تھا۔ سرد جنگ کے آغاز نے حالات کو اور خراب کر دیا تھا۔ 49-1948 کی اس وقت کی ترقی کے بارے میں عائشہ جلال نے سب سے اچھی بات کی ہے۔ یعنی اس کے نتیجہ میں پاکستان کی فوج اور امریکہ کے درمیان ایک غیر اخلاقی رشتہ بن گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ، پاکستان میں مارشل لا کی حمایت کے لئے تیار تھا، 1958 سے لیکر آج تک، اپنے مفادات کی نگہداشت کے لئے ایسا ہوتا آیا ہے۔ وہ پتہ نہیں خوش تھے یا نہیں مگر جب ضیاالحق اقتدار میں آیا تو یقیناً انہوں نے ضیاالحق کی حمایت کی، وہ جنرل مشرف کی حمایت کے لئے تیار تھے تو یا ہر فوجی حکمران جب وہ اقتدار میں آیا انہوں نے اس کی مدد کی۔ انہیں سوویٹ یونین کی توسیع پسندی پر سخت تشویش تھی، اور پاکستان کے غلط قسم کے اتحاد میں جکڑے جانے کے بارے میں بھی سرد جنگ کی وجہ سے پاکستان کی ترقی میں بہت رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ اب جب کہ سرد جنگ ختم ہوگئی ہے تو حالات شائد بدلیں۔ مگر بدقسمتی سے سرد جنگ کے دوران آخری تدبیر سوویٹ یونین کا افغانستان پر حملہ تھا جس کے پاکستان پر بہت ہی بھیانک اثرات ہوئے اور جس سے پاکستان کمزور ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس حملے سے آپ کے ملک میں سیاست کے میدان میں کچھ لوگوں کو اچھے مواقع مل گئے مگر اس سے ملک کو بہت نقصان ہوا۔ اگر آدمی اخبار پڑھے تو اسے پاکستان کے حالات پر تشویش ہوتی ہے۔ لیکن میں جب

عام پاکستانیوں سے ملتا ہوں تو میں ان میں بہت رواداری اور ان کے بہت اچھے خیالات دیکھتا ہوں۔ لوگوں کی سوچ اور رویہ سے لگتا ہے کہ اگر انہیں موقع ملا تو وہ اچھا معاشرہ پیدا کریں گے اور غالباً جمہوریت کو بھی کامیاب بنائیں گے۔ مگر درحقیقت 1947 سے آج تک آپ کو جمہوریت کو کامیاب یا ناکام بنانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا، اس میں شک نہیں کہ کامیابی کے ساتھ ناکامیاں بھی ہوتی ہیں، کیونکہ دوسرے لوگوں نے آپ کے مقدر کے ساتھ بہت کھیلا ہے۔

سوال: کچھ لوگ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت مایوس ہیں۔ وہ اس کو ناکام ریاست کہتے ہیں۔ آپ بطور مورخ اور برصغیر کا بہت قریبی مشاہدہ کرنے خاص کر پاکستان پر گہری رکھنے والے کے، حالات کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کس ٹائم فریم میں چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ آج سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد جبکہ دنیا کی علاقائی سیاست کی بساط دوبارہ بچھائی جارہی ہے اب بین الاقوامی تعلقات کی تعمیر نو میں امریکہ اور مغرب عمومی طور پر اتنے اہم نہیں رہے ہیں۔ ہندوستان، چین اور کچھ اور ملک اہم ہو گئے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کیا رخ اختیار کریں گے اور کس طرح پاکستان کیسے ترقی کرے گا۔ مگر مجھے امید ہے کہ ہندوستان اور چین کی ترقی اور دونوں میں مثبت مقابلہ کے نتیجہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تنازعات کچھ کم ہو جائیں گے، خاص کر ہندوستان کی طرف سے۔ میرے خیال میں تجارت میں اضافہ ہو گا، جو میری نظر میں دونوں ممالک میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے بہت ہی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سارے مسئلہ میں اہم اور بنیادی چیز آپ کی فوج کا رویہ ہے ان کے موجودہ صورت حال میں بہت زیادہ اور بڑے بنیادی مفادات ہیں، اور شائد وہ تبدیلی کو اچھی نظر سے نہ دیکھیں۔ ایک بنیادی قدم فوج کو اٹھانا ہے اور وہ یہ سوچ کہ ہندوستان سے مخاصمت ان کے اپنے مفاد میں نہیں ہے۔ مگر موجودہ حالات میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے معاشرے کی عسکریت بندی اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جس کی وجہ سے ترقی رک گئی ہے اور یہی امر خوش حال اور معتدل معاشرے کے قیام میں سب سے

بڑی رکاوٹ ہے۔

سوال: آپ نے اپنی تقریر میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ویزے کے حصول میں آسانی کی بات کی۔ کیا آپ دونوں ممالک کے درمیان مستقبل میں امن دیکھتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں سیکورٹی کے مسائل کی وجہ سے ہر چیز بہتر ہونے کی بجائے خراب ہورہی ہے اور ویزہ کے حصول میں آسانی اس وقت تک پیدا نہیں ہوگی جب تک کہ دہشت گردی اور جنگی جنون میں کمی نہیں آئے گی۔ مگر ویزہ کے حصول میں آسانی پیدا ہونی چاہئے۔ اس سے تجارت بڑھے گی اور سیاحت میں اضافہ ہوگا۔ بنیادی طور پر ہندوستان، ہندوستان کا بہت بڑا حصہ پاکستان کا قدرتی مضافاتی علاقہ ہے اور پاکستان کا بہت بڑا حصہ ہندوستان کا مضافاتی علاقہ ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔

سوال: آپ مشرق وسطیٰ میں ہونے والی تبدیلیوں کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ بہت دلچسپ ہیں اور بہت ہی جوش پیدا کرنوالی ہیں۔ ہر وہ لمحہ جس میں امید کی کرن پیدا ہو، بہت کثیر تعداد میں نوجوان لوگوں کی تمناؤں، حوصلوں اور خواہشات کی عکاسی کرتا ہو، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم سرد جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کی تعمیر نو ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ مغرب میں 90-1989 میں آہنی پردے کے گرنے کو دیکھیں جس کے بعد بہت ساری آرانہ حکومتوں کا خاتمہ ہوا، جن کا وجود اس لئے تھا کہ وہ امریکہ اور خطہ میں دوسری بڑی طاقت کے مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ سو اصولی طور پر اس بات کی امید کی جاسکتی ہے۔ مگر مشرق وسطیٰ کو اپنا فیصلہ کرنے میں بہت دانشمند، معقول اور انصاف پسند ہونا چاہئے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہے کہ مبارک جاچکا ہے مگر مصر کا نظام ابھی جوں کا توں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ مصر میں جمہوریت پسند، اپنے ارادوں میں مستحکم رہتے ہیں اور مبارک کی باقیات کو جمہوریت قائم کرنے کے لئے قائل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ شاید انقلاب کی جانب پہلا قدم ثابت ہو۔ سو میرے خیال کے مطابق مشرق وسطیٰ میں تبدیلی، جسے میں مغربی ایشیا کہنا پسند کروں گا، کو بہت عرصہ لگے، شائد نئے ملکوں میں یہ لہر پہنچ جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں بہت ہی اہم بات عام عرب آدمی کی آواز ہے جو

مستقبل میں مغربی ایشیا کے ممالک کی سیاست میں بہت اہم کردار ادا کرے گا اور یہ عرب اسرائیل کا سیاق وسباق تبدیل کردے گا۔آپ یہ دلیل دے سکتے ہیں جو بھی دن گذرتا ہے اس میں عرب عوام اپنے ملک کا انتظام چلانے میں زیادہ طاقتور ہورہے ہیں اور اسرائیل کی ریاست کمزور ہورہی ہے اور اگر اسرائیلی سمجھدار ہوں تو جلد از جلد فلسطین سے سمجھوتا کرلیں، کیونکہ جس فیلڈ پر وہ کھیل رہے ہیں وہ کم موزوں ہوتا جائے گا۔

سوال: امریکہ اور یورپ میں اسلام کا خوف طاری ہے اور اب فرانس نے بھی پردہ پر پابندی لگادی ہے۔آپ برطانیہ کے شہری ہونے کی ناطے ان چیزوں کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہنگاموں میں خیبر پختونخواہ میں دور سے چیزیں بہت خراب لگتی ہیں۔ پریس، اسلام فوبیا کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے میرا خیال نہیں ہے کہ وہاں مسلمان اپنے آپ کو اسلام فوبیا کا شکار سمجھتے ہیں۔ بہت سارے مسلمانوں نے یہاں سیاست میں بہت بڑا مقام حاصل کیا ہے۔ کنزرویٹو پارٹی کی چیئر پرسن بیرونیس وارثی ایک مسلمان خاتون ہے۔ لیبر پارٹی میں بیرن علی اہم مقام رکھتے ہیں اور اس طرح اور بہت سارے لوگ ہیں۔اسلام فوبیا بہت ہی سخت لفظ ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ جیسے کپڑے چاہیں پہن سکتے ہیں، لباس پر کوئی پابندی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مغرب والوں پر عوامی جگہوں پر ننگے پھرنے پر پابندی ہے جیسے کہ مسلمانوں پر یہ پابندی ہے عام جگہوں پر کسی حوالے سے کہ وہ جو ضرورت سے زیادہ کپڑے پہنا چاہتے ہیں۔ سو سیکورٹی کے نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ عورت اپنا چہرہ دکھائے، تعلیم کے شعبہ میں بھی یہ ضروری ہے کہ عورتیں اپنا چہرہ دکھائیں۔اس کے علاوہ ہمارا خیال ہے کہ عورتوں کو اجازت ہونی چاہئے کہ وہ جیسا لباس چاہیں پہنیں۔فرانس کا الگ مسئلہ ہے۔

جہاں تک اسلام فوبیا کا مسئلہ ہے، سیکورٹی کے مسئلہ کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں مقامی دہشت گردی کا مسئلہ ہے جس کا عام طور پر تعلق پاکستان سے نکلتا ہے۔مگر اس کے باوجود اس کے نتیجہ میں ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا جیسا کہ امریکہ میں ہے، جہاں نام نہاد مسلمان شکل وصورت اور شباہت رکھنے والے مسافروں کو یا

جو کوئی مختلف زبان بولتے ہوں ان کو جہاز سے اتار لیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں دہشت گردوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کو مسلمانوں کی نمائندہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ برطانیہ کے معاشرہ میں مسلمان ہر شعبہ میں متحرک ہیں اور ہر قسم کے کام کرتے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو مسلمانوں کی موجودگی خصوصی اہم ہے۔ وہ ملک میں ہر جگہ ہیں اور اچھے ہمسایہ ہیں اور معاشرے کے مفید شہری سمجھے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ فرانس میں مسئلہ زیادہ سنجیدہ ہے۔ ایک سیکولر دائرہ کار عوامی (public space) فرانس کی شناخت کا لازمی حصہ ہے، یہ فرانسیسی انقلاب کا شاخسانہ ہے، سو مذہبی نشانات عام جگہوں پر پہننا لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد روایات اور رویوں کا مسئلہ پیدا ہونا قدرتی بات ہے جب مختلف پس منظر والے اکٹھے ہوں گے، ملیں گے تو اس بات کو طے کرانا ہم کیسے اکٹھے رہ سکتے ہیں میں وقت لگتا ہے۔ فرانس اور برطانیہ میں مجھے نہیں لگتا کہ مستقبل بعید میں یہ کوئی مسئلہ ہوگا۔ فرانس میں کافی خواتین شمالی افریقہ کا پس منظر رکھنے والی وزیر ہیں۔ سو اس اختلاط میں اتار چڑھاو ہوتا رہتا ہے۔ ہم صحیح سمت میں رواں دواں ہیں۔

سوال: آپ ہمارے نوجوانوں سے ملے ہیں، خاص کر طلبا سے اس ہفتہ اور پہلے بھی ملتے رہے ہیں آپ نے ان کو کیسا پایا؟

جواب: میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں پاکستانی جوانوں کے بارے میں رائے زنی کروں۔ میں نے ان کو اس نظر سے نہیں جانچا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہونہار ہیں اور ان میں تجسس ہے، جیسے کہ سب نوجوان طلبا ہوتے ہیں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ پرامید ہیں اور ان میں لیاقت، استعداد اور صلاحیت ہے۔ مجھے طلبا کے کئی گروپوں نے انٹرویو کیا ہے، میں ان کی لیاقت سے لطف اندوز ہوا ہوں میں اسی کے ساتھ یہ بات بھی کہوں گا کہ مستقبل کے بارے میں مجھے ان کی مایوسی سے لطف نہیں آیا، وہ زیادہ پرامید ہو سکتے ہیں۔ مگر آپ کے طلبا دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہیں ہیں، ہونہار، پرامید اور مستعد۔

# پاکستان کے وہ کتب خانے، جنہیں میں نے دیکھا

ثمینہ حسنین

تلخیص

لائبریریز کی اہمیت وافادیت تحقیقی کام میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے، لیکن عام طور سے لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اکثر تحقیقی کام کے سلسلے میں رجوع کرنے والے خود بھی ان لائبریریز کا اس حوالے سے مشاہدہ نہیں کرتے کہ وہ اپنی فوری ضرورت کی چیزوں کے علاوہ بھی اس لائبریری کے دیگر پہلوؤں کی اہمیت اور اس کی کلیدی حیثیت کو جان سکیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اگر چہ ایک طرف تحقیق میں لائبریریز کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اگر شعوری طور پر مشاہدہ کیا گیا ہوتا تو اس قسم کے مضمون کی اہمیت کافی بڑھ جاتی۔ بہر حال مضمون میں کتابیات کے ایک چھوٹے سے حصے کو شامل کر کے لائبریریز کی موجودہ زمانے میں باقی ماندہ اہمیت اور اس سلسلے میں ان پر ہونے والے کاموں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجھے اپنے مقالے کی تیاری کے دوران پاکستان کی کئی لائبریریز میں کام کرنے کا موقع ملا، جن کو میں نے اپنے تحقیقی کام [محسن الملک: حیات اور فکر] کے دوران دیکھا اور استعمال کیا تھا، لہذا میں نے یہ مناسب سمجھا* کہ نووارادنِ تحقیق کو چند ایسی لائبریریز کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں جن سے وہ مستفید ہو سکیں۔ ایسی لائبریریز جو اکثر مشہور نہ ہونے کی وجہ سے یا اپنی کتب و رسائل وغیرہ کے ذخیرے کی عدمِ شہرت کی وجہ سے طالب علم کی توجہ حاصل کرنے سے قاصر رہ

جاتی ہیں۔

اس حوالے سے جب میں نے ان لائبریریز کے بارے میں اپنی یادوں کو مجتمع کرنے کا آغاز کیا تو مجھے رضا علی عابدی کی تصنیف کتب خانہ یاد آ گئی اور اس کو دیکھنے کے بعد مجھے اس موضوع پر لکھنے کے لئے پہلے سے زیادہ اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ کیونکہ کتب خانہ کی طرح کی کوئی تحریری یادداشت میرے پاس موجود نہیں تھی جسے میں اپنے مضمون کی بنیاد بنا سکتی، اس لئے کہ جب میں نے اپنے کام کے سلسلے میں ان لائبریریز میں کام کیا تو میرے ذہن میں کہیں دور دور تک یہ بات نہیں تھی کہ کبھی میری یہ دوست کوئی ایسا مضمون لکھنے کی فرمائش کر دیں گی۔ لیکن ان کا یہ غیر متوقع تقاضہ میری اس کمزوری کو شاید زیادہ دیر تک مخفی نہ رکھ سکے کہ ذہن میں مضمون لکھنے کا کوئی خیال نہ ہونے کے باوجود بھی ان لائبریریز میں موجود مختلف موضوعات پر کتابوں کے انبار میں صرف اپنے مطلب کے مواد کی دستیابی ہی میرے پیشِ نظر نہیں ہونا چاہیئے تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ بھی میری ذمہ داری تھی۔ اور وہ یہ کہ ان لائبریریز میں موجود کتابوں وغیرہ کے ذخائر کا حال مجھے معلوم ہونا چاہیئے تھا، خواہ وہاں میرے کام کی کوئی کتاب ملی ہو یا نہیں، کسی لائبریری میں موجود مواد کے بارے میں معلومات نہ صرف اس قسم کے کسی مضمون کی تیاری میں معاون ہوتی جس سے تحقیق کرنے والے طلباء مستفید ہوتے بلکہ خود میرے مزید تحقیقی کام کے لئے کتنی سودمند ہوتی۔

بہر حال اب پہلی تحقیق کی پہلی بڑی غلطی کا ازالہ کیسے ممکن ہو؟ شاید تحقیق کے میدان میں اترنے والے طالبانِ علم کو ان لائبریریز کی معلومات فراہم کر کے جو میری یادداشت میں محفوظ رہ گئی ہیں اور جن میں رکھی قیمتی کتابیں متلاشیانِ علم کے انتظار میں بوسیدہ ہو رہی ہیں۔ ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ راولپنڈی جیسے چھوٹے سے شہر میں بھی نہ جانے کتنے پرانے کتب خانے، پرانی اور نئی کتابیں اپنے دامن میں سمیٹے موجود ہیں۔ بار بار خیال یہی آتا ہے کہ جس طرح اجاڑ موسم میں پرندے کہیں دور چلے جاتے ہیں وہی حال کہیں ان کتابوں کا بھی نہ ہو(۱)۔

بہر حال، پاکستان کی ان لائبریریز میں کتابوں کی تلاش کے سلسلے میں مجھے جو تجربات ہوئے انھیں اس مضمون کی وساطت سے تحقیق کے طلب گاروں کے ساتھ share کیا جائے تو شاید میری اس چھوٹی سی کوشش سے وہ کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔

میں نے تحقیقی میدان میں اپنی تلاش و جستجو کے سلسلے کا آغاز، ۹۰ء کی دھائی میں، کراچی

کی لائبریریز سے کیا۔ کراچی یونیورسٹی کی تین لائبریریز میرے استعمال میں رہیں۔ان میں سے ایک پاکستان اسٹڈی سینٹر کی لائبریری تھی، جہاں میرے موضوع، ''برِصغیر میں جدید اسلام'' کے مختلف موضوعات، پر جدید اور کچھ کم جدید کتابیں موجود تھیں۔لہٰذا میرے پڑھنے اور مواد جمع کرنے کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔اس لائبریری کی کتابوں کا کمال یہ تھا کہ یہ نہ گمتی تھیں نہ پھٹتی ، بلکہ داغ دھبے لگنے سے بھی محفوظ تھیں۔دراصل یہ کمال اس اس لائبریری کی لائبریرین کا تھا جن کی نظران کتابوں پر ایسی سخت تھی کہ کبھی کبھی یہ کہنے کو دل چاہتا تھا کہ ایسی سخت نظر اللہ کسی کو نہ دے! مگران کے ادارے پر یہ ان کا بڑا احسان ہے کہ وہ ہر سال لائبریری کو دی جانے والی وہ %5 رقم بچا لیتی ہیں جو کتابوں کے پھٹنے اور کھونے وغیرہ کی مد میں ہر لائبریری کو دی جاتی ہے! ساری لائبریری کو ریفرنس لائبریری بنا دینا اس بات کو عملی طور پر ممکن اور یقینی بناتا ہے کہ ہماری مطلوبہ کتابیں وہاں موجود ہوں گی۔اس لائبریری میں پاکستان، ہندوستان سے متعلق تاریخ، ادب، سماجیات، سیاسیات، معاشیات، الٰہیات وغیرہ پر کتابیں ہیں۔اس کے علاوہ ریفرنس کتب، انسائیکلوپیڈیاز، اور رسائل بھی یہاں ہیں۔اور کتابوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے میں یقیناً ان لائبریرین صاحبہ اور ان کے ادارے کی بڑی محنت شامل ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک ہسٹری، (جس سے میرا تعلق بھی ہے) کی سیمینار لائبریری میں بھی ۹۰ء کی دہائی تک قرونِ وسطائی اور جدید اسلامک ہسٹری پر کافی اچھی نئی پرانی کتابیں موجود تھیں اور اپنے تحقیقی کام کے لئے میں نے اس لائبریری سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کراچی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری، جو محمود حسین لائبریری کہلاتی ہے اور جو غالباً کراچی کی سب سے بڑی اکیڈیمک لائبریری بھی ہے، اس میں کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ پرانی بیش بہا کتابیں یہاں موجود ہیں جو بسا اوقات غلط جگہ پر رکھ دیئے جانے کی وجہ سے آسانی سے نہیں ملتیں مگر جو اس کے اولین لائبریرین ڈاکٹر معید کی دلچسپی اور کاوش کا نتیجہ ہیں۔اس لائبریری میں وہ نئی کتابیں بھی موجود ہیں جو مختلف علوم کے بارے میں جدید تحقیقات سے ہمیں باخبر رکھتی ہیں، مگر یہ بات قابلِ فکر ضرور ہے کہ لائبریری میں نئی کتابوں کی آمد اور ان کو منگوانے کا سلسلہ اب رکتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔اس بے توجہی کی کوئی بھی وجہ ہو لیکن اس بڑی اور اہم لائبریری کے حوالے سے یہ امر کسی اچھے شگون کا مظہر نہیں ہے اور لائبریری کے عملے اور ارکان

ونگران کو اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس لائبریری میں بہت سے ذاتی ذخیرے (personal collection)، نایاب کتب (rare books)، سمعی و بصری ( audio visual)، اور قائداعظم سیکشن کے علیحدہ علیحدہ حصّے ہیں جو بہت سی قیمتی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں سے پُر ہیں۔رسائل کا حصّہ میگزین سیکشن کے نام سے الگ موجود ہے جس میں معیاری رسائل و جرائد کے نئے پرانے شمارے موجود ہیں مگر اکثر و بیشتر شروع، درمیان یا آخر کے کئی شمارے مفقود ہیں۔ ریفرنس روم میں اگرچہ انسائیکلوپیڈیاز، ڈکشنریز، ایئر بکس، انڈیکسس، فرہنگیں، گزٹیئر کا اچھا ذخیرہ موجود ہے مگر ان میں سے کئی کے نئے ایڈیشنز اور کئی زبانوں کی ڈکشنریز کی لائبریری کو ضرورت ہے، جس کی طرف فوری توجہ دینا ضروری ہے۔اس لائبریری کا تمام عملہ بے حد پُرخلوص اور تعاون کرنے والا ہے۔

کراچی کی دیگر لائبریریز میں بیدل لائبریری [شرف آباد] تمام کی تمام علمی اور ادبی رسائل پر مشتمل لائبریری ہے اس وجہ سے اس کی دیگر لائبریریز میں اپنی ایک انفرادی حیثیت و اہمیت ہے۔بہادر یار جنگ اکیڈمی [دھوراجی، بہادرآباد] میں اچھی اور نایاب کتابیں ہیں، رضا علی عابدی کی سوانح کارنامئہ سروری مجھے وہیں سے ملی اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں کی فوٹو کاپیاں میں نے یہاں سے لیں۔ایجوکیشنل کانفرنس [ناظم آباد] کی لائبریری میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی دستاویزات، مدرسہ عالیہ کی دستاویزات اور رسائل کی شکل میں مواد موجود ہے، مگر یا تو دستاویزات نامکمل ہیں یا نظم وضبط کی کمی اور اس لائبریری کے بکھرے ہونے کی وجہ سے چیزیں تتر بتر ہیں، کچھ سال پہلے میں دوبارہ جب وھاں گئی تو اس وقت لائبریری میں renovation قسم کی کوئی چیز ہو رہی تھی پتہ نہیں اب اس کا حال بہتر ہوا ہے یا نہیں۔لیاقت نیشنل لائبریری کے rare collection سب اسلام آباد آرکائیوز میں منتقل ہو چکے ہیں اس لئے اب یہ لائبریری صرف نئی کتابوں پر مشتمل ہے۔اس وجہ سے مجھے لائبریری سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ہی ملا۔

کراچی کی لائبریریز میں خالق دینا ہال میں ایک لائبریری ہے، یقیناً بلدیہ کی عمارت میں بھی لائبریری ہوگی، اسٹیٹ بنک میں ایک لائبریری موجود ہے۔چونکہ یہ لائبریریز میری نظر سے گزری ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ تحقیق کرنے والے طالب علم اگر ان کا رخ کریں اور یہاں چھپے علم کے خزانوں سے اپنی تحقیق کو مستفید کریں تو ان کے حق میں کیا ہی اچھا ہو، افسوس

کے ہمارے ہاں تحقیق میں اضافے کی جگہ کمی ہوتی جارہی ہے،اور رضا علی عابدی کے الفاظ میں '۔۔۔علم، تحقیق،اور جستجو کا وہ دور گیا جب لوگ ضرورت پڑنے پر چین تک چلے جاتے تھے۔یہ تن آسانی کا زمانہ ہے۔لوگ دنیا زمانے کی ریسرچ اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھ کر کر لینا چاہتے ہیں'(۲)۔

کراچی کے بعد میں اپنے مواد کی تلاش میں لاہور کی چند لائبریریز سے بھی مستفید ہوئی۔میں نے پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے، جو بہت پرانی اور قیمتی کتابوں سے مالا مال ہے،اپنی تلاش کا سلسلہ شروع کیا۔ غالباً وھاں میں نے سرسید کی تفسیر پر،ان کے اور محسن الملک کے درمیان ہونے والے مباحث کی فوٹو کاپیاں کرائیں۔لاہور کی ایک اور قدیم لائبریری پنجاب پبلک لائبریری کا شمار بھی اپنی قدامت کی وجہ سے نایاب کتابوں اور اخبارات و رسائل پر مشتمل لائبریریز میں کیا جاتا ہے، یہاں میں نے محسن الملک کے ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات کا مجموعہ،اور روزنامہ پیسہ اخبار سے کچھ مطلوبہ مواد حاصل کیا، یہ دونوں چیزیں میرے کام کے حوالے سے بڑی اہم تھیں۔لاہور ہی میں سردار دیال سنگھ لائبریری جانے کا موقع بھی ملا، جس کا حال کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ یہ تینوں لائبریریز قیامِ پاکستان سے پہلے کی ہیں،ان میں پرانی کتابیں، مخطوطے،اور دیگر مختلف تصنیفی اصناف سے متعلق مواد موجود ہے۔لاہور کی نئی اور جدید قائداعظم لائبریری بھی میں نے دیکھی۔

لاہور کے بعد اسلام آباد، جہاں مجھے اپنے کام کے لئے چند سال گزارنے کا موقع ملا۔وھاں میرے موضوع کے لئے سب سے اہم اور بڑی لائبریری اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی تھی، جو مرگلہ کی خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں فیصل مسجد کے ساتھ موجود قدرت کا حسین نظارہ پیش کرتی ہے۔اور دورانِ مطالعہ یہاں ہم قدرت کے مناظر سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔بہر حال، اس لائبریری میں اسلام اور اسلام کے دیگر موضوعات پر نئی اور پرانی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے،اگر چہ یہ لائبریری بھی کراچی کی زیادہ تر لائبریریز کی طرح قیامِ پاکستان کے بعد ۶۰ء کی دھائی میں بنی مگر اس کم عمری میں بھی اس میں موجود قدیم و جدید کتب و رسائل کا بڑی تعداد میں ملنا ایک قابلِ تعریف امر ہے۔کیونکہ مجھے اس لائبریری میں تواتر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا،اس لئے کوئی اس لائبریری سے میرے کسی تعصبانہ رویہ کی بو محسوس کرے تو

شاید غلط نہ ہو، یہاں کتابوں کی دستیابی میرے لئے بہت آسان رہی یہ سہولت اولاً تو میرے استاد ڈاکٹر حسن قاسم مراد کی وجہ سے حاصل رہی ،مگر بعدازاں لائبریری کے تمام عملے کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ یہاں سیرتِ نبویؐ کے متعلق کتابوں کا حصّہ الگ ہے، میگزین کا حصّہ بھی الگ ہے، اس لائبریری کی وسعت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، جو بعض اعتبارات سے کراچی یونیورسٹی لائبریری سے بہتر ہے۔

قائداعظم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری اور خاص طور سے اس کے ذاتی ذخیرے (personal collection) کے حصّے میں بہت سی اچھی کتابیں ہیں ،ان سے مجھے بھی استفادے کا موقع ملا۔ یہاں میری ملاقات ڈاکٹر تنویر انجم سے ہوئی جو اس یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ ہیں اور ان دنوں ہندوستان میں چشتیہ سلسلے پر اپنی تحقیق مکمل کرنے میں مصروف تھیں۔ یہیں سکھر کے ایک اسکالر سے، جو اس یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سنٹر میں اپنی تحقیق میں مصروف تھے، ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ بڑے خلوص سے ملے۔

اسلام آباد آرکائیوز کی لائبریری چونکہ سرکاری دفتر کے بڑے کمپاؤنڈ میں ہے اسی لئے یہاں کا ماحول بھی سرکاری رنگ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوا۔ وھاں ہمیں اپنے مواد تک پہنچنے میں آسانی سے کامیابی نہیں ہوئی، نہ ہی جدید ٹیکنالوجی میں بند مائیکروفلمز میں موجود مواد کو ہم اپنے لئے کھلوا سکے۔ آرکائیوز کے ہر حصّے سے جواب یہی ملا کہ وہ خاص آدمی جس کے ذمے اس حصّے کے فرائض ہیں، موجود نہیں ہے۔ اس لئے ہم وھاں نہ نفوس سے تعلق بنا سکے نہ ذخائر تک پہنچ سکے۔ لیکن ہمیں یقین سا ہے کہ وھاں ہمارا کچھ نہ کچھ مواد ضرور ہوگا۔

اسلام آباد کی نیشنل لائبریری ، جو وزیرِاعظم سیکریٹیریٹ کی خوبصورت عمارت کے ساتھ ہے مگر جو خود اپنی وسیع عمارت، سبز پہاڑوں اور درختوں کے جھنڈ میں خوبصورت منظر کے ساتھ کھڑی پڑھنے والے کو اپنے حصار میں قید کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس میں کتابوں کا روز بروز بڑھنا اس کی خوبصورتی اور حسن میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہاں بھی موجود کتابوں کا حصول ایک نظام کے تحت آسانی سے ہو جاتا ہے۔

اسلام آباد میں ہی مقتدرہ قومی زبان اور اکیڈمی ادبیاتِ اردو کی لائبریریز بھی اس لحاظ سے اچھی اور اہم ہیں کہ ان دونوں اداروں کے ذمے دار لوگ اپنی لائبریریز کی نشوونما بڑی محنت

سے کر رہے ہیں۔ میں نے ان دونوں ہی لائبریریز میں وقت گزارا اور کام کیا ہے۔ اسلام آباد میں ہی ایک اور لائبریری ادارہ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان کی ہے یہ چھوٹی سی لائبریری بہت اچھے حال میں تو نہیں ہے مگر یہاں کتابیں اچھی ہیں، فارسی کی کافی کتابیں موجود ہیں، میں بھی فارسی کی ایک پرانی کتاب تلاش کرتے ہوئے وھاں پہنچی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ کتاب حاصل کرنے پر جو روحانی خوشی طالبِ علم کو ہوتی ہے اس کی اہمیت سے وہی واقف ہوتا ہے۔ اس ادارے کے بارے میں رضا علی عابدی کا کہنا ہے کہ 'انھوں نے مخطوطات کی خاصی بڑی تعداد جمع کی ہے اور ان کی فہرستیں بھی چھاپی ہیں۔۔۔' (۳)۔ اسلام آباد کی ایک نومولود لائبریری سرسید میموریل اکیڈمی میں ہے جس کی نشو ونما بھی خوب ہو رہی ہے خاص طور سے یہاں کے منتظمین ہندوستان سے نئی نئی کتابیں لانے میں خوب مشاق ہیں وہ اکثر اپنی لائبریری کے لئے کتابیں لانے ہندوستان جاتے ہیں۔ مجھے بھی اس لائبریری سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور کافی نیا مواد جو پچھلے سالوں میں علیگڑھ تحریک اور اس کے رہنماؤں کے متعلق ہندوستان میں شائع ہوا، میں نے وہیں سے حاصل کیا۔ ان لائبریریز کے علاوہ اسلام آباد کی ایک اور چھوٹی سی مگر کسی قدر ہمارے لیے اہم لائبریری نیشنل انسٹیٹیوٹ آف بینکنگ اینڈ فائنانس[NIBAF] کی تھی۔ اس میں اگر چہ ہمارے موضوع سے متعلق کتابیں کم تھیں کیونکہ یہ اسٹیٹ بینک کا ایک تربیتی ادارہ ہے جہاں بینکوں کے عملے کو تربیت دی جاتی ہے۔ مگر پڑھنے لکھنے کا ماحول یہاں بہت ہی اچھا ہے۔ ہمارے لیے یہ لائبریری بہت اہمیت کی حامل اسی لیے ہوگئی کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اس کا پڑھنے لکھنے کا دورانیہ تھا اور ٹھنڈے ماحول میں پڑھنے لکھنے کا اتنا اچھا ماحول شروع کے دنوں میں ہمیں اسلام آباد میں کہیں اور نہیں ملا۔ اور رات آٹھ بجے بھی جب لائبریرین کی طرف سے ہمیں وارننگ ملتی تو ہم اٹھتے اٹھتے ساڑھے آٹھ بجا ہی دیتے تھے۔ اس لائبریری کے لائبریرین حسین صاحب اور محترمہ رباب صاحبہ نے ہمارے ساتھ جتنا تعاون کیا وہ ایک بہت ہی اہم امر ہے۔ چونکہ یہاں تربیت لینے والے عملے کے لیے رہنے کا انتظام بھی تھا لہٰذا ان کے کھانے کا انتظام بھی تھا۔ اس سے ہم بھی فائدہ اٹھاتے اور کھانا تو مہنگا ہونے کی وجہ سے ہم نہیں کھا سکتے تھے مگر دن میں کئی دفعہ چائے ضرور پیتے تھے۔ یہاں لوگوں سے ہمیں بہت تعاون ملا۔

آخر میں راولپنڈی، جو اسلام آباد کا جڑواں شہر کہلاتا ہے، جسے ایک چھوٹا اور پرانا

شہر سمجھ کر ہم اسلام آباد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں دیتے مگر اس بات سے کسی طرح انکار ممکن نہیں کہ اس کی اپنی الگ انفرادی حیثیت ہے۔ اس کے اندر لائبریریز کا وجود بھی اس کی ایک ایسی ہی انفرادی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ چند پرانی کتابوں کی تلاش کے لئے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے لائبریرین نوروز صاحب نے مجھے گورڈن کالج راولپنڈی کی لائبریری دیکھنے کا مشورہ دیا۔ جب میں وھاں پہنچی تو ایک اندھیری سی لائبریری پرانی کتابوں کی الماریوں سے بھری میری منتظر تھی اور لائبریرین نشاط صاحب نے، جو اتفاق سے کراچی یونیورسٹی کے لائبریری سائنس کے ایم اے پاس اور اس سے بھی زیادہ اتفاق یہ کہ میرے ہی ساتھ کے پاس آؤٹ بھی، مجھے فوراً پہچان لیا، ایک صاحب کے ہمراہ مجھے کتابوں کی الماریوں تک پہنچوایا، اس کے بعد میرا کام تھا کہ میں ان میں اپنی مطلوبہ کتابوں کو ڈھونڈ نکالوں، کافی دیر کی تلاش کے بعد ایسا لگنے لگا کہ یہاں مطلوبہ کامیابی ممکن نہیں۔ البتہ پرانی نایاب کتابیں یہاں موجود ہیں مگر گرد وغبار میں اٹی اور دھوپ اور روشنی نہ ملنے کے باعث جلد ہی خراب ہو جائیں گی، لہٰذا ان کی دیکھ بھال کا بھی کوئی فوری ذریعہ ہونا چاہیئے۔ شہر راولپنڈی میں، میں نے جو لائبریریز دیکھیں ان میں ایک بلدیہ، لیاقت باغ، اور ایک غالباً قائداعظم کے نام سے لائبریری تھی، ان میں بھی پرانی اور نئی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی یہاں لائبریریز ہیں اور لگتا ہے کہ کم از کم ایک دو لائبریریز اور بھی میں نے دیکھیں ہوں مگر کچھ کے نام میں بھول گئی ہوں۔ بہر حال، یہ تمام چھوٹی چھوٹی لائبریریز تحقیق کرنے والے طالبِ علم کے لئے بہت اہم اور قیمتی سرمایہ ہیں جہاں وہ علم کی تلاش میں آسکتے ہیں۔

دورانِ تحقیق میں اپنے نجی کام کے لئے شارجہ [یو اے ای] گئی تو وہاں میں نے شارجہ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری دیکھی، لیکن اس کو صرف دیکھنا ہی مقصد نہیں تھا بلکہ اصل مقصد عربی کی کچھ کتابیں دیکھنا تھا، وہاں بھی میں نے قسمت آزمائی اور کامیاب ہوئی۔ یہ یونیورسٹی اور اس کی لائبریری کافی وسیع ہیں عملہ اگرچہ عربی بولنے کو اولیت دیتا ہے مگر تعاون کرنے والا ہے۔ یہاں اس لائبریری کا ذکر یوں ضروری معلوم ہوا کہ اکثر ہم نجی حوالے سے، دورانِ تحقیق، باہر جاتے ہیں مگر اس قسم کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال ہم نہیں کرتے۔ یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اگر ہمیں تحقیقی غرض سے انڈیا جانے کی اجازت اور سہولت ملتی تو یقیناً اس سے ہمیں اپنے تحقیقی کام

ہیں مدد ملتی کہ انڈیا ہمارے موضوع سے متعلق مواد سے بھرا پڑا ہے۔

آخر میں کراچی کی چند ذاتی لائبریریز کا ذکر شاید غیر ضروری نہ ہو، جن کے بارے میں رضا علی عابدی کا کہنا ہے کہ 'کراچی میں قدیم اور نادر کتابوں کے ذاتی ذخیرے کتنے لوگوں کے پاس ہیں، انہیں شمار کرنا مشکل اور ان کی فہرست بنانا ناممکن ہے' (۴)۔ یہ لائبریریز میں نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں تو نہیں دیکھیں مگر کسی اور سلسلے میں وہاں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ کام علمی اور ادبی رسائل کی فہرست بنانے کے لئے کیا گیا تھا اور یہ بھی ابتدائی ۹۰ء کی دھائی میں کیا گیا، اس سلسلے میں رضا علی عابدی کی یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ 'ذاتی ذخیروں میں سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ لوگ کسی کو آنے نہیں دیتے' (۵)۔ بہر حال، کراچی کے ان ذاتی کتب خانوں میں مشفق خواجہ صاحب کا کتب خانہ، ناظم آباد میں تھا، جسے ہم نے دیکھا۔ اگر چہ وہ ہم جیسے چھوٹے طالبِ علموں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے تھے بلکہ ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر اپنے غیر خفیہ یا کم قیمتی رسائل کی کچھ فہرستیں انھوں نے ہمیں دیں اور شاید اگر ہم ان کے پاس ایک دو مرتبہ اور جاتے تو وہ ہم سے پہلے سے زیادہ شفقت سے ملتے مگر ہم نہیں جا سکے۔ اور پھر ہمیں یہ شفقت ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ہاں ملی۔ جب ہم کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس پہنچے اور ان کی ذاتی لائبریری میں آنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے کچھ سوال و جواب اور اس کام کا مقصد جاننے کے بعد اپنی لائبریری کے رسائل کی فہرستیں بنانے کی اجازت دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اور ان کی مسز نے ہماری میزبانی بھی خوب کی۔ ان دونوں ذاتی لائبریریز کے بعد تیسری بڑی لائبریری محمد ایوب قادری صاحب کی تھی جو ان کے بیٹے کی تحویل میں ہے ہم نے وہاں ہفتوں کام کیا۔ انھی لائبریریز میں ایک لائبریری بیرسٹر خالد اسحٰق صاحب کی بھی تھی جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ جب کوئی نئی کتاب کہیں نہ ملے تو وہ کتاب خالد اسحٰق کی لائبریری میں مل جائے گی، گویا یہ نئی کتابوں کے لئے بہترین لائبریری ہے۔ مگر ہم وھاں رسائل کی فہرست بنانے کے لئے گئے ان کے پاس کتابوں کے ساتھ رسائل بھی بڑی تعداد میں ہیں اور اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ کئی مکانات پر پھیلا ہوا ہے۔ جو ان کی لائبریری سے الگ ہیں۔ یہاں بھی رسائل کی فہرستیں ہم نے بنائی ہیں۔ اس لائبریری کے بارے میں رضا علی عابدی افتخار عارف کے حوالے سے کہتے ہیں کہ '۔۔۔کوئی اسلامی کتاب ایسی نہیں جو دنیا میں کہیں چھپی ہو

اور وہ ان کے پاس موجود نہ ہو، خاص طور پر حدیث، تاریخ، اور فقہ پر جتنا اچھا انتخاب خالد اسحٰق صاحب کے ہاں ملے گا وہ ذرا کم کم دیکھنے میں آئے گا' (۶)۔ یہ چاروں ہی لائبریریز اپنے ذخیرہ کتب و رسائل و مخطوطات کے لحاظ سے نادر و نایاب کہی جا سکتی ہیں۔

اس مضمون میں ان تمام لائبریریز کی نشاندہی سے مقصد ہمارا یہی ہے کہ شاید کسی طالبِ علم کو علم کی طلب ان تک لے جائے اسی لئے ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ذاتی لائبریریز کے دروازے طالبِ علموں کے لئے کھلے رکھے جانے کی کوئی شکل ضرور ہونی چاہیئے۔

خواہ ذاتی لائبریریز ہوں یا پبلک، ان میں جا کر، ان میں کام کر کے ہم نے محسوس کیا کہ ان میں دن رات کام کرنے والے، جو کسی نہ کسی طور پر ان سے وابستہ ہیں، ان کی کتاب سے دوستی انھیں انسان دوستی سے قریب تر کر دیتی ہے، پھر کتاب ملے یا نہ ملے، ان کی ملنساری، ان کا خلوص، ان کے خوبصورت رویے ہی یاد رہ جاتے ہیں۔ بہر حال واقعہ جو بھی ہو ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی ان چند لائبریریز کا حال اس بات کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہاں بھی علم کے خزانے موجود ہیں، ضرورت تلاش و جستجو، ان کی حفاظت، ان کی با قاعدہ فہرست سازی، اور ان تک رسائی کو ممکن بنانے کی ہے۔ اور رضا علی عابدی کے الفاظ میں '۔۔۔ دعویٰ تو ہمارا یہ ہے کہ ہمارا یہ دور شعور کا دور ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن قومی میراث کی کڑیاں اگر ایسے دور میں گم ہوئیں تو یقین ہے کہ آنے والے زمانے ہمارے شعور پر اور شعور کے دعوے پر ہنسیں گے یا شاید روئیں گے' (۷)۔ گویا کتابوں کی یہ میراث ہماری قومی میراث ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی ہمارا۔

## کتابیات


**۱۔ اشرف علی، تحفظِ دستاویزات و کتب خانہ، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء**

یہ کتاب ۲۱ ر ابواب پر مشتمل ہے، جس میں دستاویزات، مخطوطات اور محفوظات کی تعریف کے بعد برصغیر میں آرکائیو کی ابتداء اور مختلف دستاویزی ذخائر کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ دستاویزات اور ریکارڈ کی درجہ بندی و ترتیب کے علاوہ ان کی فہرست سازی، کتابیات اور اشاریہ کی تیاری و طباعت اور ان کے مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں دستاویزات اور کتب پر ماحولیاتی اثرات، ان کو دور کرنے کے طریقے، حشرات الارض اور قدرتی آفات سے بچاؤ،

دستاویزات کی مرمت اور بحالی کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ سمعی اور بصری مواد کے حصول، اس کی حفاظت اور ضرورت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی یہ خوبیاں اس کو صرف لائبریری سائنس کے طلباء و اساتذہ میں ہی مقبول نہیں بناتیں بلکہ عام دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بھی یہ مفید کتاب ہے۔ اور ان علمی سرمایہ رکھنے والے حضرات کو بھی وہ ضروری معلومات مہیا کرتی ہے جس سے وہ اپنے علمی خزانوں کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

### ۲۔ رانا سلطان محمود، ابتدائی لائبریری سائنس، لاہور، ب ت

یہ کتاب لائبریری سائنس کی تعلیم و تدریس کے جدید طریقوں اور تقاضوں کی کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں موجود معلومات لائبریری سائنس کے بہت سے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ لائبریری کے معنی و مفہوم سے لے کر، یہ علم ہے یا فن، دوسرے علوم سے اس کا کیا تعلق ہے۔ قدیم ادوار میں مختلف ممالک کی لائبریریز کی تاریخ، خاص طور سے برصغیر پاک و ہند کی لائبریریز اور پاکستان کی لائبریریز، میں موجود مواد کی مختلف اقسام، تحریر سے طباعت تک کے ارتقائی مراحل اور لائبریری مواد کی اقسام، جلد سازی اور حصولِ کتب کے طریقۂ کار کے بارے میں یہ کتاب معلومات دیتی ہے۔

### ۳۔ الطاف شوکت، نظامِ کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۸ء

یہ کتاب بقول مصنف اسکول و کالج میں قائم کتب خانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش میں لکھی گئی ہے، کیونکہ ان کتب خانوں میں زیادہ تر غیر تربیت یافتہ افراد کام کر رہے ہیں اور اگر چند فیصد تربیت یافتہ ہیں بھی تو ان کے لیے اپنی زبان میں ضروری فنی کتب موجود نہیں ہیں۔ اس لیے الطاف شوکت نے اپنی زبان میں اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور اسے عام فہم بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔

اس کی ضرورت انہیں اس لیے ہی محسوس ہوئی کہ اسکول اور کالج کی لائبریریز ناگفتہ بہ حالت میں ہیں اور اساتذہ ہی تدریسی فرائض کے ساتھ بطور ناظم کتب خانہ بھی کام کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لائبریری کو مناسب اور صحیح وقت دینا ناممکن ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ ناظمین کتب خانہ

طلباء کو کتاب جاری کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں اس لیے کہ کتاب گم ہونے کی صورت میں نقصان کا ذمہ دار انہیں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پاکستان کے ۹۸ فیصد کتب خانے بے کار ثابت ہو رہے ہیں اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ اپنے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچنے سے محروم ہو رہا ہے۔ لہٰذا الطاف صاحب نے اس کوشش کے ذریعے نہ صرف تربیت یافتہ افراد کی آسانی کی بلکہ غیر تربیت یافتہ افراد کے لیے بھی کتب خانوں کا نظام فنی اعتبار سے درست کر کے ان کی افادیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً یہ ایک بڑی خدمت ہے۔

کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اول میں نظریاتی یعنی کتب خانے، درجہ بندی، کیٹلاگ سازی، کتابیات، انتخابِ کتب حوالہ جوئی، تنظیم و انتظامِ کتب خانہ، تشریح اصطلاحات، تراجم اصطلاحات اور کتابیات شامل ہیں اور دوسرا حصّہ عملی ہے اس میں توضیحات یعنی عملی طور پر کتاب کا اندراج، درجہ بندی، اشاریہ، جدول مصنفین، کیٹلاگ سازی اور ڈیوی کے تازہ ایڈیشن شامل ہیں۔

4. Anis Khurshid, *The State of Library resources in Pakistan*, Lahore,1982

انیس خورشید کا یہ کام قارئین کو پاکستان کی لائبریریز کے ذرائع کا ایک broad overview دیتا ہے۔ ان کی یہ کتاب یقیناً ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ۹ ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ ان کے مطابق پاکستان کی لائبریریز کے ذرائع کے بارے میں یہ پہلا کام ہے جس میں ان کا سائز، مضمون، زبان اور شکل پر کام کیا گیا ہے۔ بڑے شہروں مثلاً لاہور، کراچی، راولپنڈی اسلام آباد، پشاور اور کوئٹہ کی لائبریریز میں موجود مواد کے بارے میں اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مجموعی طور پر کتنے فی صد کتابیں یونیورسٹی، کالج، پبلک اور اسپیشل لائبریریز میں ہیں، ان کا ڈیٹا شامل ہے۔

نیز یہ کہ یہ لائبریریز کون کون سی مختلف زبانوں میں کیا مواد رکھتی ہیں اور ان لائبریریز میں کتابوں کی شرح کتنے فیصد ہے۔ اس بارے میں یہ معلومات دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمینٹ اینڈ انٹرنیشنل ایجنسی ڈکومنٹ، مسودے، نایاب کتابیں، مائیکرو فارمز، رسائل، پیٹنٹ آفس اینڈ انسٹیٹیوٹ آف اسٹنڈرڈز شامل ہیں۔

۵۔ محمد یوسف نعیم، کراچی کے عوامی کتب خانے (ایک تعارف)، کراچی، ۲۰۰۷ء

سن ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والی کتاب کراچی کے عوامی کتب خانے اپنے نام ہی سے ایک منفرد کتاب معلوم ہوتی ہے۔ جس میں مصنف نے کراچی کی لائبریریز کا ایک تعارف پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں تقریباً ۶۰ چھوٹی بڑی لائبریریز کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔

۶۔ نسیم فاطمہ، علمِ کتب خانہ واطلاعات (مجموعہ مضامین)، کراچی، ۱۹۸۵

نسیم فاطمہ کی یہ کتاب مجموعہ کیٹلاگ سازی اور کتابیات کاری سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے دو حصّوں میں لکھا ہے۔ اس کی فہرست مضامین دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تفصیل کے ساتھ پاکستان میں ہونے والی کیٹلاگ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی کتاب ہے۔ مثلاً اس کی فہرستِ مضامین میں قومی تعمیر وترقی میں کتب خانے کا کردار اور منصوبہ بندی کی ضرورت، پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی: مسائل وتجاویز، پاکستان میں تجارتِ کتب: مسائل وتجاویز، کیٹلاگ سازی کے قوائد وضوابط کا تاریخی وتوضیحی اور تقابلی جائزہ، اینگلو امریکن کیٹلاگ کوڈ ۱۹۷۸ء کا ایک جائزہ، اشاریہ سازی اور اردو اشاریئے، کتب خانوں میں انتخابِ کتب وتدوین کتابیات کی ضرورت واہمیت، تبصرہ نگاری، تشخیص وشرحِ کتب، کتب خانے اور احتساب اور جامعاتی کتب خانہ اور حصولی پالیسی جیسے مضامین شامل ہیں۔

نسیم فاطمہ نے اپنی کتاب کے حصّہ دوم میں کراچی کے چند تعلیمی اور قانونی اداروں کے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں کراچی یونیورسٹی کا کتب خانہ، این ای ڈی یونیورسٹی کا کتب خانہ، کراچی کے اداروں کے کتب خانے وغیرہ پر مضامین لکھ کر کتب خانے کا کردار اور فرہنگ اصطلاحات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ یہ کتاب لگ بھگ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ اور طلباء کو کتب خانوں کی تیکنیکی معلومات کے ساتھ دیگر معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔

۷۔ صادق علی خان، اسکول اور کالج کے کتب خانوں کی تنظیم، کراچی، ۱۹۶۳ء

صادق علی سمجھتے ہیں کہ کالج اور اسکولوں میں کتب خانوں کا ہونا بچوں میں بہترین شہری بننے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اسکول اور کالج کے کتب خانوں میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسکول کا کتب خانہ بچوں کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت میں مددگار ہوتا ہے۔ اسکول میں کتب خانہ ہونے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے بچوں میں وسعتِ نظر اور تلاشِ جستجو کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ جو آگے چل کر ان میں سوچنے سمجھنے کی قوت کو بڑھاتا ہے بلکہ مسائل کو حل کرنے کے مؤثر طریقے بھی وہ اس سے سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید زمانے میں اسکولوں کے کتب خانوں کی طرف نام کے لیے نہیں بلکہ کام کے لیے بہت ضروری سمجھ کر توجہ دی جارہی ہے۔

صادق علی نے اس امر پر بھی بات کی ہے کہ پاکستان میں عام اسکولوں میں کتب خانوں کا رواج نہیں ہے بلکہ یہ کتب خانے صرف پبلک اسکولوں یا مشن اسکولوں میں بنائے گئے ہیں۔ جن کی تعلیم ایک خاص طبقے تک ہی محدود ہے۔

صادق علی کی کتاب جن مضامین پر مشتمل ہے، تمہید اور ماضی کے نقوش کے بعد جو ابواب ہیں وہ ان میں مدرسے اور کالج کے کتب خانے کا مقصد، مہتمم کتب خانہ اور اس کا دائرۂ عمل، مجلسِ کتب خانہ اور اس کا طریقۂ کار، کتب خانے کی عمارت اور ضروری سامان، حصولِ کتب اور عمل، کلاسیفیکیشن، کیٹلاگنگ، اجراء کتب، حفاظتِ کتب وغیرہ وغیرہ ہیں۔ یہ کتاب خاص طور سے اسکولوں کے لیے کتب خانے کو کیسے تشکیل دیا جائے، اس کی معلومات دیتی ہے۔ جو کسی بھی پروفیشنل کتب خانے کے لیے ضروری ہے۔ صادق علی کا کالج اور اسکول میں کتب خانوں کے قیام پر زور دینا اور ان کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ایک بہت اہم اور ضروری عمل کی نشاندہی کرتا ہے، وہ یہ کہ ایک اچھا کتب خانہ عام اسکولوں میں قائم کیا جائے تاکہ عام بچوں کی کتاب تک رسائی ممکن ہو سکے۔

۸۔ غنی الاکرم سبزواری، اسکول کے کتب خانے، کراچی، ب ت

کتب خانوں پر ایک کتاب غنی الاکرم سبزواری کی اسکول کے کتب خانے، نظم، ترتیب و خدمات

کے نام سے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں طلباء کا مطالعہ وسیع کرنے کے لیے مختلف حوالہ جاتی کتب سے واقفیت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ اسکولوں میں کتب خانے قائم کیے جائیں۔ تاکہ ان کتب خانوں میں رکھی بچوں کی دلچسپی کی غیر نصابی کتابوں کے ذریعے ان میں مطالعہ کی عادت اور ذوق پیدا کیا جاسکے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ صرف استاد اور نصابی کتابیں طلباء کو دینی و دینوی علوم سے روشناس کرانے کے لئے کافی نہیں۔ دراصل ۱۹۷۸ء میں جنرل ضیاء الحق نے تعلیمی کمیشن کو ہدایت دی تھی کہ ایسا نظامِ تعلیم مرتّب کیا جائے جو طلباء کے دل و دماغ میں اسلام پر راسخ العقیدہ ہونے کے ساتھ پاکستان سے محبت پیدا کرے اور تعلیمی نظام دینِ اسلام اور نظریۂ پاکستان سے مطابقت رکھتا ہو۔ لہٰذا اسکول کے بچوں کے لیے کتب خانوں کی تشکیل کا پروگرام اسی مقصد کی کڑی تھا۔ بہرحال مقصد جو بھی ہو کم از کم کتب خانے کے قیام سے بچوں میں کتب بینی کا رواج عام کیا جاسکتا ہے، اور انہیں ایک علمی فضا مہیا کی جاسکتی ہے جو شاید تعلیمی نظام میں کوئی فعال کردار ادا کرسکے۔

غنی الاکرم نے افتتاحیہ اور افتتاحی مضمون کے بعد اپنی کتاب میں ان ابواب کو شامل کیا ہے۔ تعارف، اسکول کے کتب خانے بحیثیت تعلیمی قوت، اسکول کے تعلیمی پروگرام میں کتب خانے کا حصّہ، کتب خانے اور ان کے قاری، نظامِ کتب خانہ، مالیات، عمارت کتب خانہ، فرنیچر وآلات، انتخاب وحصولِ مواد، مواد کتب خانہ، تنظیم مواد، مواد کتب خانے کا اجراء کتب خانے کے مواد کا تحفظ، اسکول کے کتب خانوں کا معیار، اور حوالہ جات۔

## ۹۔ حنا ناز، لائبریری پروموشن بیورو کا تحقیقی جائزہ، کراچی، ۲۰۰۲ء

کتب خانوں سے متعلق کتابوں کی تلاش میں ہمیں ایک ایم۔اے کا مقالہ حنا ناصر کا لائبریری پروموشن بیورو کا تحقیقی جائزہ کے عنوان سے ملا جو کراچی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس مقالہ کی رہنمائی ڈاکٹر نسیم فاطمہ نے کی تھی۔ لائبریری پروموشن کا ادارہ ۱۹۶۶ء میں قائم ہوا اور تب سے مسلسل لائبریری سائنس کی مطبوعات شائع کررہا ہے۔ ایک سہ ماہی مجلّہ "Pakistan Library Bulletin" ۱۹۶۸ء میں جاری کیا گیا جو پاکستانی اور بیرونی

اسکالرز کے لائبریری سائنس کے موضوعات پر مضامین وغیرہ شائع کرتا ہے۔اس مقالے کا مقصد لائبریری پروموشن بیورو کا پس منظر وپیش منظر بیان کرنا، اس کی مجلسِ منتظمہ، اغراض ومقاصد، شاخیں، کتابی مطبوعات، پاکستان لائبریری بلیٹن کے بارے میں رائے، پاکستان لائبریرین شپ میں بیورو کا کردار، اس کے فوائداور سفارشات مرتّب کرنے کے بعد نتائج بیان کرنا تھا۔

## حوالہ جات

*دراصل اس مضمون کی تحریر میں مجھے بنیادی تحریک دلانے والی نیون حیدر ہیں، جو وقتاً فوقتاً مضمون لکھنے میں میری ہمت بڑہاتی رہتی ہیں اور ان کی تحریک پر میں اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام کرلیتی ہوں۔نیون پاکستان اسٹڈی سنٹر یونیورسٹی آف کراچی میں اسٹنٹ پروفیسر ہیں۔


۱۔ رضاعلی عابدی، کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳، ص۵۵

۲۔ ایضاً، ص۵۲

۳۔ ایضاً، ص۱۲۸

۴۔ ایضاً، ص۱۰۶

۵۔ ایضاً، ص۸۱

۶۔ ایضاً، ص۱۰۸

۷۔ ایضاً، ص۱۶۷